

(۱۰۸)

مشاور
ترجمہ

فیوض الحکیمین

مصنف حضرت شاہ ولی اللہ
از

پروفیسر محمد سرور

سندھ ساکراکادمی، لاہور

۲۹۷۶۶۱

۲۸۶۹

۷۲۶۹

DATA ENTERED

چار روپے

فروری ۱۹۲۷ء

قیمت

مقبول عام پریس لاہور میں با اتمام محمد صدیق ریٹریڈیشن شریک
سندھ ساراگادی ۵۸ میل راولپنڈی شائع ہوئی

عرض مترجم

مولانا عبد اللہ سندھی مرحوم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے حالات کے ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "علم حدیث کی تحصیل و تکمیل کے لئے انہوں نے سفر حجاز اختیار کیا، کامل اساتذہ کی صحبت اور اعلیٰ اعلیٰ کتابوں کے مطالعہ سے دو سال میں انہوں نے حدیث و فقہ میں بہت کمال پیدا کر لیا، اس کے ساتھ ان کی قوت اشراق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے استفادہ کا موقع بہم پہنچایا۔ فیوض الحکیمین میں انہوں نے وہ فلسفی انیاسی اور اجتماعی فوائد جمع کر دیئے ہیں جو اس طرح حاصل کئے۔"

نور شاہ صاحب نے کتاب کے شروع میں اس کی شان نزول کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "سب سے بڑی نعمت جس سے کہ اس نے مجھے سرفراز فرمایا، یہ ہے کہ ۱۱۴۳ھ اور اس کے بعد کے سال میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے مقدس گھر کے حج کی اور بنی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی توفیق دی۔ لیکن اس سلسلے میں اس نعمت سے بھی کہیں زیادہ بڑی سعادت جو میری آئی، وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس حج کو میرے لئے مشاہدات باطن اور انکشاف حقائق کا ذریعہ بنایا۔۔۔۔۔ اس حج و زیارت کے ضمن میں مجھے جو نعمت عطا کی گئی وہ میرے نزدیک سب سے بہت بڑی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حج کے

ان مشاہدات باطن میں جو اسرار و رموز مجھے تلقین فرمائے ہیں، ان کو ضبط تحریر میں لے
آؤں، اور نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانیت سے زیارت مدینہ منورہ کے دوران
میں جو کچھ میں نے استفادہ کیا ہے، اس کو لکھ دوں۔۔۔۔۔ اس رسالے کا نام میں نے
”فیوض الحرمین“ رکھا ہے۔

اردو ترجمہ میں کتاب کا جو نسخہ خاکسار مترجم کے پیش نظر رہا، وہ ۱۳۰۸ھ کا چھپا ہوا ہے
اس کے شائع کرنے والے سید ظہیر الدین عرف سید احمد صاحب مولانا شاہ رفیع الدین
محدث دہلوی کے نواسے ہیں۔ اس عربی متن کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی ہے بد قسمتی سے
مجھے اردو ترجمے سے زیادہ مدد نہ مل سکی، کیونکہ اس کا سمجھنا میرے لئے عربی متن سے کم
مشکل نہ تھا، فیوض الحرمین کا عربی متن بہت صحیح چھپا ہوا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس
کی وجہ سے کتاب کے مطالب کو حل کرنے میں بڑی مدد ملی۔

یہ ترجمہ کیا ہے۔ اور فیوض الحرمین کے دقیق مباحث کو اردو میں پیش کرنے میں مترجم
کہاں تک عہدہ برآ ہو سکا، اس کا فیصلہ تو قارئین ہی فرما سکتے ہیں۔

محمد سرور
جامعہ نگر۔ دہلی

جنوری ۱۹۴۷ء

پیش لفظ

شاہ ولی اللہؒ میں پیدا ہونے سترہ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور ان کو باپ کی جگہ منہ تدیس سنبھالنی پڑی۔ بارہ سال تک درس دینے کے بعد ۱۱۴۳ھ میں شاہ صاحب نے حجاز کا قصد فرمایا۔ دو سال کے قریب آپ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں رہے۔ فیوض البحرین "شاہ صاحب کے اسی سفر حجاز کی یادگار ہے۔

اس میں شاہ صاحب کے روحانی مکاشفات ہیں۔ تصوف و سلوک کے اسرار ہیں، وحدت الوجود اور تخلیق کائنات کی بحثیں ہیں۔ حکمت و فلسفہ کے نکات ہیں۔ دین و ملت کے بعض اہم بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حنفی فقہ کی چند ناو خصوصیات کا ذکر ہے، علماء اور صوفیاء کے نزاع کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شیعہ و سنی میں تفصیل علیؑ اور تفصیل ابوبکر و عمرؓ کا جو جھگڑا ہے، اس کا حل پیش کیا ہے، ہندوستان میں کفار کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی طرف بھی ایک آدھ جگہ اجمالی اشارہ ہے اور سب سے زیادہ اس پر زور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مجددیت، وصایت اور قطبیت کے مقامات پر سرفراز فرمایا ہے، میں قائم الزمان ہوں کہ میرے تو سبط سے اہل اسلام کو کفار پر غلبہ نصیب ہوگا۔ مجھے رُک "اور نقاطِ علم کا آخری نقطہ سے ملقب فرمایا گیا ہو اللہ تعالیٰ

میرے ذریعہ سے امت مرحومہ کے منتشر اجزا کو جمع کرے گا۔ مجھے خلافت باطنی سپرد کی گئی اور یہ حکم ہوا کہ میں انبیاء کے طریقے کو اختیار کروں۔ اور ان کے بارہائے گراں کو اٹھاؤں میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ میں نے خود اپنا نور دیکھا، جو بڑا عظیم الشان تھا اور جس نے تمام اقلیموں کو ڈھانپ لیا، اور ان اقلیموں میں رہنے والوں پر اس کی روشنی غالب آگئی اور اس سے میں یہ سمجھا کہ قطبیت جو مجھے دی گئی ہے یہ اس کا نور ہے، یہ نور سب کو زیر کرتا ہے لیکن وہ خود کسی سے زیر نہیں ہوتا، وغیرہ وغیرہ

یہ سب امور جن کا کہ اوپر ذکر ہوا شاہ صاحب نے ان کو مشاہدات کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ ساری حقیقتیں ان کے دل پر گزری ہوئی اور ان کی آنکھوں کی دیکھی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے یہاں آنکھوں سے مراد جسمانی آنکھیں نہیں بلکہ قلب و روح کی آنکھیں ہیں۔ مثال کے طور پر اوہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں یہ یہ چیزیں یوں یوں دیکھیں یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک نے مجھ سے یہ یہ الفاظ فرمایا اور بسا اوقات ایسا ہوا کہ شاہ صاحب روضہ اطہر پر حاضر تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی طرف متوجہ کہ ان کے دل پر بعض حقائق نقش ہو گئے، ان مشاہدات میں کہیں یہ بھی ہے کہ میں نے روح کی آنکھ سے یہ یہ چیزیں دیکھیں خانہ کعبہ سے مجھے نور کی شعاعیں نکلتی نظر آئیں، میں غزوہ بدر کے شہداء کی قبروں سے نور پھوٹتا ہوا پایا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس کو ظاہر اور عیاں دیکھا، آپ حالت انبساط میں میری طرف اس طرح ملتفت ہوئے کہ میں یوں سمجھا کہ گویا آپ نے مجھے اپنی چادر میں لے لیا، اس کے بعد آپ نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر خوب بھینچا، آپ میرے سامنے رونا ہوئے، اور مجھے اسرار و رموز سے آگاہ فرمایا۔ اسی سلسلہ میں شاہ صاحب اپنے ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں جن میں آپ نے حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو دیکھا، اور آپ کو ان بزرگوں نے اپنے نانا رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلم ٹھیک کر کے

عطار فرمایا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک اڑھائی۔

مکن ہے اس طرح کی باتوں سے بعض قارئین کو کچھ توشش سا ہو اور وہ اس طرح کے ذریعہ علم کو ناقابل اعتبار جان کر زیر نظر کتاب میں جن مسائل کو بیان کیا گیا ہے، ان کو پڑھنے کے لئے تیار نہ ہوں، ان حضرات کی خدمت میں ہم عرض کریں گے کہ یہ کتاب جس زمانے میں لکھی گئی، وہ زمانہ اور تھا، اور آپ جانتے ہیں کہ ہر زمانے کا خاص ذہن اور اس کی اپنی خاص زبان ہوتی ہے۔ اور پھر عارفوں کا تو معاملہ ہی اور ہے، ان کے واردات قلبی اور مشاہدات باطنی کو عام عقلی معیاروں سے ناپنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، اپنی دیکھی ہوئی بات کہتے ہیں، اور جو کچھ ان کی زبان پر آتا ہے، وہ ان پر گزرا ہوا ہوتا ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ ان کے اس دیکھنے اور خارج سے اثر قبول کرنے میں ماحول کی روایات بھی بہت کچھ رنگ آمیزی کرتی ہیں، اور وہ اپنے زمانے کے رنگ ہی میں ان حقائق کو دیکھتے اور اسی پر ایہ بیان میں ان کو ادا کرتے ہیں جو ان کے ہاں مروج ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آدمی ظاہری شکلوں میں کچھ کر رہ جائے، او کہنے والے کے پیش نظر جس حقیقت کا اظہار تھا، اس تک نہ پہنچے۔ سچ تو یہ ہے کہ تصوف مذہب کے متعلق عام طور پر جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اور وہ اسی ظاہر یعنی اور سطح پر ہی کا نتیجہ ہیں۔

خود شاہ صاحب نے اپنی کتاب ہمعات میں اس غلط روی پر متنبہ فرمایا، چنانچہ لکھتے ہیں۔

”ارباب تصوف سے بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے اقوال اور احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جاننا جائے۔ اس سلسلے میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے ارباب تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔“

یہ علم جو عقل کی بجائے قلب کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اور عارف خود اپنے باطن میں اس کا مشاہدہ کرتا ہے، علامہ اقبال مرحوم نے اپنے لیکچروں میں اس وجدانی علم کی اصابت اور اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں، "قلب ایک طرح کا باطنی وجدان یا بصیرت ہے، جو مولانا رومی کی مشاعرہ زبان میں آفتاب کی شعاعوں سے زندگی حاصل کرتا ہے، اور ہمیں حقیقت کے ان پہلوؤں سے آشنا کرتا ہے جو ہمارے حواس سے پیچھے ہیں، قرآن کی رو سے یہ ایسی چیز ہے جو دیکھتی ہے اور اس کی اطلاعات کی صحیح تعبیر کی جائے تو اس میں غلطی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس کو باطنی پراسرار اور فوق الفطری کہتے ہیں اس کی قدر و قیمت بحیثیت ایک ذریعہ علم کے کم نہیں ہو جاتی، کچھ آگے اس قلبی واردات کے بارے میں مرقوم فرماتے ہیں "بنی نوع انسان کا یہ سارا الہامی اور صوفی ادب اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ مذہبی واردات کا سلسلہ تائخ انسانی میں نہ صرف شروع سے موجود رہا، بلکہ اس نے تاریخ پر کافی اثر بھی ڈالا ہے۔ اس لئے اسے محض فریب کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا، آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ عام سطح کے انسانی تجربات کو تو حقیقی مان لیا جائے، اور جن دوسرے ذرائع سے انسان کو علم حاصل ہوا نہیں باطنی اور جذباتی کا ناغم دے کر مسترد کر دیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک انسان کے تجربی علم کا سوال ہے، اس معاملے میں مذہبی واردات کی وہی حیثیت ہے جو دوسرے ذرائع علم کی ہے، جن سے انسان کو عام زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، نیز انسانی تجربات کی اس باطنی علم کو تنقیدی نظریہ دیکھنا کوئی بے ادبی نہیں۔" قلبی واردات کی علمی حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ علامہ مرحوم نے اسلامی تصوف کا اس وقت جو ادب موجود ہے، اس پر بھی کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ چنانچہ اپنے تیسرے لیکچر میں حرم کا عنوان "خدا کا تصور اور عبادت" ہے۔ فرماتے ہیں۔

"..... میں یہاں کسی ایسے ذریعہ علم کا ذکر نہیں کر رہا، جو کہ راز سر بستہ

ہو۔ اس تمام گفتگو سے میری غرض صرف اتنی ہے کہ آپ کو ایک حقیقی انسانی تجربی علم (وجدان) کی طرف متوجہ کروں جس کے پیچھے پوری تاریخ ہے اور سامنے شاندار مستقبل۔ تصوف نے اسی ذریعے علم کو خاص طور پر برتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ انسانی "انا" کی وسعتوں کو ہمارے سامنے بے نقاب کر سکا، ہمارا اصولی ادب کافی تاب ناک ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کی وہ بندھی ٹکی اصطلاحات جو کبھی فرسودہ قسم کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کے زیر اثر بنی تھیں۔ آج اس زمانے میں نئی نسلوں کے دماغوں پر ان کا اثر سخت روح فرسا اور مردنی خیز ہے۔

"فیوض الحرمین" میں شاہ ولی اللہ صاحب نے مذہب و تصوف کے حقائق کو جس زبان میں اور جن اصطلاحات میں بیان فرمایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کی اوپر کی تنقید ایک حد تک ان پر بھی پوری اترتی ہے۔ شاہ صاحب کے زمانے میں مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا مابعد الطبیعی فکر پایا جاتا تھا جس کا بیشتر حصہ تو یونانی اور اشرافی تھا۔ لیکن اس میں ہندو ایران کے اثرات کی بھی ملوثی تھی اور اس سارے مملو بنے پر اسلامی ٹپہ لگ چکا تھا، مابعد الطبیعیات کا یہ گورکھ دھند ایسا سچ در سچ ہے کہ اس میں انکا ہوا ذہن مشکل ہی سے نکل سکتا ہے، فیوض الحرمین میں کہیں کہیں اس طرح کی مابعد الطبیعی اصطلاحات کی الجھنیں بھی ہیں، لیکن تحقیق حق کی خاطر اس طرح کی مشکلات راہ کو چھیلنا ہی پڑتا ہے، خوشے سے اناج نکالنے کے لئے اوپر کی لہو سی کو مٹانا کبھی بھی تفسیح اوقات نہیں سمجھا جاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ان مشاہدات اور مکاشفات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کو اس عہد کے تاریخی آئینے میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ شاہ صاحب جب پیدا ہوئے تو اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت تھی، چار برس کے بچے

کہ عالمگیر کا انتقال ہو گیا، اور اس کے بعد گیارہ سال کے قلیل عرصے میں یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے، اور ۱۱۳۱ھ میں شاہ صاحب نے اپنے والد کے مدرسے میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو چھٹے بادشاہ محمد شاہ کے سر پر ہندوستان کا تاج شاہی رکھا گیا، اس کی حکومت کے بارہ سال دیکھ کر آپ حج کو گئے۔

دہلی کے یہ انتیس سال بڑے سخت سیاسی خلفشار میں گزرے، عالمگیر کے مرتے ہی اس کے تین بیٹوں میں لڑائی ہوئی، دو تو میدان جنگ میں کام آئے، اور بڑا بیٹا بادشاہ بنا۔ چار سال حکومت کرنے کے بعد وہ راہی عدم ہوا تو اس کا بیٹا جہاندار شاہ تخت پر بیٹھا اور ایک سال کے اندر اندر اپنے بھتیجے فرخ سیر کے ہاتھ سے مارا گیا، فرخ سیر کو سادات بارہ نے بادشاہ بنایا تھا۔ لیکن ان میں اور بادشاہ میں زیادہ دیر تک نہ رہ سکی۔ چنانچہ طرفین ایک دوسرے کو گرانے کی برابر کوشش کرتے رہے جس کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ فرخ سیر کو سادات بارہ نے سخت عقوبتوں کے بعد مار ڈالا۔ چند ماہ کے اندر دو اور بادشاہ تخت پر بیٹھے اور پھر محمد شاہ کو تخت پر بیٹھا یا گیا، اس پر دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ نظام الملک نے سادات بارہ کو شکست دے کر بادشاہ کو ان کے پنجے سے نجات دلائی، یہاں سے محمد شاہ کا دور حکومت جسے تاریخ میں ”زنگیلا“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے شروع ہوتا ہے۔

اس طرح اور اتنی جلد جلد بادشاہوں کے بدلنے سے ایک طرف مغل سلطنت کا وہ رعب و دبدبہ جو اکبر، جہاں گیر، شاہجہاں اور عالمگیر کی طویل اور مضبوط حکومتوں کی وجہ سے قائم ہو چکا تھا، کمزور پڑنے لگا۔ چنانچہ ملک میں ہر طرف شورشیں شروع ہو گئیں۔ دوسری طرف شاہی خاندان کی باہمی جنگوں نے امرائے سلطنت کو خود سر بنا دیا۔ اور وہ ایک دوسرے کے خلاف مرہٹوں، راجپوتوں اور جاٹوں سے مدد لینے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان قوموں کو یہ معلوم ہو گیا

کہ اکبر و عالم گیر کے جانشینوں کا بس نام ہی نام رہ گیا ہے، محمد شاہ اگر کسی قابل ہوتے تو شاید اس کے عہد حکومت میں جو خلاف توقع کافی ملتا تھا۔ مغل سلطنت کی کچھ حالت بدھ جاتی، لیکن وہ تو محض عیش و عشرت کا بندہ تھا، ہوا یہ کہ معاملات روز بروز زیادہ خراب ہوتے گئے، اور شاہ صاحب کی حج سے واپسی کے چند سال بعد تو نا در شاہ کے حملے سے سلطنت کا سارا بھرم ہی جاتا رہا۔

یہ بھی سلطنتِ دہلی کی حالت، جو شاہ صاحب اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے یہی وہ زمانہ ہے جس میں مرہٹوں کے ساتھ رعایتیں کی گئیں اور بادشاہ کی طرف سے انہیں دکن سے چوتھ وصول کرنے کا حق عطا ہوا، اس سے ان کے حوصلے اور بڑھ گئے اور وہ شمالی ہند پر قابض ہونے کی تدبیریں کرنے لگے، راجپوتوں کو مطیع کرنے کے لئے جزیہ کی منسوخی کا اعلان ہوا۔ اور دہلی کے قریب آگرے کے نواح میں جاٹوں نے سراٹھایا، اور پنجاب میں سکھوں نے شورشیں کرنی شروع کر دیں، گوان سب کو وقتی طور پر دبا دیا گیا لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ "کفار" کا سیلاب بڑھتا چلا جا رہا ہے، اور اس کا رد کناب روز بروز مشکل ہوتا جائے گا۔

شاہ صاحب کا سلطنت کے اس خارجی اور داخلی خطرے سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اسلامی سلطنت کو جن غیر مسلم طبقوں سے کوئی خطرہ ہو سکتا تھا، تو وہ یہی عرپٹے، راجپوت، سکھ اور جاٹ ہی تھے انگریز اور فرانسیسی اس زمانے تک دہلی سے بہت دور تھے، اور ان کا اثر مشکل ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے آگے بڑھنے پایا تھا، ہمارے خیال میں شاہ صاحب کو اس نئے خطرے کا جو حقیقت میں سب سے بڑا خطرہ تھا، زیادہ علم نہ تھا مسلمانوں کو اور اسلامی سلطنت کو ان خطرات میں گھرا ہوا یا کتنا قیناً شاہ صاحب کو رہ رہ کر خیال آتا ہو گا کہ کوئی ایسی تدبیر ہو جس سے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت

درست ہو جائے، ان کی جمعیت کا شیرازہ پھر سے بندھ جائے، مسلمان احرار
میں اتفاق و اتحاد ہو، ان کے اخلاق سدھر جائیں، اور اس طرح مسلمانوں کو
نئی زندگی ملے، اور اسلامی سلطنت تباہی کے اس ترغے سے نکل جائے۔ چنانچہ
اس کے لئے ضرورت تھی کہ شیعہ اور سنی کا نزاع ختم ہو، اہل تصوف اور ارباب
شرعیہ میں جو بعد پیدا ہو گیا تھا، وہ نہ رہے، علماء اپنا کام کریں اور صوفیہ اپنے
فرائض انجام دیں، اسلام کی صحیح تعلیمات لوگوں تک پہنچیں اور دین کی تجدید
کے ساتھ ساتھ ملت کی بھی نئی تشکیل ہو۔

شاہ صاحب کی طبیعت، ان کی عالی دماغی اور بلند حوصلگی، ان کے خاندانی
حالات، ان کے ماحول اور جس فشار میں کہ انہوں نے پرورش پائی تھی، ان سب
کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں کہ وہ اسلامی سلطنت کے زوال
سے کتنے متاثر ہوئے ہونگے، اور اصلاح حال کیلئے انہوں نے کیا کیا سوچا ہوگا، اور کیا وہ لوگ
اور کسی کسی انگلیں اس سلسلہ میں ان کے دل میں نہ اٹھی ہوں گی، اور یہ وہ زمانہ
تھا جس میں مسلمان صوفی اور عالم اسلامی جمعیت کے اہم رکن سمجھے جاتے تھے
اور ایک طرف عوام و خواص ان کے عقیدت مند ہوتے تھے، اور دوسری طرف
احرار اور بادشاہ ان کی نصیحت سنتے تھے۔ اور پھر یہ بھی بات تھی کہ اس
عہد میں بالعموم اور شاہ صاحب کے خاندان اور ان کے قریبی ماحول میں بالخصوص
حضرت مجدد الف ثانی کے تجدیدی کارناموں کا غلغلہ تھا۔ اور یہ ممکن نہیں کہ شاہ
صاحب کے کانوں میں بحین ہی سے مجدد صاحب کی باتیں نہ پڑتی رہی ہوں کہ
کس طرح انہوں نے جہانگیر کے عہد میں اکبر کے لگائے ہوئے اتحاد و زندہ کے
پودے کو جڑ سے اکھڑ پھینکا، اور مغلوں کی خلافت ظاہرہ کے بالمقابل اپنی
باطنی خلافت کی بنیاد رکھی، اور کس طرح ان کے خلفاء اور نائب ہندوستان کے

گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ چنانچہ عوام اُن سے متاثر ہوئے، اور اُس نے ان کی بات مانی۔ اور آگے چل کر ان کی یہی کوششیں عالمگیر کی حکومت کی صورت میں بار آور ہوئیں۔

یقیناً شاہ صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق یہ سب کچھ سنا ہوگا اور قدرتاً ان کے بلند حوصلوں کو حضرت مجدد کے اسوہ عمل سے، اور آپ کے بارے میں ان روایات و آثار سے جو شاہ صاحب کے ماحول میں پہنچ چکے تھے، بڑی تقویت ملی ہوگی اور ان کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہوگا کہ اگر حضرت مجدد اپنے تجدیدی مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں، تو اس وقت بھی ایک تجدیدی کوشش کر دیکھنی چاہیے۔ کیا بعید ہے کہ اس سے اسلامی جمعیت تباہی سے بچ جائے اور ہندوستان میں اسلام کو نئی زندگی نصیب ہو۔ یہ خیالات یہ دلوں اور یہ منگنیں تھیں جن کو دل میں لئے ہوئے ہمارے خیال میں حضرت شاہ صاحب خانہ کعبہ اور روضہ اطہر پر پہنچے۔ اس وقت آپ کی انتیس تیس کی عمر تھی، جوانی کا عالم تھا تصوف کے مراقبوں سے نفس کی باطنی قوتوں کو بڑی جلال چکی تھی۔ غیر معمولی ذہانت، اس پر وجدانی زندگی کا اتنا پختہ رنگ دل میں بڑھے ہوئے جو صلیے اور گرد و پیش کے خطرات کا اس قدر احساس اور خیال میں بڑے بڑے بزرگوں کی انقلاب آفریں شخصیتیں سمائی ہوئیں یہ ہیں وہ حالات جن کی صدائے بازگشت فیوضِ اکھر میں کے یہ مشاہدات اور مکاشفات ہیں اور انہی کی روشنی میں ہیں شاہ صاحب کی ان دعادی کو دیکھنا چاہیے کہ وہ قائم الزمان ہیں۔ ان کو دہلی، قطب اور امام کے مذاہب پر سرفراز کیا گیا وغیرہ

بے شک حضرت مجدد الف ثانی کی تجدید کارنگ اور تھا، اور شاہ ولی اللہ کی تجدید کارنگ اور کیا کہ حضرت مجدد کا زمانہ دوسرا تھا، اور شاہ صاحب دوسرے زمانے میں پیدا ہوئے۔ اکبر اور جہاں گیر کے عہدِ حکومت میں اسلامی سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی، اس میں جو بے عنوانیاں پیدا ہو چکی تھیں، وہ ایسی تھیں جیسے کہ کسی سے

بھریوز جوانی کی بدستی میں ہوں۔ چنانچہ مجدد صاحب کی تجدید میں تادیب کا رنگ غالب تھا اور وہ اسلامی جمعیت کو جو اس زمانے میں زیادہ تر اہل سنت و الجماعت ہی پر مشتمل تھی، غیروں کے تمدنی اثر سے آزاد اور دوسروں سے الگ اور ممتاز ہونے پر زور دیتے تھے۔ لیکن شاہ صاحب کے عہد میں اسلامی جمعیت کا خاکہ بہت کچھ بدل چکا تھا اب اس کے اندر مستقل کردہ بن چکے تھے، اور ہر گروہ اپنی انفرادیت پر مہر تھا، اور حالات ایسے تھے کہ ان کو اس طرح ایک کرنا کہ یہ سب کے سب اہل سنت و الجماعت کی بنیاد گولان لیں، ناممکن تھا۔ پہلے مرکزی حکومت میں طاقت تھی اور سنی امرا کا زور تھا، بیشک اس زمانے میں شیعہ عناصر بھی رہے، لیکن ان کا زیادہ اثر نہیں تھا، شاہ صاحب کے زمانے میں سنی امرا کے مقابلے میں ایرانی امرا کا فی زور بڑھ رہا تھا، اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں اس کے مواقع بھی حاصل تھے کہ وہ مرہٹوں، جاٹوں اور راجپوتوں کی مدد سے اپنے مخالفوں کے مقابل آئیں۔ شیعہ اور سنی کی اس لڑائی میں ظاہر ہے اسلامی جمعیت کو نقصان پہنچتا، اس لئے اب ضرورت اس کی نہ تھی کہ "رفض" کے خلاف حضرت مجدد کی طرح کھلم کھلا جہاد کا اعلان کیا جاتا، بلکہ مصلحت اور دانشمندی کا تقاضہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں میں جہاں تک اسلامی اصول اجازت دیتے، باہمی رواداری اور اتحاد پیدا کیا جاتا، تاکہ اسلامی جمعیت کے اس طرح کے داخلی اتحاد سے خارجی خطرات کا مقابلہ کرنا ممکن ہو سکتا، "فیوض احرار" میں شیعہ اور سنی کے اس نزاع کو ختم کرنے کے لئے بھی اشارے ہیں۔

یہ تو ہوا شیعہ اور سنی کا معاملہ، لیکن شاہ صاحب کے زمانے تک امر واقعہ یہ تھا کہ اسلامی جمعیت کی غالب اکثریت اہل سنت پر مشتمل تھی، چنانچہ ان ہی کی اصلاح اور تنظیم سے اسلامی جمعیت کی نئی تشکیل ہو سکتی تھی، اہل سنت کی علمی اور روحانی قیادت اس وقت علما و زعماء کے ہاتھ میں تھی، لیکن بدستی سے ان میں انکار و عقائد کی

وہ ایک جہتی نہ تھی جو وجودیت کے استحکام کے لئے ضروری ہوتی ہو۔ صدیقہ عقیدہ وحدت الوجود میں گم باطنی زندگی کو سب کچھ سمجھے ہوئے تھے اور علماء کو صوفیاء ہی بدگمانیاں تھیں، اور وہ انہیں شریعت کی سیدھی راہ سے ہٹا ہوا پاتے تھے، شریعت اور طریقت کے اس ذہنی اور علمی تضاد کو دور کرنے کا خیال بھی "فیوض الحرمین" کے مشاہدات میں منکسر نظر آتا ہے۔

خود علماء اہل سنت کا یہ حال تھا کہ وہ فقہی تعصب اور ذہنی جمود میں بری طرح مبتلا تھے، وہ فقہ حنفی ہی کو اسلام کا مرادف سمجھتے، اور اس میں اتنا تشدد برتتے کہ کسی کا حنفی نہ ہونا ان کے نزدیک اسلام سے خروج سمجھا جاتا۔ ظاہر ہے یہ صورت حال اسلامی ذہن کی موت تھی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جماعتی زندگی میں اسلام کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث سے استفادہ کرنے کا رجحان اور دنیا میں آگے بڑھنے اور نئے فکری حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ مفقود ہو گیا تھا۔ یہ سب صحیح، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی عام حالت یہ تھی کہ وہ فقہ حنفی کے سوا کسی اور فقہی مذہب کا نام تک سننے کو آمادہ نہ ہو سکتے تھے وہ صدیوں سے فقہ حنفی ہی کو اسلام کی واحد تعبیر جانتے اور جانتے چلے آئے تھے۔ اب اگر ان کی علمی اور مذہبی اصلاح کا کوئی امکان ہو سکتا تھا تو اس کی صرف یہی صورت تھی کہ فقہ حنفی کی ایسی تعبیر ہوتی جس سے فقہ حنفی سے ان کا تعلق بھی نہ ٹوٹتا، اور وہ فقہی جمود سے بھی نکل سکتے۔ چنانچہ زیر کتاب میں آپ کو فقہ حنفی کے متعلق اس طرح کے مکاشفات بھی ملیں گے۔

یہ کائنات کس طرح ظہور پذیر ہوئی، ایک وجود سے یہ کثرت کیسے نکلی، انسان کا اس کائنات میں کیا مقام ہے، وہ اصل میں کیا ہے، اس میں کیا کیا بننے کی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں، خدا تک وہ کس طرح پہنچ سکتا ہے، تقرب الی اللہ کے یہ مسائل جنہیں مذہب کا نام دیا گیا ہے، ان کی حیثیت کیا ہے، ان میں بظاہر کمزور اختلافات ہیں اور حقیقت

زمانوں میں انبیاء کو الگ الگ جو شرعیات دی گئیں، انکی کیا حیثیت؟ مظاہر حیات کی تعلیمی میں
 بنیادی وحدت کیا ہے؟ الغرض فرینش کائنات کے متعلق یہ اور اس طرح کے اور ما بعد الطبعی مسائل و نیز
 مذہب و تصوف کے بنیادی حقائق جو زندگی کے مجموعی تصور اور اس کے نظام صالح کے لئے ہر تہذیب میں
 انسانی مشاہدہ کا حکم رکھتے ہیں، شاہ صفائے اس کتاب میں کہیں مجملہ اور کہیں تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔
 مختصراً یہ بھی فیوض الحرمین کا شان نزول اور یہ ہے اس کا موضوع ہمارے ہاں پڑھے لکھے طبقوں کو
 ان نون جو اسلامیات کے دیکھی پیدا ہو رہی ہے اور ان میں اسلامیات کی پرانی انفرادی اور قومی زندگی
 کو دھانسنے کا جو ایک جذباتی رجحان پایا جاتا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے مترجم کے خیال میں شاہ
 ولی اللہ صاحب کی اس کتاب کا دور میں آجانا فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ زیر نظر کتاب میں
 شاہ صاحب نے دین اسلام کے ارکان اور اس کے شرعی قواعد و احکام زندگی کی جن بنیادی
 اور دائمی حقیقتوں کے ترجمان ہیں، ان سے پردہ اٹھانے کی کوشش فرمائی ہے، ان حقیقتوں کی
 جاننے کی آج شاہ صاحب کے زمانے سے بھی کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ ان دنوں کثر مسلمان
 محض اپنا نام کا مسلمان ہونا ہی نجات اخروی کے لئے کافی سمجھتے ہیں، اور اسی بنا پر وہ دوسروں
 سے فوقیت چاہتے اور ان کے مقابلے میں امتیازی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں، نیز ان میں بعض
 ایسے غلط گروہ بھی پیدا ہو گئے ہیں، جن کو واقعی اسلام سے دلی محبت ہے، اور وہ پورے غلو سے
 اسلامی زندگی کو اڑنا چاہتے ہیں، لیکن انکی نظر مظاہر اسلام سے اور شعائر اسلام سے حقیقی
 مقصود تک نہیں جاتی۔ اور وہ ظاہری زندگی ہی کو اسلامی رنگ دے دینا کافی سمجھ رہے
 ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ اس طرح اسلام دنیا میں پھروسی انقلاب آکر سکے گا جو تیرہ سو سال پہلے
 اس نے کیا تھا۔۔۔۔۔ خدا کو یہ شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ افادات ان نوجوانوں میں جن کو اسلام
 سے حقیقی لگاؤ ہے، اور حتمی زندگی کی تعمیر میں اسلامی فکر کی اہمیت کو بھی مانتے ہیں، اسلام کی اصل حقیقت
 اور اس کے بنیادی حقائق کو سمجھنے کا صحیح جذبہ پیدا کر سکیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی نئی زندگی جس کا آج
 ہر مسلمان متمنی ہے، صرف اسی طرح ہی وجود میں آسکے گی۔۔۔۔۔

فہرست مضامین

پیش لفظ
مقدمہ
تہیہ

۴۹

پہلا مشاہدہ

۵۳

عقیدہ وحدت الوجود کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں مباحثہ

دوسرا مشاہدہ

۵۹

(۱) اللہ تعالیٰ کی تدلی کی حقیقت

(۲) انسان کی باطنی استعدادیں (لطائف)

(۳) بندے کا اپنے رب کو دیکھنا اور اس سے کلام کرنا۔

(۴) شاہ صاحب کی روح آفتاب سے ملاقات

(۵) نفوس میں باہمی تاثیر و تاثر کے طریقے

(۶) انسان کی حس مشترک کا بیان

۴۳

تفسیر مشاہدہ

شمارہ اشداوران پر عمل کرنے والوں کی قسمیں

۴۵

چوتھا مشاہدہ

(۱) تدلی الہی کا واسطہ ہونا اہل اور بندوں کے درمیان ملاپ کا

(۲) تدلی الہی مختلف حالتوں میں مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس کی حکمت

اور اس کے اسباب۔

(۳) وجہ مطلق سے شخص اکبر کا ظہور، اس کے ادراک میں تدلی الہی کا قرار پذیر

ہونا اور اس ایک تدلی سے حالات و مقتضیات کے مطابق فرداً فرداً تدلیات

کا نزول۔

(۴) شخص اکبر سے افلاک و عناصر و اعیان و انواع کا ظہور۔

(۵) بنی نوع انسان کے مثالی پیکر سے افراد انسانی کا نکلنا، ان افراد کی ممتوں،

ان کے نفوس اور ان کی انسانیت کے جوہر کا خطیرۃ القدس میں مشکل ہونا، اور

اس مقام پر تدلی الہی کا نزول۔

(۶) بندوں کو قدر تک پہنچانے کے لئے خطیرۃ القدس سے اس تدلی کا اترنا اور

خارجی حالات و اسباب کی مناسبت سے اس کا مختلف صورتوں میں شخص اور

معین ہونا۔

(۷) تدلی الہی کی شخص اور مجسم صورتیں۔

(ا) بقوت

(ب) نماز

(ج) الہامی کتابیں

(د) مدت یعنی شریعت

(ر) خانہ کعبہ

(۸) شریعت کے احکام کا لوگوں کی عادات کے مطابق ہونا

(۹) تدلی سے مقصود چیز کہ بندوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرانا اور ان کے اعضا

و جوارح کو اعمال اطاعت کا عادی بنانا ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ تدلیات اور

شریعتیں ہمیشہ لوگوں کے مسلمات اور جو چیزیں کہ ان کے ہاں مشہور ہوں، ان کے مطابق

ہی صورت پذیر ہوں۔

(۱۰) اعمباز اور خرق عادت کے معنی

۹۵

پانچواں مشاہدہ

ملاء علیہ اور ملا سافل کے فرشتوں کا روحانی کمال حاصل کرنے کے ذرائع

۹۹

چھٹا مشاہدہ

حضرت شمسؒ اور حضرت حسینؒ کا خواب میں آنا، شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم عطا کرنا اور آپ کی چادر مبارک اڑھانا۔

۱۰۱

ساتواں مشاہدہ

(۱۱) ایمان کی قسمیں۔ ایمان بالعیان یعنی واضح اور روشن دلیل دیکھ کر ایمان لانا

اور ایمان بالغیب

(۲) فرد کمال وہ ہے جو ایمان کی دونوں قسموں کو اپنے اندر جمع کرے۔

(۳) خانہ کعبہ میں نماز تہجد کا ایک واقعہ

(۴) شاہ صاحب کے والد اور چچا کا یہ ارشاد "اللہ کی مخلوق میں سے کسی شخص سے

بھی اگر وہ عاقل و بالغ ہے، شرع کی قیود نہیں اٹھ سکتیں، اور اس کے ساتھ،

دونوں بزرگوں کا اللہ تعالیٰ کے اس الہام کو برحق جاننا کہ تمہیں اختیار ہے کہ چاہو

تو عبادت کرو اور چاہو تو نہ کرو۔" ان دو متضاد اقوال میں تطبیق۔

آٹھواں شاہ

۱۱۱

(۱) انسانی زندگی کے روحانی کمالات

(۱) نورِ اعمال

(ب) نورِ رحمت یا نورِ یادداشت

(ج) نورِ احوال

(۲) شہدائے بدر حضرت ابوذر غفاری کے مزارات اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے مولد مبارک پر حاضری اور وہاں انوارِ رحمت اور انوارِ اعمال کو

روشن دیکھنا۔

نواں شاہ

۱۱۶

(۱) روضہ اطہر کی زیارت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک کو ظاہر

اور عیاں دیکھنا

(۲) بے شک انبیاء کو اوروں کی طرح موت نہیں آتی، وہ اپنی قبروں میں نازی

پڑھتے اور حج کرتے ہیں۔۔۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی حقیقت۔

۱۱۹

سوال شاہد

- (۱) روضہ اطہر پر حاضری اور شاہ صاحب پر آپ کے فیضانات
- (۲) شاہ صاحب کا دیکھنا کہ آپ اپنے جوہر روح، اپنی طبیعت، اپنی فطرت اور جبلت میں سترتا سر منظر ہیں، اللہ تعالیٰ کی اس عظیم الشان تدلی کے جو تمام بنی نوع بشر پر حاوی ہے
- (۳) شاہ صاحب کا آپ سے سوال کرنا کہ مذاہب فقہ میں سے کونسا مذہب ان کے نزدیک ارجح ہے۔
- (۴) طرق تصوف کے متعلق شاہ صاحب کا آپ سے استفسار
- (۵) شاہ صاحب کا مجددیت، وصایت، قطبیت اور امامت کے مقامات پر سر فراز کیا جانا۔
- (۶) ذات حق کو دنیا والوں سے اور خاص طور پر ان لوگوں سے جوستی میں ہیں، قریب ہونے کے لئے ضروری تھا کہ اس کی عنایت اس غرض کے لئے کسی انسانی شمع کو اپنا واسطہ بناتی۔ یہ انسانی شمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی۔

۱۳۳

گیارہواں شاہد

- (۱) ابھی آدم کا خمیر پانی اور مٹی میں تیار ہو رہا تھا کہ میں بنی تھا۔ شاہ صاحب کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے اس ارشاد کی وضاحت چاہنا۔

(۲) آدم کی تخلیق اور ارواح بنی آدم کا عالم مثال میں ظاہر ہونا۔ بنی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مثالی سیکر اور اللہ تعالیٰ کی اس تبدیلی کا جو تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے تھی، آپ کے اس مثالی سیکر پر منطبق ہونا۔

(۳) عالم مادی میں افراد انسانی کا وجود میں آنا، انبیاء کی بعثت کا سلسلہ، آخر میں آپ کا مبعوث ہونا۔ آپ کی بعثت کی عمومی اور دوامی حیثیت (۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علوم حکمت، فنون اور طب و طبابت اور علوم شرعیہ کو کیوں اتنا فروغ ہوا؟

(۵) ذات مطلق سے شخص اکبر کا ظہور، شخص اکبر کا اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا۔ شخص اکبر کی یہی معرفت قائم مقام بن گئی ذات حق کی شخص اکبر سے عناصر و افلاک کا ظہور۔ عناصر و افلاک کے بعد معدنیات، نباتات، حیوانات اور بنی نوع انسان کا ظاہر ہونا۔ ان میں سے ہر فرد میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق اللہ تعالیٰ کی معرفت کا جو اسے شخص اکبر سے حصے میں ملی ہو موجود ہوتا۔ نفس انسانی کی اس معرفت یا اس کے اس نقطہ تبدیلی کو بیدار کرنے میں ملا اعلیٰ کا ہاتھ۔ ملا اعلیٰ کی نوعیت، جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے، ملا اعلیٰ کی تعداد اور لازماً ان کی تاثیر بڑھتی جاتی ہے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علوم و فنون کو پہلے سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

بارہواں مشاہدہ

۱۲۹

(۱) شاہ صاحب کے نفس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے ملحق ہونا۔ اور اس سے انسانی نفوس کے حالات و کوائف کے مطابق شرعی احکام و قواعد کے معارف کو استنباط کرنے کا جو علم انھیں عطا کیا گیا تھا۔

۷۲۶۹

اس کے بارے میں ان کے دل میں اطمینان پیدا ہونا۔
(۲) شاہ صاحب پر ذاتِ حق کی نظر عنایت کا فیضان اور اس کے اثرات

۱۵۸

تیرھواں مشاہدہ

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کہ "سجدوں میں خوب دعا کرو"
اور نیز آپ کے اس حکم کا کہ "کثرتِ سجود سے اپنے نفس کی مدد کرو" مطلب
(۲) شاہ صاحب کا اپنے آپ کو غیر متناہی دیکھنا۔

۱۵۷

چودھواں مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کی حقیقت کا تمام لباسوں سے مشرہ اور
مجرد ہو کر شاہ صاحب کے سامنے تجلی فرمانا

۱۵۶

پندرھواں مشاہدہ

(۱) اللہ تعالیٰ کی وہ تدلی جس سے کہ مقصود کل بنی نوع انسان کو ہدایت دینا تھا اور
وہ عالم مادی کی تخلیق سے پہلے عالم مثال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
مثالی پیکر پر منطبق ہوئی۔ اور آپ کے ساتھ عالم مثال سے وہ عالم مادی میں بھی
منتقل ہو گئی، شاہ صاحب کا اس تدلی کے مثالی منظر سے متوصل ہونا اور اس
سے کھل ل جانا۔

(۲) اس تدلی کے مثالی منظر کے دو قالب ہیں۔ ایک زیادہ کمال اور زیادہ عام
اور دوسرا اس کا تابع، لیکن اپنی جگہ مستقل، شاہ صاحب کا اس مثالی منظر کا
دوسرا قالب ہونا، یہ قالب وجودِ علمی کے قریب ہوتا ہے یعنی انسانوں

کی ہدایت کے لئے جو عمومی اور ابدی اصول دین ہیں، اور جن کا منظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہے، شاہ صاحب کا ان اصولوں کا علم احاطہ کرنا (۳) تدلی اعظم کے اس مثالی منظر سے متصل ہونے کے نتائج یہ شاہ صاحب کا مجددیت، وصایت، قطبیت و طریقت کی امامت کے مقامات پر سرفراز ہونا، اور آپ کو ”رُکّی“ اور ”نقاط علم کا آخری نقطہ“ کے القاب سے یاد کیا جانا۔

سوٹھواں مشاہدہ

۱۶۱

وہ تدبیر واحد جس کا کہمیدائے اول سے فیضان ہوا، اور یہ ساری کا ساری عالم میں اسی کی تفصیل ہے، اس تدبیر واحد کی اصل حقیقت ہی کا نام ”حقیقت محمدیہ“ ہے، اس حقیقت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس سے بجلی کی طرح روشن ہونا، اور شاہ صاحب کا اس کو اپنے اندر جذب کرنا۔

سترھواں مشاہدہ

۱۶۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاہ صاحب کو سلوک کے راستے پر چلانا۔ اور خود ان کی تربیت فرمانا۔

اٹھارہواں مشاہدہ

۱۶۴

(۱) طریقہ سلوک کی اصل حقیقت یہ طریقہ سلوک وہ اذکار و افکار نہیں جو دنیا میں رائج ہوتے ہیں، بلکہ طریقہ سلوک کی اصل وہ ارادہ الہی ہوتا ہے، جو ملائکہ اعلیٰ میں قائم ہے۔

(۲) ملائکہ اعلیٰ کے اس ارادہ الہی کا دنیا میں کس شکل میں نزول ہوتا ہے۔

(۳) طریقہ سلوک کا حامل صرف وہ شخص بتا ہے جو اپنی جبلت سے مبارک اور پاک ہو، اور اسے غیب سے مدد ملے۔

۱۴۵ انیسواں مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاہ صاحب کو حقیقی مذہب کے ایک بڑے اچھے طریقے سے آگاہ فرماتا جو مشہور احادیث سے موافق ترین ہے۔

۱۴۶ بیسواں مشاہدہ

”میری قبر اور منبر کے درمیان کا قطعہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے“
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تشریح۔

۱۴۹ اکیسواں مشاہدہ

(۱) علماء اور صوفیاء کے طریق کار کا بیان

(۲) تقرب الی اللہ کے دو طریقے

(۱) ایک بالواسطہ یعنی طاعات و عبادات کے ذریعہ اعضا و جوارح کی اور ذکر و تزکیہ اور اللہ اور اس کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کے ذریعہ قوائے نفس کی تہذیب و اصلاح

(ب) دوسرا بلا واسطہ یعنی اللہ اور بندے کا براہ راست اتصال، اپنے ”انا“ کی حقیقت کو بیدار کر کے اس کے ضمن میں ذات حق کا شعور حاصل کرنا، اسی سلسلہ کے یہ ”فنا و بقا“ اور ”جذب“ اور ”توحید“ وغیرہ مقامات ہیں۔

(۳) دونو طریقوں میں کس کو تفوق ہے۔

بانیسواں مشاہدہ

۱۸۳

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ حضرت علیؓ سے کس جہت سے افضل ہیں۔ اور حضرت علیؓ ان دونوں سے کس لحاظ سے افضل ہیں۔

تیسواں مشاہدہ

۱۸۴

”اگر تونہ موتا تو میں افلاک کو پیدا ہی نہ کرتا“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تشریح۔

چوبیسواں مشاہدہ

۱۸۹

علم حدیث کی فضیلت کا بیان

پچیسواں مشاہدہ

۱۹۱

عارفِ کامل کی روح کا مقام عروج
(ا) ملا اعلیٰ کی ایک بلند اور عالی مرتبہ بارگاہِ مقدس۔
(ب) ملا رساق کی ترقی کا شہا

چھبیسواں مشاہدہ

۱۹۴

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے معرفتِ الہی کے سلسلہ میں شاہِ صاحب پر علوم کا منکشف ہونا۔

(۱) عارف میں اجزائے فلکی کا ظہور بڑا قوی، اور ان کا حکم بڑا موثر ہوتا ہے، اور یہی فلکی اجزا ذریعہ بنتے ہیں، اس عالم میں الہی تقاضوں کے قیام کا۔
 (ب) عارف کامل کے لئے ضروری ہے کہ دنیاوی، جسمانی اور روحانی عالمات اُس سے پوری طرح دور ہوں، اُس کی کیفیات اور جذبات میں تردد، تاثر کی ہو اور اس غور و فکر نے کہ وجود حق موجودات میں کس طرح جاری ہو رہی ہے، اور مبدائے اول اپنے ارادہ حیات میں، عالم کے مظاہر حیات میں کیسے متوجہ ہوتا ہے، اس شخص میں فرسودگی نہ پیدا کر دی ہو۔

(ج) ہر وہ عارف جو معرفت حق میں کامل ہوتا ہے، وہ جو کچھ بھی اخذ کرتا ہے۔ صرف اپنے ہی نفس سے کرتا ہے۔

(د) عارف کامل اللہ تبارک و تعالیٰ، اس کے اسماء اور اس کی تدلیات کے ماسوا جو کچھ بھی ہے، ان سب کو مسخر کر لیتا ہے۔

(س) عارف کامل کی روح اس کے طریقہ تصوف، اس کے مذہب، اس کے سلسلہ طریقت، اس کی نسبت، اس کی قرابت، اور پھر ہر وہ چیز جو اس کے قریب ہے، یا اس کی طرف منسوب ہے، ان میں سے ہر ایک کے ہر ہر پہلو پر نظر رکھتی ہے۔ اور اس پر برابر متوجہ رہتی ہے، اور عارف کامل کی روح کی اس توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی ملی ہوئی ہوتی ہے۔

(س) عارف کامل کو ان تمام نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے جو نعمتیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو، زمینوں کو، جمادات، نباتات، حیوانات، انسانوں اور فرشتوں کو اور انسانوں میں سے جو انبیاء، اولیاء اور بادشاہ ہیں، ان سب کو عطا فرمائیں۔

ستائیسواں مشاہدہ

۲۰۵

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ہمارا رب مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا۔ آپ نے فرمایا اعمام میں“ اس حدیث کی تشریح۔

اٹھائیسواں مشاہدہ

۲۰۶

(۱) عارف کا اپنے مقام سے ترقی کر کے ”مقام قدس“ میں پہنچنا۔
(۲) ”مقام قدس“ کے مشاہدات

انیسواں مشاہدہ

۲۱۳

(۱) عارف کا ”مقام حق“ کی طرف کھنچ جانا۔
(۲) سورہ انفال کے اترنے کا واقعہ بطور ایک مثال کے

تیسواں مشاہدہ

۲۱۴

نورِ عرش کی حقیقت

اکتیسواں مشاہدہ

۲۱۹

(۱) شاہ صاحب کی طبیعت کے رجحان کا اسباب کی طرف اور روح کے رجحان کا توکل کی طرف ہونا۔ اور آپ کا روح کے کہنے پر چلنا۔
(۲) شاہ صاحب کو بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ آپ کے ذریعہ امت مرحومہ کے منتشر اجزاء کو جمع کرے۔ اس لئے ایک توان کو ذروعات

میں اپنی قوم کی مخالفت نہیں کرنا چاہیے۔ اور دوسرے فقہ میں ان کو ایسا مثالی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو فقہ حنفی اور سنت دونوں کے مطابق ہو۔
(۳) آپ کو وصیت کی گئی کہ انبیاء کے طریقے کو اختیار کریں اور ان کے بارگاہ گراں کو اٹھائیں۔

بیسواں مشاہدہ

۲۲۳

ائمہ اہل بیت کی قبور کی طرف توجہ کرنے سے شاہ صاحب پران کے خاص طریقہ معرفت کا انکشاف۔

تینیسواں مشاہدہ

۲۲۵

(۱) غیر ائمہ سے تعلقات محبت کو بالکل منقطع کرنے، صرف ائمہ سے محبت رکھنے غیر ائمہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح عداوت کرنے اور ائمہ کے ساتھ محض علم و معرفت کے اعتبار سے نہیں بلکہ عملاً اور واقعہ عشق و محبت رکھنے میں جس عارف سے کوتاہی ہو، وہ فریب زدہ ہے،

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے بعض ایسے امور کا استفادہ جو کہ شاہ صاحب کی طبیعت کے بالکل برخلاف تھے۔

(۳) آپ کو اسباب کی طرف التفات ترک کرنے کو کہا گیا۔ گو آپ کی طبیعت کا رجحان اسباب کی طرف تھا۔

(ب) آپ کو کہا گیا کہ فقہ کے یہ جو چار مذاہب ہیں، ان کے پابند رہیں اور ان کے دائرے سے باہر نہ نکلیں، اگرچہ شاہ صاحب کو تقلید مذاہب سے طبعاً انکار تھا۔

رج (آپ کو حضرت علیؓ پر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو افضل ماننے کا حکم دیا گیا۔ گو اس معاملے میں شاہ صاحب کی طبیعت کا رجحان حضرت علیؓ کی تفضیل کی طرف تھا۔

۲۲۹

چوتیسواں مشاہدہ

خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے شاہ صاحب کا اپنے نور کو دیکھنا جس نے کہ تمام اقلیموں کو ڈھانپ لیا۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ قطبیت کا نور ہے، جو اٹھیں دی گئی ہے۔

۲۳۱

چھتیسواں مشاہدہ

خانہ کعبہ کو دیکھنا کہ ملا، اسے اور ملا، اسفل کی ہمتیں اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔

۲۳۳

چھتیسواں مشاہدہ

- (۱) شاہ صاحب پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں
- (۲) دنیا اور آخرت دونوں کے مواخذے سے آپ کو مامون کر دیا گیا۔
- (ب) اطمینان بخش زندگی دی گئی۔
- (ج) خلافت باطنی کی خلعت عطا ہوئی
- (۲) آئندہ عطا کی جانے والی نعمتوں کا عارف پر انکشاف
- (۱) کشف الہی کے ذریعہ
- (ب) کشف کوئی کے ذریعہ
- (۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر خلافتیں

(ا) خلافت ظاہرہ
(ب) خلافت باطنہ

۲۲۱

سینیسواں مشاہدہ

شاہ صاحب کا دیکھنا کہ ان کی روح میں بڑی وسعت اور فراخی پیدا ہو گئی ہو
اسکا راز۔

۲۲۱

ارتالیسواں مشاہدہ

(۱) قضا کا رویہ حرکت ہونا۔

(۲) عارفوں پر قضا کا منکشف ہونا، اور ان کی دعا سے اس کا عمل جانا۔
(۳) اللہ تعالیٰ کسی عارف سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے۔ اور وہ بات وعدہ
کے مطابق نہیں ہوتی، باوجود اس کے کہ یہ وعدہ پچھے الہام کا نتیجہ ہوتا ہو۔ اس
اشکال کی تشریح۔

(۴) مخلوقات کے ظہور کا سلسلہ ارتقاء۔

(۱) اس ظہور کی علت اعلیٰ ارادہ الہی ہے۔

(ب) اسماء، اعیان، طبیعت کلیہ کا ظہور

(ج) طبیعت کلیہ سے انواع کا ظہور، انواع سے افراد کا ظاہر ہونا۔

۲۲۲

ارتالیسواں مشاہدہ

(۱) "خلق سمیت صالح"۔ اور یہ عبارت ہے عارف کے نفس ناطقہ میں

ان ایمان اور اخلاق کے متعلق بیداری سے، جو نفس ناطقہ اور

اشتر کے یا عارف کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہیں۔ اور نیز یہ خلق عبارت ہے نفس ناطقہ کے نظام صانع کی طرف ہدایت پانے سے، ایسا نظام صانع جو اشتر کے نزدیک پسندیدہ ہو۔

(۲) جو شخص "خلق سمت صانع" کا حامل ہوتا ہے، اس کمال کے اندر ستر الہی نقش ہو جاتا ہے، اور اسکی زبان ترجمان بنتی ہے شرایع الہی کی۔

(۳) حضرت عمرؓ اس طرح کے ایک کمال تھے۔

(۴) شاہ صاحب کو "خلق سمت صانع" کے علم کا ایک حصہ عطا کیا گیا، اور لوگوں کے لئے قرب الہی کے جو طریقے ہیں، ان کی حقیقت سے آپ کو آگاہ کیا گیا

چالیسواں مشاہدہ

۲۴۱

(۱) شاہ صاحب کو روح کی حقیقت سے مطلع کیا گیا

(۲) روح کے مدارج - جسم ہوائی، حقیقت مثالی، حقیقت روحیہ صورت انسانیہ، صورت حیوانیہ، صورت نامویہ، صورت جسمیہ، طبیعت کلیہ اور باطن الوجود کا خارج میں بسط ہونا۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ہر نبی کو ایک دعا ایسی مرحمت ہوئی، جو ضرور مقبول ہوتی ہے، ہر نبی نے اپنی اپنی دعا مانگ لی۔ لیکن میں نے اپنی دعا محفوظ رکھی، اور وہ میں قیامت کے دن اپنی اُمت کی شفاعت کے لئے مانگوں گا۔ آپ کے اس ارشاد کی وضاحت

اکیسواں مشاہدہ

۲۴۲

(۱) شاہ صاحب پر تحقیق واجب اور کئے علوم کا بالعموم اور عالم خیال میں جو

تخلیق ہوتی ہے، اُس کے علوم کا بالخصوص فیضان ہوتا، اور نیر و متضاد چیزوں
اور روضوں میں تطبیق دینے کا علم عطا کیا جانا۔

(۲) تخلیق و ایجاد کی کیا نوعیت ہے۔
(۳) متناقض اور متضاد چیزوں میں تطبیق کی مثال

۲۸۵

بیالیسواں شاہ

شاہ صاحب پر میدائے حیات کے اسرار کا منکشف کیا جانا،

۲۸۹

تینتالیسواں شاہ

(۱) اولیاء اللہ سے کرامات کس طرح ظاہر ہوتی ہیں۔

(۲) اولیاء کی دو قسمیں

(۱) ایک وہ جن کے نفس ناطقہ کی ہمت ان کے سامنے متمثل ہو جاتی ہو۔

(ب) دوسرے وہ جن کے نفس ناطقہ کی ہمت ان کے سامنے متمثل نہیں
ہوتی۔

(۳) اولیاء کے خاص اوقات

(۴) دلی رجحانات اور باطنی تقاضوں کے اعتبار سے اولیاء اللہ کے دو
طبقے۔

۲۹۴

چوالیسواں شاہ

(۱) شاہ صاحب کا تاریخی خواب

(۱) اپنے آپ کو قائم الزمان ”دیکھنا“ یعنی اللہ تعالیٰ کا اُنہی دُنیا

میں نظام خسر قائم کرنے کے لئے آپ کو ذریعہ بنانا۔
 (ب) کفار کے بادشاہ کا مسلمانوں کے شہر پر قابض ہونا اور اجیر میں
 کفر کے شکار اور رسوم کو جاری کرنا۔
 (ج) اللہ تعالیٰ کا غضب میں آنا اور اسی کے ساتھ شاہ صاحب کا
 بھی غضب ناک ہونا، اور ہر نظام کو توڑ دو فرمانا
 (د) لشکر کفار سے مسلمانوں کا لڑنا اور کفار کے بادشاہ کا قتل کیا
 جانا

۳۰۱

پنیتا لیسوال مشاہد

- (۱) وحدت سے کثرت کے ظہور کا باعث :- وحدت کی یہ حرکت جو وجود
 کی کثرت میں تدریجاً نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کا باعث پاک اور مقدس محبت ہے۔
- (۲) ابتداء کے امر میں یہ محبت بسیط تھی، بعد میں اس سے جزوی محبتیں ظاہر
 ہوتی چلی گئیں۔
- (۳) ہر فرد میں ایک نہ ایک جزوی محبت ہوتی ہے۔
- (۴) افراد کا مدارج کمال۔
- (۱) ایسا فرد جو جامع ہواہیات اور کونیات کے دونوں عالموں کا
 اور اس سے مقصود کل عالم کے ظہور کی تدبیر ہو تو وہ "فرد" بنی ہوتا ہے۔
- (ب) ایسا فرد جس کے ظہور سے مقصود ایسے کمالات کا اثبات ہے کہ
 ان کی وجہ سے الہی قوتیں کو نیاتی قوتوں پر غالب آجائیں تو یہ "فرد ولی"
 ہوتا ہے۔
- (ج) "فرد" کے سفر کمال کا ذکر۔

(د) انسان کے دس ظاہر رقیقے اور ان کے اثرات

(س) فرد کی خصوصیات

(س) بعض طبائع کے لئے حسین چیزوں سے لذت اندوز ہونا ہی ذکر الہی بن جاتا ہے۔

(۵) سید عبدالسلام بن شیش مشہور صوفی کی مندرجہ ذیل دعا کی تفسیر:-

”اے رب! حجابِ اعظم کو میری روح کی زندگی بنا، اور یہی وہ حجابِ اعظم ہے جس کی روح میری حقیقت کا راز ہے۔ اور اس حجابِ اعظم کی حقیقت ہی حقِ اول کے متحقق ہونے کے ذریعہ میرے تمام عالموں کو جامع ہے۔“

(۱) بنی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس کے ظہور کی تین نشاتیں،

حقیقتِ محمدیہ :-

روحِ محمدی :-

ذاتِ محمدی کا ظہور مادی :-

(ب) دعا کا حاصل مقصود :- موصوف اللہ تعالیٰ سے اپنی فطری استعداد کی زبان سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں بنی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان تین نشاتوں میں بازا جمال اور ان میں سے ہر پر نشاۃ کے مخصوص کمالات میں سے بالتفصیل آپ کا وارث بنائے۔

(۶) عارف کے وصالِ باشر کی نوعیت :- عارف جب اپنے ”انا“ کی حقیقت کو منسوخ اور غبرد کر لیتا ہے، تو اس ضمن میں اُسے ذاتِ حق کا وصال ہوتا ہے۔
(۷) ذاتِ حق کو استیاء کا علم کیسے ہوتا ہے :- اس علم کی دو جہتیں۔

۳۳۱

چھالیسواں مشاہدہ

(۱) کسی ملت یعنی شریعت اور کسی مذہب یعنی فقہی مسلک کے حق ہونے کے معنی

(۱) معنی جلی

(ب) معنی حنفی

(۲) مذہب حنفی کے حق ہونے کے ایک عمیق راز کا شاہ صاحب پر کھولا جانا۔

۳۳۹

آخری مشاہدہ

(۱) شاہ صاحب پر صراطِ مستقیم کی حقیقت کا انکشاف۔ انسانوں میں سے ہر طبقے کا خواہ وہ طبقہ ذکی ہو یا غبی، اپنا اپنا صراطِ مستقیم مہیا ہے۔

(۲) انسانی افعال میں سے ہر فعل کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے، جو اس کے ظہور پذیر ہونے کا باعث بنتی ہے۔

(۳) اسی طرح شریعتوں کے ظہور پذیر ہونے کی بھی اپنی علت ہوتی ہے۔

مقدمہ

ابعد الطبیعیات و کونیات، الہیات و اسلامیات اور تصوف و حکمت کے یہ سارے مباحث جن کا ذکر ابھی ہم پیش لفظ میں اشارہ کر آئے ہیں، فیوض الکریم میں بیان کئے گئے ہیں، اس نوع کے مباحث ایک تو یوں بھی دقیق ہوتے ہیں اور دوسری دقت اس ضمن میں یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اس کتاب میں ان مباحث کو ترتیب وار بیان نہیں فرمایا۔ مثلاً ایک موضوع کے متعلق ایک بات انہوں نے کہیں شروع میں کہی ہے، پھر کتاب کے یں میں اس کا ذکر کر دیا ہے، اور ایک آدھ جگہ آخر کتاب میں اسی موضوع کی طرف اشارہ کر گئے ہیں۔ چنانچہ اس بے ربطی اور عدم ترتیب کی وجہ سے کتاب کے یہ مباحث اور بھی دقیق ہو گئے ہیں۔

اس سلسلہ کی تیسری دقت اور شاید قارئین کرام کے لئے وہ سب سے بڑی دقت ہو، شاہ صاحب کا طرز بیان اور ان کی فنی زبان ہے۔ اس زبان اور طرز بیان پر اس زمانے کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کا اتنا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے کہ جب تک ان تصورات پر پورا عبور نہ ہو، شاہ صاحب کا مقصود پانا محال ہے اب

مشکل یہ ہے کہ یہ مابعد الطبیعیاتی تصورات ایک تو اس زمانے میں بالکل غیر مانوس ہو گئے ہیں، اور پھر ان میں اتنے خیالی الجھاؤ ہیں، اور ان کی ہیئت ترکیبی میں اس قدر متنوع اور مختلف عناصر کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان تصورات کی بیچ در بیچ گریہوں کو سلجھا کر اصل مطلب تک پہنچنا بڑی محنت اور غیر معمولی صبر چاہتا ہے۔ اور ہر ٹیٹھنے والا اس کو وہ کئی کئی لئے عام طور پر تیار نہیں ہوتا اور نہ اس کے پاس اتنا وقت ہی ہوتا ہے کہ وہ اتنی دیدہ ریزی کر سکے، اور آئندہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے حکیمانہ افکار کی عام اشاعت میں یہی حیراب تک سب سے بڑی مانع رہی ہے۔

”مقدمہ“ کے ان صفحات میں ہم نے کوشش کی ہے کہ فیوضِ احمرین کے اہم مباحث کا مختصر سا خلاصہ مناسب عنوانات کے ماتحت جہاں تک ممکن ہو عام فہم پیرے میں پیش کریں شاید اس سے قارئین کرام کو کتاب کے جملہ مباحث سے دلچسپی پیدا ہو سکے، اور جس مقصد کے لئے زیر نظر کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہو۔ اس طرح وہ بھی پورا ہو جائے،

لیکن قبل اس کے کہ اس سلسلہ میں کچھ اور کہیں، یہاں ایک مسئلے کی وضاحت کر دینا ہم بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے کئی جگہ لکھا ہے کہ میں نے خواب میں یہ چیزیں یوں دیکھی، یا مثلاً انہوں نے اس طرح کی باتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ میں نے شہدائے بدر کی قبروں سے نور کو روشن ہوتے دیکھا، یا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو ظاہر اور عیاں اپنے سامنے پایا، نیز یہ کہ میں نے آپ کی قبر مبارک سے چشمے کی طرح نور کو پھوٹتے ہوئے دیکھا یا ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف متوجہ تھا کہ ایک نور جو بلند یوں کی طرف پرواز کر رہا تھا، طلوع ہوا اور اس نور سے میرا خیال سترتا پیر ہو گیا، اور اس کی تابانی دیکھ کر میں حیرت میں پڑ گیا، مجھے بتایا گیا کہ یہ نور

نور عرش ہے۔ یا میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ میں نے خود اپنا نور دیکھا، وغیرہ وغیرہ۔
اب سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب کی ان خوابوں اور ان کے ان مکاشفات کی آخر حقیقت کیا ہے؟ جہاں تک ان مکاشفات کا تعلق ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ وہ اس عالم مادی سے ماوراء جو عالم مثال ہے، یہ سب کے سب اس کے واردات ہیں۔ صوفیائے کرام کے نزدیک یہ وہ عالم ہے جس میں عالم مادی کی ہر چیز کا مثالی نمونہ موجود ہے۔ اور اس سے ضرورت کے مطابق اس عالم مادی میں چیزیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ اور نیز وہ کیفیات اور معانی جن کو اس دنیا میں ہم اپنی جسمانی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ عالم مثال میں یہ سب مادی شکلوں میں مجسم نظر آتے ہیں۔ صوفیاء کرام اس عالم کے حقیقی اور واقعی ہونے کا پورا یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ مکاشفات میں جو کچھ وہ دیکھتے ہیں، اس کا تعلق ان کے نزدیک اسی عالم سے ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے ”حجۃ الشرا ببالفسہ“ میں عالم مثال پر بحث کرتے ہوئے اس نوع کے مکاشفات کو تسلیم کرنے کے بارے میں تین گروہ بتائے ہیں۔ ایک وہ جو اس عالم کو خارج میں واقعہ موجود مانتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ خود میرا اپنا یہ مسلک ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ بے شک دیکھنے والے کو تو یہ واقعات اسی طرح ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن خارج میں ان کا وجود نہیں ہوتا، شاہ صاحب اس گروہ والوں کو بھی اہل حق میں شمار کرتے ہیں، البتہ تیسرا گروہ جس کا کہنا یہ ہے کہ ان واقعات کی حیثیت محض تمثیل کی ہوتی ہے، اور یہ ادائے مطالب کا بس ایک پیرایہ ہے، شاہ صاحب کے نزدیک اہل حق میں سے نہیں۔

الغرض ”فیوض الکریمین“ کے ان مکاشفات کے متعلق اگر قارئین کرام کو

اس بات کے تسلیم کرنے میں تامل ہو کہ واقعہ یہ مکاشفات اس شکل میں خارج
میں رونما ہوئے یا نہیں تو وہ بڑی آسانی سے ان کو اس طرح مان سکتے ہیں کہ شاہ
صاحب نے تو بیشک اپنے مکاشفات میں ان سب واقعات کو ضرور اسی طرح
دیکھا ہوگا لیکن خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔

باقی رہا شاہ صاحب کے خوابوں کا معاملہ، تو ان کی حقیقت بھی ان کی زبان ہی
سے سن لیجئے، "ہمعات" میں خوابوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"روحانی کیفیات میں سے ایک کیفیت یہ ہے کہ راہِ طریقت کے
سالک جب عالمِ ناسوت کی پستی سے نکل کر عالمِ ملکوت کی بلندی پر فائز
ہوتے ہیں اور خسیں اور ناپاک اعتبارات کو کلیتہً ترک کر دیتے ہیں تو
اس حالت میں وہ لطیف اور خوشگوار کیفیات میں اس طرح سرشار
ہو جاتے ہیں گویا ان کے نفوس ان کیفیات میں ڈوب کر بالکل فنا
ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص بیداری اور حالتِ خواب
میں ان کیفیات کو اپنے اندر یکساں پاتا ہے، اور جب یہ شخص سوتا
ہے اور اس کے ظاہری حواس نفسانی خواہشات کے اثر و تصرف سے
امن میں ہوتے ہیں اور وہ فی الجملہ طبیعت کے تقاضوں اور اس کے
احکام سے رہائی حاصل کر لیتا ہے۔ تو اس حالت میں وہ تمام
صورثیں جو اس کے دل کے اندر جمع ہوتی ہیں، خواب میں بر ملا طور
پر اس کے سامنے نظر آتی ہیں۔ اور وہ ان کی طرف پوری طرح متوجہ
ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سالک پر اس مقام میں عجیب عجیب چیزیں اور طرح
طرح کے معاملات ظاہر ہوتے ہیں۔"

مکاشفات اور خوابوں کی اصل حقیقت کی اس وضاحت کے بعد اب ہم

اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

مابعد الطبیعات

ایک ذات نے یہ کل کائنات کیسے پیدا کی، یا ایک وجود سے اس کثرت کا کس طرح ظہور ہوا۔ مابعد الطبیعات کے اس نازک مسئلے کو سمجھنے کے سلسلہ میں انسانوں میں عام طور پر یہ تین رجحان پائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ ذات حق نے کائنات کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا اور اس کے حکم سے کائنات وجود میں آگئی۔ دوسرا رجحان ان لوگوں کا ہے جو ذات اول کو عقول کا سرچشمہ اصل مانتے ہیں، ان کے نزدیک سب سے پہلے عقل اول کا ظہور ہوا، اور پھر اس سے تدریجاً اور عقلوں کا نزول ہوتا گیا، یہاں تک کہ یہ سلسلہ کائنات کے وجود پر ختم ہوا۔ تیسرا رجحان یہ ہے کہ یہ ساری کثرت جو ہمیں نظر آتی ہے ایک وجود سے نکلی ہے اس وجود سے متعدد تنزلات ہوئے اور انہی تنزلات کا آخری نتیجہ یہ کائنات ہے، اب پہلا رجحان تو عام اہل مذاہب کا ہے، دوسرا رجحان ارباب عقل اور فلسفیوں کا اور تیسرا رجحان صوفیاء کا۔ شاہ صاحب اپنے مابعد الطبیعاتی تصورات میں بالعموم ان تینوں رجحانات کو سمیٹنے اور ان میں توافق اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس ضمن میں تینوں گروہوں کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ بے شک اس سے قدرے گنجلاک پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر شاہ صاحب کا جو اصل مقصود ہے، اس پر نگاہ رہے تو اصطلاحات کا یہ اختلاف زیادہ پریشان کن نہیں رہتا۔

ذات حق مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھی؟ شاہ صاحب نے اس سلسلہ کو مقام تفکر میں یوں دیکھا، فرماتے ہیں۔

”ذات حق خود اس امر کی متقاضی تھی کہ وہ استعدادیں جو اس کے اندر مضمر ہیں، ان کا ظہور عمل میں آئے۔ چنانچہ سب سے پہلے ذات حق کا جو مرتبہ واجب ہے اس مرتبے میں ذات حق کی ان استعدادوں کا عقلی ظہور ہوا، اس ظہور سے وہاں اشیائے ممکنات کے ”اعیان“ اور ذات واجب کے ظہور کی ہر صورت اور اس کی تدلی کے ہر منظر کے ”شیون“ متمثل ہوئے۔ مرتبہ واجب میں ذات حق کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ ان ظہورات کو عدم، مادہ اور خارج سے متصف کرے چنانچہ اس ضمن میں اس نے جو کچھ کہ اعیان اور پہنائیوں میں مضمر تھا اُسے ظاہر کر دیا، اور اس سلسلے میں سب سے پہلے جو چیز ظہور پذیر ہوئی، وہ اللہ تعالیٰ کا نور تھا، اس نور نے عدم اور مادہ کا پوری طرح سے احاطہ کر لیا، اور اس پر یہ مسلط ہو گیا اور یہ نور قائم مقام بن گیا ذات حق کا۔ اور یہ نور قدیم الزمان ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک زمان، مکان اور مادہ ایک ہی چیز ہے اور یہی وہ استعداد ہے جس کو ہم نے عدم اور خارج کا نام دیا ہے صفحہ ۲۰۶

ہر فعل کے لئے کسی نہ کسی علت کا ہونا ضروری ہے۔ شاہ ضاد اب اس کلمے کو منوانے کے بعد مخلوقات کے ظہور کی آخری علت کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

”اس عالم میں مخلوقات کے ظہور کی جو بھی علتیں ہیں، ان کا سلسلہ ارتقاء آخر میں جا کر ارادۃ الہی پر ختم ہوتا ہے لیکن خود اس ارادۃ الہی کی بھی ایک علت ہے، جس سے کہ اس کا صدور ہوتا ہے اور وہ علت ہے ذات الہی کا خود اپنا اقتضا، ارادے کے لئے، اور ارادے کا لازم ہونا ذات الہی کے لئے۔“

.... واقعہ یہ ہے کہ ذات واجب الوجود سے ارادے کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے ان تاثیر کرنے والی استعدادوں کا جنہیں ”اعیان“ کہا جاتا ہے،

ذات واجب سے تعلق ہے، یعنی میں طرح ان اسماء اور اعیان کے ظہور کے لئے ذات واجب کا اقتضا ہوتا ہے، اور ذات واجب کے لئے ان اسماء اور اعیان کا ہونا لزوم میں ہے، اسی طرح ذات واجب کے ساتھ ارادے کا تعلق ہے۔ اور یہ جوہر تاثیر کرنیوالی استعدادیں یعنی اسماء اور اعیان ہیں، ان کے ظہور کی ایک حد مقرر ہے، جو خود ذات واجب کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس میں نہ زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی۔ صفحہ ۴۵
شاہ صاحب نے اس مسئلے کو وضاحت کے لئے ایک حساب کرنے والے کی مثال دی ہے۔

”ایک حساب کرنے والا جب حساب کرتا ہے تو اس کے حساب کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کا ارادہ ایک عدد سے متعلق ہوا تو اس سے ایک بنا، اور جب ایک کے عدد کو اس کی نظر نے دوبارہ دیکھا تو دو کا عدد معرض وجود میں آگیا۔۔۔۔۔ غرض کہ جب حساب کرنے والا کا ارادہ ایک سے دو، دوسے تین، اور اسی طرح تین سے چار کا عدد ہو، اس کو اس سے نکالتا چلا جائے گا تو جہاں تک کہ حساب کرنے والے کے علم کی حد ہوتی ہو، اس حد تک اس ایک عدد سے اکائیاں، دہائیاں، سینکڑے اور ہزار نکلتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ جہاں تک کہ حساب کرنے والے کی عقل فرض کر سکتی ہے، وہ ان اعداد کو ایک دوسرے کے ساتھ برابر جمع کرتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ یہ اعداد اپنی اس شکل میں لا نہایت حد تک پہنچ جائیں۔ اب اگر ان تمام اعداد کو ان کی اصل کی نسبت سے جو ایک کا عدد ہے، اور جن سے کہ یہ سب اعداد نکلتے ہیں، دیکھئے تو یہ سب اعداد ایک کے عدد میں محصور نظر آئیں گے، اور ان اعداد میں آپس میں جو فرق مراتب ہے تو وہ اس ایک کے عدد کے اعتبار سے نہیں ہوگا، بلکہ جس طرح یہ اعداد درجہ بدرجہ اس ایک کے عدد سے نکلتے ہیں، ان میں فرق مراتب اس لحاظ سے ہوگا، اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اعداد کی ان بے شمار صورتوں کے ظہور کی علت صرف اتنی ہوتی کہ

محاسب کے اندر حساب کرنے کا ایک کمال موجود تھا۔ چنانچہ محاسب نے اپنے اس کمال کو ظہور میں لانے کا ارادہ کیا، اور اس طرح یہ اعداد معروضی وجود میں آئے۔ چلے گئے۔ باقی رہا خود ان اعداد میں جو ترتیب، حصر اور انضباط ہے کہ اس میں نہ کمی ہو سکتی ہے اور نہ بیشی، تو یہ چیز تو محاسب کے ارادے کی فعلیت سے پہلے ہی ان اعداد کی خود اپنی طبیعت میں موجود تھی۔ اور محاسب کا ارادہ جب ان اعداد کو اس ترتیب و انضباط سے وجود میں لاتا ہے، تو وہ گویا ان اعداد کی جو اپنی طبیعت ہوتی ہے، ان کے ظہور کے جو اپنے احکام ہوتے ہیں، وہ انہی کو پیش کر دیتا ہے۔ "صفحہ ۲۵۸"

ان اعداد اور اعمیاء کو ماہیات بھی کہتے ہیں۔ ظہور کائنات کے سلسلہ میں "ماہیات" کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

اب جو ہم چیزوں کے بنانے اور ان کے ایجاد کرنے کو ان چیزوں کی ماہیات کی طرف منسوب کرتے ہیں [پہلے قبل تخلیق حق تعالیٰ کے علم میں موجود تھی۔ پھر اس نے ان اشیاء کی خارج میں تخلیق فرمائی۔۔۔ یعنی اشیاء قبل تخلیق خارجی علم الہی میں ثابت ہیں۔ اس حالت میں یہ اشیاء "معلومات حق" ہیں حضور علیہ حق ہیں۔ انہی کو "اعیان ثابتہ" ماہیات اشیاء اور حقائق اشیاء کہتے ہیں، مترجم [تو ماہیات کی طرف ہمارا ان چیزوں کو منسوب کرنا ایسا ہی ہے، جیسے ہم ادھر کی صورت میں اعداد کے عدم سے وجود میں آنے کو محاسب کی تاثیر کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ اور "ماہیات" میں ان چیزوں سے ظہور پذیر ہونے سے پہلے ان چیزوں کی ان "ماہیات" اور ان کے لازم کو ذات حق سے جس سے کہ ان "ماہیات" کا فیضان ہوتا ہے، ایسی ہی نسبت ہو جیسی کہ ان اعداد کے ترتیب و درجہ کو اس ایک کے عدد سے ہے جس سے کہ یہ سب اعداد نکلے ہیں، اور ایک عدد کا دوسرے پر تقدم اور ان کا آپس میں جو فرق مراتب ہے، یہ خود ان اعداد کی اصل طبیعت میں داخل ہے، الغرض جب

یہ بات واضح ہو گئی تو اس سے لوگ یہ جو کہتے ہیں کہ "ماہیات" غیر محمول ہیں یعنی یہ بنائی نہیں گئیں، بلکہ ان کے بنانے اور ایجاد کرنے کا مطلب صرف ان کا ظہور اور فیضانِ مقدس ہے، سمجھ میں آجائے گا، صفحہ ۲۵۹

"ماہیات" نام ہے پیدا ہونے والی اشیاء کے متعلق اللہ تعالیٰ کے اس علم کا جو اسے ان چیزوں کو وجودِ بادی میں لانے سے پہلے تھا۔ یہ پیدا ہونے والی تمام کی تمام اشیاء ایک موطن میں بالترتیب جمع تھیں جسے "طبیعت کلیہ" کہا گیا ہے اس "طبیعت کلیہ" سے اشیاء کس طرح ظاہر ہوئیں، اس بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"الغرض جس طرح اعداد کا سلسلہ ایک کے عدد سے لیکر لاتناہی حد تک بالترتیب چلا گیا ہے، اور اعداد کا یہ سارے کا سارے لاتناہی سلسلہ اسی ایک کے عدد کے اندر فرضاً اور تقدیراً موجود ہے، نہ کہ فعلاً، اسی طرح طبیعت کلیہ کے اندر جو بھی اس کے ارکان اور نیز جو بھی جمادات، نباتات و حیوانات ہیں، ان سب کا ایک مرتب سلسلہ جس کے خواص اور مراتب معلوم ہیں، موجود ہے۔ اس طبیعت کلیہ سے انواع کا ظہور ہوا، اور انواع کا یہ ظہور حساب میں جو تقسیمِ حصری کا طریقہ ہے، اس کے مطابق ہوا، یعنی ان میں نہ مزید کوئی زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی۔ ان انواع سے پھر افراد ظاہر ہوئے۔ . . . قصہ مختصر ماہیات الماہیات اور حقیقتہ الحقائق" سے لے کر انواع و افراد کا یہ جو سلسلہ لاتناہی حد تک پھیلتا چلا گیا ہے، یہ سب کا سب حقیقتہ الحقائق اور اشیاء کے اصل بسط میں باعتبار فرض اور امکان کے نہ کہ بلحاظ تمین بالفعل کے موجود تھا" صفحہ ۲۶

ذات حق نے ارادہ کیا، اور اس کے ارادہ کرنے سے کائنات کا سلسلہ وجود میں آگیا، اب سوال یہ ہے کہ ذات حق نے یہ جو ارادہ کیا، تو اس کا باعث

”ہمیں اس کا مشاہدہ ہوا ہے، کہ انسانیت کے ظہور کا جو اساس اصلی ہے۔ وہ محض حیوانیت کے تابع نہیں، بلکہ حیوانیت سے زائد انسانیت میں ایک اور محبت ہے جو ذات و احد سے ابتداء میں ظاہر ہوئی تھی، اور اسی طرح حیوانیت کے ظہور کا جو اساس ہے وہ بھی تمام تر ناموسیت یا نباتیت کے تابع نہیں ہے“ (صفحہ ۴۴)

ذات حق کے فیض تخلیق سے اشیاء تو اس عالم میں موجود ہو گئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان اشیاء کی لمحہ بہ لمحہ نقل و حرکت کا ذات حق کو کیسے علم ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعات کا یہ بڑا اہم مسئلہ ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں: ”ذات اول کو دو جہت سے اشیاء کا علم ہوتا ہے، ان میں سے ایک اس کے علم کی اجمالی جہت ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ذات اول کو اپنی ذات کا علم ہوا تو اس ضمن میں اس نے نظام وجود کے سلسلہ میں اپنا جو اقتضائے ذاتی تھا۔ اس کو بھی جان لیا۔ بات یہ ہے کہ علت تامہ کا معنی وہ علت جس کا لازمی نتیجہ اس سے معلول کا صدور ہو، علم اس امر کی کفایت کرتا ہے کہ علت تامہ کے ساتھ ساتھ معلول کا بھی علم حاصل ہو گیا۔ اب جہاں تک کہ اشیائے عالم کا تعلق ہے، وہ سب کی سب وجود الہی میں موجود تھیں۔۔۔۔۔ چنانچہ اگر ایک چیز جب متحقق ہوئی تو اس کا متحقق ہونا اس بنا پر تھا کہ ذات واجب نے اسے متحقق کیا، اور اسی طرح ایک چیز جب وجود میں آئی تو اس کا وجود میں آنا اس وجہ سے تھا کہ ذات واجب نے اسے ایجاد کیا۔ غرضیکہ ہر چیز کے مقابل ذات واجب کا ایک کمال اور اس کا اقتضائے ذاتی ہے، اور ذات واجب کے یہی وہ کمالات ہیں جو اشیاء کے ظہور کا منبع اور ان کے حقائق کی اصل کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر چیز کی ذات واجب

”خارج میں جب شخص اکبر کا وجود بنا تو سب سے پہلا کام شخص اکبر نے یہ کیا کہ اس نے اپنے رب کو پہچانا، اور اس کی جناب میں عجز و نیاز مندی کی اور یہ عجز و نیاز مندی شخص اکبر کے ادراک میں ایک علمی صورت کی طرح نقش ہو گئی۔ صفحہ ۷۷

جس طرح شخص واحد عبارت ہوتا ہے جسم اور نفس دونوں کے مجموعہ سے، اسی طرح کل کائنات کا بھی ایک کلی جسم اور ایک کلی نفس مانا گیا ہے۔ اور ان دونوں کے مجموعے کا نام شخص اکبر ہے، اس شخص اکبر سے جب افلاک، عناصر، انواع اور افراد نکلے تو اللہ تعالیٰ کو جاننے کی وہ علمی صورت جو شخص اکبر کے ادراک میں پہلے پہل نقش ہوئی تھی اس سے بھی بہرہ ور ہوئے، اور اسی طرح انسانوں کے اندر ذات حق کی ایک تدلی یا اس کا جلوہ مستقر ہو گیا۔ صفحہ ۷۸

شخص اکبر کی اس تدلی کی نوعیت کیا ہے۔ اس بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

”شخص اکبر نے جب اپنے رب کو اس طرح جان لیا جیسا کہ اس کے جاننے کا حق تھا اور اس نے اپنے رب کا اس طرح تصور کر لیا جس طرح کہ اس کو تصور کرنا چاہیے تھا تو اس نے رب کو اس طرح جاننے اور اس کا اس طرح تصور کرنے سے شخص اکبر کے ادراک میں اللہ تعالیٰ کی ایک با عظمت صورت نقش ہو گئی، جو ترجمان بن گئی اللہ تعالیٰ کی جلال شان اور اس کی عزت و رفعت کی چنانچہ جب تک شخص اکبر کا وجود قائم ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ صورت بھی اس کے اندر موجود رہے گی۔ صفحہ ۱۲۱

افراد انسانی چونکہ اسی شخص اکبر کا حصہ ہیں، اسی لئے ان میں سے ہر ہر فرد کے اندر شخص اکبر کی اس صورت کا کسی نہ کسی حد تک ہونا ضروری ہے، نفس انسانی کا یہ نقطہ جسے ”نقطہ تدلی“ کہا گیا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ جیسے جیسے

اسباب و حالات ہوتے ہیں، انہی کے مطابق، ”یہ نقطہ تدلی“ اور اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۲۲

آخر یہ تدلی کیا چیز ہے؟ ذات حق کے لامحدود کمالات میں سے اس عالم میں جب کوئی اس کمال اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عنوان بن جاتا ہے۔ ذات حق کا، تو ذات حق کے کمال کے اس طرح ظہور پذیر ہونے کو تدلی کہتے ہیں اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:-

”مہیں جانتا چاہیے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی ایک عظیم الشان تدلی ہے جو خلق کی طرف متوجہ ہے۔ لوگ اسی تدلی کے ذریعہ ہدایت پاتے ہیں اس تدلی کی ہر زمانے میں ایک نئی ”شان“ ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک زمانے میں ایک منظر میں ظاہر ہوتی ہے اور دوسرے زمانے میں دوسرے منظر میں، اور جب کبھی یہ تدلی کسی خاص منظر میں ظاہر ہوتی ہے تو اس منظر کا عنوان ”رسول“ ہوتا ہے۔“ صفحہ ۱۳۲

شاہ صاحب کے نزدیک ”رسول“ بے شک اس تدلی کے کسی خاص منظر کا عنوان بنتا ہے، لیکن احبار اور رہبان اور حکماء اور محدثین بھی تدلی الہی کے اسی سرچشمے سے ہی علم حاصل کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ”میں نے اس تدلی کو جو اپنی ذات میں ایک ہے دیکھا اور یہ پایا کہ جیسے جیسے خارجی حالات و اسباب ہوتے ہیں، اسی مناسبت سے وہ طرح طرح کے مظاہر میں صورت پذیر ہوتی ہے۔ خارجی حالات و اسباب سے میری مراد لوگوں کی عادت و اطوار اور ان کے ذہنوں میں جو علوم مرکوز ہوتے ہیں، ان سے ہے۔“ صفحہ ۷۶

دوسرے لفظوں میں ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت آتی

ہے وہ اس زمانے کے مذاق اور اس کی خصوصیات کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہے اور آخر ایسا کیوں نہ ہو، خود شاہ صاحب کے الفاظ ہیں -
 ”جہاں تک تدلی اور شعائر کے ظہور کا تعلق ہے تو لوگوں کے جو مسلمات ہوتے ہیں، اور جو چیزیں ان کے ہاں مشہور ہوتی ہیں، اور لوگوں کے دل اُن پر مطمئن ہوتے ہیں، تدلی اور شعائر ان چیزوں ہی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی تدلی کا ظہور ہوتا ہے، لوگوں کے مسلمات ہی اس کے نزول کا ذریعہ بنتے ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو، آخر تدلی سے اللہ تعالیٰ کا مقصد تو یہی ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ جہاں تک کہ ان سے ہو سکے، اس کی اطاعت کریں اور اپنے اعضاء و جوارح کو اعمال اطاعت کا عادی بنائیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تدلی لوگوں کے لئے مانوس صورتوں میں ظاہر ہو“ صفحہ ۹۱

اس سلسلہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ”مکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال گزرے کہ ہر تدلی کا خارق عادت اور اعجاز ہونا ضروری ہے، اس لئے کیسے ہو سکتا ہے کہ تدلی لوگوں کے مسلمات کے مطابق ہو“ اس پر شاہ صاحب نے مفصل بحث کی ہے۔ اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تدلی کی وجہ سے ان چیزوں میں ایسی خیر و برکت پیدا ہو گئی جو دوسری چیزوں میں نہ تھی اور ان چیزوں کا خارق عادت ہونا دراصل اسی خیر و برکت کے لحاظ سے تھا نہ اس وجہ سے کہ ان چیزوں میں خلاف عادت کوئی تبدیلی ہو گئی ہو، صفحہ ۹۲
 شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس تدلی کے مختلف نمائوں میں مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہونے کی حکمت اور پھر اس تبدیلی کی ایک صورت کا دوسری صورت سے جو وجہ امتیاز ہے اور جو دراصل نتیجہ ہوتا ہے اُن

خارجی حالات و اسباب کا جو اس تبدیلی کے طور کا باعث بنتے ہیں، الغرض اللہ تعالیٰ نے مجھے اس حکمت اور اس وجہ امتیاز سے آگاہ فرمایا "صفحہ ۶"

اب اگر آپ اس تبدیلی سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت و ارشاد کا وہ سلسلہ مراد لیں جو اہل مذاہب کے نزدیک روزِ اول سے اب تک انسانوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے جاری ہے تو شاہ صاحب نے اس ضمن میں اپنی جو خصوصیت بیان فرمائی ہے، اس کے معنی یہ لئے جاسکتے ہیں کہ شاہ صاحب یہاں مذاہب کے ارتقاء کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مجھے قدرت کی طرف سے ارتقاء کو تاریخی نقطہ نظر سے دیکھنے کا ملکہ عطا کیا گیا ہے۔

وحدت الوجود

شاہ صاحب نے خواب میں (پیلا مشاہدہ) دیکھا کہ اہل اللہ کا ایک گروہ ہے جو عقیدہ وحدت الوجود کو ماننا ہے۔ اور اس کائنات میں ذاتِ باری کے وجود کے جاری و ساری ہونے کے متعلق وہ کسی نہ کسی شکل میں غور و فکر کرنے میں مشغول ہے، اور چونکہ اس ضمن میں ان سے ذاتِ حق کے بارے میں جو کل عالم کے انتظام میں بالعموم اور نفوسِ انسانی کی تدبیر میں بالخصوص مصروف کار ہے، کچھ تفصیل ہوئی ہے، اس لئے ان لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ندامت ہے اور ان کے چہرے سیاہ ہیں، اور ان پر خاک اڑ رہی ہے۔

اس سلسلہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بیشک وحدت الوجود کا مسئلہ تو علومِ حقہ میں سے ہے اور ذاتِ حق میں کل موجودات کو گم ہوتے دیکھنا بھی

امر واقعہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نفوس انسانی میں الگ الگ استعدادیں رکھی ہیں۔ چنانچہ ہر نفس اپنی اپنی فطری استعداد کے مطابق ہی علوم حقہ میں سے اگر کسی علم کو حاصل کرے تو اس کی صحیح معنوں میں تہذیب و اصلاح ہوتی ہے۔ اب ہوا یہ کہ یہ گروہ جس کو وحدت الوجود پر اعتماد تھا، ان کی اس معاملہ میں بیشک اصل حقیقت تک تو رسائی ہو گئی لیکن چونکہ ان کی طبیعت کو اس علم سے فطری مناسبت نہ تھی، اس لئے وحدت الوجود سے انہیں ندامت اور روسیاسی کے کچھ حال نہ ہوا، صفحہ ۵۶

یعنی وحدت الوجود کا مسئلہ اپنی جگہ امر حق ہے، لیکن اگر اس سے تہذیب نفس نہیں ہوتی تو وہ بے کار محض ہے، بے شک وجود باری موجودات میں جاری و ساری ہے، اور مبدلے اول اپنے ارادہ حیات میں عالم کے مظاہر حیات میں متوجہ بھی ہے، لیکن عارف کامل کے لئے ضروری ہے کہ ان امور میں وہ اس طرح غور و فکر نہ کرے کہ اس کے اندر فرسودگی آجائے اور اس کی کیفیات اور جذبات کی تروتازگی باقی نہ رہے، صفحہ ۱۹

اگر کوئی عارف اس ابتلا میں پڑ جائے تو وہ یقیناً فریب زدہ ہو۔ چنانچہ اس ضمن میں شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے حقیقت معلوم ہوئی کہ وہ شخص جس سے غیر اللہ سے تعلقات محبت کو بالکل منقطع کرے، صرف اللہ ہی سے محبت رکھنے، غیر اللہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح عداوت کرے اور نیز اللہ کے ساتھ محض علم و معرفت کے اعتبار سے نہیں بلکہ عملاً اور واقعہ عشق و محبت رکھنے میں کوتاہی ہو تو بے شک وہ شخص فریب زدہ ہے خواہ اس کا سبب یہ ہو کہ وہ شخص کائنات کی اس کثرت میں ایک ہی وجود کو جاری و ساری دیکھنے میں منہمک ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ

اس کائنات کی ہر چیز سے محبت کرتے لگتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک وہی ایک وجود جو کہ اس کا محبوب ہے، اس کل کائنات میں جاری و ساری ہے۔ "صفحہ ۱۲۵

شاہ صاحب کے زمانے میں وحدت الوجود اور وحدۃ الشہود کا مسئلہ مابہ التشرع ہو رہا تھا، آپ نے ان دونوں میں مطابقت پیدا کی اور ایک ایسی راہ نکالی کہ حکمت و تدبیر دونوں کے مطالبات پورے ہو جائیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں۔

"میں نے اس پھیلے ہوئے وجود کو دو جہت سے ذات حق میں گم یا مابذات حق میں اس کے گم ہونے کی ایک جہت تو یہ ہے کہ یہ وجود چونکہ خود ذات الہی کے برابر صادر ہو رہا ہے، اس لئے میں نے اسے ذات حق میں گم ہوتے ہوئے پایا۔ اور ذات حق میں اس کے گم ہونے کی دوسری جہت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی اس وجود میں ظاہر ہوئی، اور اس نے ہر طرف سے اس وجود کو اپنے اندر لے لیا۔ چنانچہ اس طرح یہ وجود ذات حق میں مجھے گم ہوتا ہوا نظر آیا اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ وجود منبسط خود ذات حق ہے، ظاہر ہے، یہ اس کی ذیہ زندگی ہے لیکن جو شخص کہ باریک میں نظر رکھتا ہے، وہ یقینی طور پر اس معاملہ میں اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ذات واجب سے شیون الہی (شیون جمع شان کی) کا صدور ہوا جو کہ مبدائے اول میں تھیں اور ان سے اس وجود منبسط کا ظہور ہوا۔" صفحہ ۲۸۶

تاریخ اسلام میں علماء اور صوفیاء کا جھگڑا شروع سے چلا آتا ہے۔ اور یہ بحث کہ شریعت مقدم ہے یا طریقت، ایک عالمگیر نزاع کی شکل اختیار کر چکی ہے، اس سلسلہ میں شاہ صاحب کی رائے یہ ہے

"وہ علماء کہ ان کا جتنا بھی مبلغ علم ہے، وہ اسی کے مطابق مصروف عمل ہیں اور اپنی بساط کے مطابق کسی نہ کسی حیثیت سے لوگوں کے ترقی میں لگے

ہیں، اور علم اور دین کی اشاعت میں سرگرم کار ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب، ان کے ہاں زیادہ محترم اور ان کی نظروں میں زیادہ محبوب ہیں بہ نسبت ان صوفیاء کے جو گوار باب "خا و بقا" میں اور "جذب" جو نفس ناطقہ کی اصل سے پھوٹتا ہے اور توحید اور اس طرح کے تصوف کے جو اور بلند مقامات ہیں، ان پر سرفراز ہیں" صفحہ ۱۴۹

اگر یہ تمام عالم اور جو کچھ اس کے اندر ہے، سب اسی کے جلوے کا ظہور کمال ہے تو لوگوں کے اس کفر و انکار کے کیا معنی، اور بقول مرزا غالب ع
تو پھر یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے

شاید اسی حقیقت کو شاہ صاحب نے اس تمثیلی رنگ میں بیان فرمایا ہے۔
"میں روح آفتاب سے ملا اور میں نے اس سے کہا کہ اے روح آفتاب! لوگ تجھ سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہر رنگ اور ہر طور میں تیرا غلبہ اور ظہور دیکھنے کے باوجود وہ تیرا انکار کرتے اور تیرے خلاف جھوٹ باندھتے ہیں لیکن تیری حالت یہ ہے کہ نہ تو ان سے انتقام لیتی ہو اور نہ ان پر خفا ہوتی ہے۔ یہ سن کر روح آفتاب بولی کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان لوگوں کا غرور اور تکبر اور نیز ان کا اپنے آپ میں پھولانا سمانا خود میری اپنی ذاتی مسرت کا ایک منظر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میری نظر ان لوگوں کے غرور و تکبر کی طرف نہیں جاتی، بلکہ میں تو ان لوگوں کی خوشی و شادمانی کو دیکھتی ہوں اور جانتی ہوں کہ یہ سب میری اپنی خوشی و شادمانی کا ایک پر تو ہے۔ اس بات کو جانتے ہوئے کیا یہ جائز ہے کہ کوئی خود اپنے ذاتی کمال پر بگڑے۔ یا کوئی خود اپنی ذات سے انتقام لے" صفحہ ۶۴

اقبال نے اسی حقیقت کو "جہاں تیرا ہے یا میرا" کے تحت اس مصرع

میں ادا فرمایا ہے

اگر کج رو ہیں انجم، اہماں تیرا ہی میرا

اسلامیات

شرعیات کی تشکیل اللہ تعالیٰ نے جب یہ کائنات بنائی تو اس کی توجہ ایک عام تبدیلی کی صورت میں اس کائنات کی طرف ملتفت ہوئی۔ یہ تبدیلی تمام بنی نوع البشر کے لئے تھی۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ وہ اس کے ذریعے اپنے تک پہنچنے کی راہ لوگوں کے لئے آسان کر دے۔ یہ تبدیلی مختلف زمانوں میں مختلف صورتیں اختیار کرتی آتی ہے۔ اس تبدیلی کا مختلف صورتیں اختیار کرنا ان خارجی حالات و مقتضیات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جن میں یہ تبدیلی معین اور مشخص ہوتی ہے۔ تبدیلی کی ان صورتوں میں سے نبوت، نماز، الہامی کتابیں، شریعت کے احکام و ضوابط اور بیت اللہ وغیرہ ہیں۔ صفحہ ۷۵

یہ تبدیلی عبارت ہے رشد و ہدایت کے اس سلسلے سے جو ابتدائے آفرینش سے چلا آ رہا ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف مذاہب کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا رہا ہے، تبدیلی الہی کا خارجی حالات سے مطابقت ہونا ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کے الفاظ میں "شرعیات کے احکام و قواعد کی تشکیل لوگوں کی عادات کے مطابق ہوتی ہے۔ اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے، چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی شریعت کی تشکیل ہونے لگتی ہے، تو اس وقت اللہ تعالیٰ لوگوں کی عادات پر نظر ڈالتا ہے۔ چنانچہ جو عادات بری ہوتی ہیں، ان کو ترک کرنے کا حکم دیتا ہے، اور جو عادات اچھی ہوتی ہیں، ان کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا ہے۔"

شریعت کا نزول کس شخص پر ہوتا ہے؟ شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کے اخلاق میں سے ایک خلق "سمت صالح" ہے۔ اور یہ عبارت ہے ایک شخص کے نفس ناطقہ میں ان اعمال اور اخلاق کے متعلق بیداری سے جو اس کے نفس ناطقہ اور اندر کے یا اس کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہیں اور یہ خلق عبارت ہے اس شخص کے نفس ناطقہ کے نظام صالح کی طرف ہدایت پانے سے۔ الغرض جو شخص اس "خلق سمت صالح" کا مالک ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اس نسبت سے نوازتا ہے، بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معرفت اور ہدایت کا فیضان اس بندے کی کسی کاوش اور تردد کا صلہ نہیں ہوتا، بلکہ اس فیضان کو بارگاہ رحمت کی ایک برکت سمجھنا چاہیے صفحہ ۲۶۳

صاحب "خلق سمت صالح" کس طرح اس معرفت اور ہدایت سے نوازا جاتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

"یہ رحمت انسانوں میں سے کسی ایسے کامل کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو اپنی جبلت کے تقاضے سے اس امر کا مستحق ہو کہ ایک انسان پر طبیعت کے جو احکام وارد ہوتے ہیں، وہ ان سے بالاتر ہو جائے۔ اور پھر وہ کامل انسانوں کی جس جماعت میں ہو، اس جماعت کے مزاج سے، اور اس جماعت کے مناسب جو اعمال و اخلاق ہیں ان سے اور نیز اس کی جماعت کے لوگ اپنی حیوانی طبیعتوں سے ترقی کر کے کس طرح قرب الہی کے اس درجے تک جو ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے، پہنچ سکتے ہیں، اس طریقے سے اس طرح ہم نوا ہو جائے کہ اس کامل کا انفرادی وجود اس کی جماعت کے اجتماعی وجود میں فنا ہو کر بقا حاصل کرے۔ اور پھر فطرتاً اس کامل میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ وہ اپنی طبیعت کے مقام پرست سے روح کے مقام قدس کی بندیوں کی طرف جذب ہو سکے۔۔۔ الغرض

وہ کامل جس کے اوصاف یہ ہوں جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کامل کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو وہ اُسے اپنے ساتھ منضم کر لیتی اور اس کو اپنے دامن میں ڈھانپ لیتی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سراپا ہی جو مقصود و مطلوب ہوتا ہے وہ اس کامل کے اندر نقش ہو جاتا ہے، اور وہاں پر اس سرا جہالی کا یہ نقش جس جماعت میں کہ یہ کامل ہوتا ہے، اس جماعت کے لئے احکام و قوانین کے قالب میں بدل جاتا ہے..... چنانچہ انبیاء کرام پر وحی کے ذریعہ جو شریعتیں نازل ہوتی ہیں اور اولیاء پر کشف و الہام کے ذریعہ جن طریق تصوف کا نزول ہوتا ہے، ان سب کی حقیقت دراصل یہ ہے۔" صفحہ ۲۶۴

جب سے یہ دنیا بنی ہے، انبیاء پر ابھرتے چلے آ رہے ہیں اور ان کو وقتاً فوقتاً مختلف شریعتیں عطا ہوئی رہی ہیں، لیکن ایک زمانے میں کسی رسول پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، وہ جہاں تک کہ خاص اس زمانے کا تعلق ہوتا ہو قطعی اور آخری حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی اس زمانے میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اُس شریعت کے اتباع کے بغیر خیر و فلاح حاصل ہو سکے، لیکن اگر اس شریعت کو تمام شریعتوں کو سامنے رکھ کر مجموعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے گا تو پھر اس کی بے شک اضافی ہوگی، اس مسئلے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"جس طرح ہر چیز کی ایک علت مقدر ہوئی جو اس کو اس دنیا میں لانے کا سبب بنی، اسی طرح مبدائے اول کی طرف سے شریعتوں کا ظہور بذریعہ نبی واجب ٹھہرایا گیا، اور ان کے ظاہر ہونے کی صورت یہ مقرر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی ہی سے جان لیا تھا کہ جس زمانے میں کوئی شریعت نازل ہوگی اس زمانے میں "خیر و فلاح" صرف اسی شریعت کی صورت میں محدود ہوگی" صفحہ ۳۴۳

لیکن یہ کیوں؟ اس بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

ایک زمانے میں اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اس کی اس تدبیر خصوصی میں جو اس بندے کے ذریعہ دنیا میں برسر کار آتی ہے۔ محدود ہو جاتی ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب بھی اس کی اس تدبیر کی مخالفت کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ الغرض جب کسی امت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے تو اس امت کے سارے کے سارے احکام حق سے موسوم ہوتے ہیں اور ان احکام کو حق سے موسوم کرنے میں جو بات پیش نظر ہوتی ہو وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں احکام کی صرف اسی شجہ اور قالب ہی میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر مصروف کار ہوتی ہے۔ اور اس شجہ اور قالب کے علاوہ اس زمانے میں تدبیر الہی کا اور کوئی منظر موجود نہیں ہوتا۔" صفحہ ۳۳

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا پہچان ہے کہ ایک خاص زمانے میں صرف شریعت کے اسی قالب ہی میں تدبیر الہی مصروف کار ہے اور یہی شریعت حقہ اور اس زمانے کی آخری و قطعی شریعت ہے۔ اس ضمن میں شاہ صاحب کا اثر اور

- "اس سلسلہ میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ صالح نفوس جو شیطانی آلائشوں سے ملوث نہیں ہوتے، ان نفوس میں اس شریعت کے متعلق جب کہ وہ صاحب شریعت سے معجزات صادر ہوتے دیکھیں، پختہ اعتقاد پیدا ہوا اور اسی طرح عقل صحیح بھی اس شریعت کے پہچانے والے کے سچے ہونے پر دلالت کرے۔ اور اس کی تصدیق کرے کہ صاحب شریعت نے واقعی بارگاہ غیب سے اس شریعت کو لیا ہے اور نیز مبدیئے اول سے اس ضمن میں یہ بھی ضروری قرار پایا کہ زیادہ سے زیادہ نفوس فطرتاً پختہ اعتقاد والے اس شریعت سے اثر پذیر ہوں۔ اور اس کی وجہ سے ان نفوس میں عزم و ارادہ کی ایک لہر دوڑ

جائے: ”صفحہ ۳۴۴۔ مطلب یہ نکلا کہ کسی زمانے میں ایک خاص شریعت کے ”حق“ ہونے کی کسوٹی یہ ہے کہ وہ صالح نفوس کو اپنی طرف کھینچے، عقل صحیح اس کی تصدیق کرے۔ اور اس کی وجہ سے اعمال نیک کا ظہور عمل میں آئے۔

ایک شریعت جس زمانے میں ادرجن لوگوں میں اعتقاد پذیر ہوتی ہو، اس کی صورت جیسا کہ ابھی بیان ہوا، یہ ہوا کرتی ہے کہ اس وقت قوم میں جو اچھے اخلاق و آداب اور قواعد و ضوابط ہوتے ہیں، ان کو تو وہ باقی رکھتی ہے اور جو برے ہوں ان کو رد کر دیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قوموں میں یہ آداب و اخلاق کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ شاہ صاحب اس پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

”انسانوں کو فطرت کی طرف سے یہ الہام ہوا کہ وہ آپس کے تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے دستور اور قواعد بنائیں۔ اس الہام کی بنا پر انہوں نے شہری زندگی کے قاعدے بنائے، خانہ داری کے طریقے وضع کئے، معاشی اور کاروباری دستور مرتب کئے۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کے لئے قواعد اور دستور بنانے کی یہ عادت ان کی فطرت کا اصل الاصول بن گئی، اس کا شمار ان کے ہاں ضروری علوم میں سے ہونے لگا۔ جب یہ چیز لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گئی تو اس کے بعد ایسا ہوا کہ اشرقائے نے نبی کے قلب کو یہ بلیت بخشی کہ اس میں اشرقائے کا تعلیم کردہ دستور جگہ پکڑ سکے۔ اس دستور میں اشرق کی روح ہوتی ہے۔ اور اس میں برکت اور نور ہے۔ یہ ہے اشرق کی شریعت اور اسی کا نام ملت ہے“ (صفحہ ۳۴۵)

بے شک شریعت کی تشکیل تو اشرقائے کی وحی کے ذریعہ ہی کرتا ہے، لیکن اس شریعت کے لئے مواد اُس سے اُس قوم سے اور اُس ماحول و عہد ہی سے

جس میں وہ مبعوث ہوتا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے شریعتیں مختلف زمانوں میں مختلف شکلوں میں آتی رہیں۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود ان میں ایک اساسی وحدت بھی موجود رہی۔

وحی

وحی کی حقیقت کیا ہے؟ بشر کس طرح اس عالم مادی میں رہتے ہوئے اس "مقام قدس" میں پہنچ جاتا ہے، جہاں کہ اللہ اس سے کلام کرتا ہے۔ اس نازک مسئلے پر بھی شاہ صاحب نے بحث کی، چنانچہ فرماتے ہیں۔

"عارف جب اس مقام پر ہوتا ہے جو اس کی طبیعت کے قریب ہے تو اس حالت میں وہ فعل حق کا اس طرح مشاہدہ نہیں کر سکتا جیسے کہ اسے کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایسے موقع پر اکثر عارف کو الہامات اور دل کے وسوسوں میں اور الہی کیفیت اور طبیعت کے اقتضائیں اشتباہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور نیز اس ضمن میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معاملہ ہو اور اس کے متعلق عارف نہیں جانتا کہ اس کے بارے میں اللہ کا کیا حکم ہے چنانچہ وہ اس میں متروک ہوتا ہے اور کچھ دیر تک وہ اس تردد کی حالت میں رہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ مقام حق کی طرف کھنچ جاتا ہے، اور وہ اللہ کا موجب ہوتا ہے اس حالت میں اس کے سامنے ہر ایک چیز متجلی ہو جاتی ہے، اور وہ امور حق کے متعلق پہلے اسے شبہ تھا، وہ ان پر اور نیز اپنے شکوک پر دوسری بار نظر ڈالتا ہے تو ان کے متعلق اللہ کا جو ارادہ اور فیصلہ ہوتا ہے وہ منکشف ہو جاتا ہے اور اس حالت میں وہ گویا اللہ کے ارادے اور فیصلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اب اگر وہ عارف "مکمل" ہوتا ہے تو اس حالت میں اس سے کلام کی جاتی ہے اور اگر وہ "مفہم" اور "لقن" ہو تو اس کو انہام و تفہیم اور تلقین کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ارادے اور فیصلے کی اطلاع ہوتی ہے۔ صفحہ ۲۱۳

شاہ صاحب نے اپنے اس بیان کی وضاحت کے لئے سورہ انفال کے نزول کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ”اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے تمہارے لئے ”سورہ انفال“ میں ایک بصیرت ہے“ صفحہ ۲۱۲

ایک اور مقام پر شاہ صاحب نے وحی کی مزید تشریح فرمائی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں، لوگوں میں کتابوں کو لکھنے اور رسالوں کو جمع کرنے کا رواج خوب پھیل گیا تھا تو ان حالات میں جب اللہ کی تدلی حرکت میں آئی تو لامحالہ اس وقت لوگوں کے ہاں جو دستورین چکا تھا، اسی کے مطابق اس تدلی نے بھی صورت اختیار کی۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس امر کا مقتضی ہوا کہ رسول ایسی تجلیات سے بہرہ یاب ہو جو اسے عالم بشریت سے اجاک کر حظیرہ القدس میں پہنچا دیں، اور اس طرح ملأ اعلیٰ کے علوم، ملأ اعلیٰ کی طرف سے، انسانوں کو ان کے ناپاک شہوات کے جویات، رحمت الہی کے ارادے اور وہ الہامات خیر جو لوگوں کے دلوں میں ہیں یہ سب رسول کے ادراک میں تلاوت کی جانے والی وحی کی شکل میں قرار پذیر ہو جائیں۔ الغرض یہ ہے شان نزول الہامی کتابوں کے وجود میں آنے کی صفحہ ۸۶

وحی جو رسول کے ادراک میں تلاوت کی جانے والی آیات کی شکل میں قرار پذیر ہوتی ہے، محض معانی کا نام ہے یا معانی کے ساتھ الفاظ بھی شامل ہوتے ہیں اس کے متعلق شاہ صاحب کی رائے یہ ہے۔

”یہ وحی یعنی ”وحی متلو“ ان الفاظ، کلمات اور سالیب میں جو خود صاحب وحی کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، صورت پذیر ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں وحی کی اور سریانیوں کے لئے سریانی میں“ صفحہ ۸۹

اس ثبوت میں شاہ صاحب نے روایات کی مثال دی ہے چنانچہ

فرماتے ہیں۔

”خواب دیکھنے والے کے ذہن میں جو صورتیں اور خیالات پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، وہ انہیں کے لباس میں خوابوں کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر جب رزق اندھا خواب دیکھتا ہے تو اس کو خواب میں رنگ اور شکلیں دکھائی نہیں دیتیں..... اور جو پیدائشی بہرہ ہے، وہ خواب میں کبھی آواز نہیں سنتا“ صفحہ ۸۹

اس مثال کے بعد شاہ صاحب اس معاملہ کی مزید صراحت فرماتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

”اگر اس معاملہ کی مزید تحقیق چاہتے ہو تو سنو! عالم غیب سے جب کوئی فیضان ہوتا ہے، خواہ یہ فیضان روزمرہ کا عام فیضان ہو یا یہ فیضان اعجاز اور خارق عادت کی نوعیت کا ہو، بہر حال یہ فیضان محل فیضان کی جو ضروری خصوصیات ہوتی ہیں، انہیں کے لباس میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ اور محل فیضان کی یہی خصوصیات ایک فیضان کو دوسرے فیضان سے جدا کرتی ہیں۔..... خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ہر فیضان غیبی کی جو بھی اپنی مخصوص صورت اور وضع ہوتی ہے، اگر اس مخصوص صورت اور وضع کا سبب دھوڑنا چاہو تو وہ نہیں اس محل کی خصوصیات میں ملے گا جہاں کہ یہ فیضان واقع ہو“ صفحہ ۹۰

شعائر دین

دین کا اصل اساس تو بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لانا ہے، لیکن جب تک ایمان کے ساتھ ساتھ شعائر نہ ہوں، دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ دین اسلام کے اہم شعائر، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں۔ نماز کی کیا حقیقت ہے؟ اس کی وضاحت شاہ صاحب نے ”الانوار فی شرح تائید“

نماز

”انسان کے اندر اخلاق و اطوار کی جو نفسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، ان میں سے ہر نفسی کیفیت کا خارج میں کوئی نہ کوئی عملی مظہر ہونا ضروری ہے، اور یہی عملی مظہر اس عالم محسوس میں اس نفسی کیفیت کا ادنیٰ قائم مقام بن جاتا ہے۔ چنانچہ انسان کے یہ عملی مظاہر ہی ذریعہ بن جاتے ہیں نفس میں اخلاق کی باطنی کیفیات کی تربیت کا چنانچہ اگر تعریف ہوتی ہے تو ان عملی مظاہر کی اور مذمت کی جاتی ہے تو ان کی اور ذکر ہوتا ہے ان عملی مظاہر کا، اگرچہ اصل مقصود یہ عملی مظاہر نہیں ہوتے بلکہ نفس کی وہ کیفیات باطنی ہوتی ہیں جن کا یہ اعمال خارج میں مظہر بنتے ہیں، الغرض نفس کے ان باطنی اخلاق کی بجائے خارج میں جو ان کے قائم مقام ظاہری اعمال ہوتے ہیں، ان کا ذکر کرنا انسانوں کی طبیعت میں داخل ہو گیا ہے“ صفحہ ۳۳

اب سوال یہ ہے کہ نماز کے ارکان مثلاً دعائیں قیام، رکوع، تشهد اور سجود نفس کی کس باطنی کیفیت کے عملی مظہر ہیں۔ ظاہر ہے جیسا کہ ابھی بیان ہوا، نماز کے یہ عملی مظاہر مقصود بالذات نہیں، بلکہ ان کا اصلی مقصد نفس میں کسی خاص کیفیت کو پیدا کرنا اور اس کو تربیت دینا ہے۔ شاہ صاحب ان اعمال نماز کو نفس کی صفت احسان کا مظہر بتاتے ہیں، اس صفت کی کیا خصوصیات ہیں، اس ضمن میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ

”اس خلق اس باطنی کیفیت اور اس روحانی رنگ سے میری مراد احسان کی صفت یعنی خدا تعالیٰ کی جناب میں خشوع و خضوع اور طبیعت کا نفس کے تاریک اور فاسد اثرات سے پاک ہونا ہے۔ اس ”خلق احسان“ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان میں اس وقت بھی موجود رہتا ہے جب کہ اس کا نفس حیوانیت و امتزاج

رکھتا ہو۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے تمام اخلاق میں سے اس کے اس خلق احسان کو منتخب فرمایا، اس کے بعد وہ اقوال اور افعال انتخاب کئے جو اس خلق کی ترجمانی کر سکتے اور اس کے قائم مقام ہو سکتے ہیں۔۔۔۔۔ اس طرح گویا نماز کے یہ اقوال اور افعال بعینہ خلق احسان بن گئے۔ صفحہ ۸۵

خانہ کعبہ

خانہ کعبہ کاجج بھی اسلام کا ایک اہم شعار ہے، اس کی ضرورت کیوں پیش آئی اور ایک گھر کو خدا کے ساتھ کس لئے مخصوص کرنا پڑا، شاہ صاحب نے اس کی بھی وضاحت فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں۔

”حضرت ابراہیم سے پہلے لوگ عبادت گاہیں اور کینے بناتے تھے، انہوں نے اس زمانہ میں جب کہ آفتاب کی روحانیت کا غلبہ تھا، آفتاب کے نام پر عبادت گاہیں بنائیں، اور اسی طرح اور اسی خیال کے ماتحت مانتا ہاں اور دوسرے ستاروں کے نام سے معابد بنائے۔۔۔۔۔ اور وہ اس بات کو ایک امر حال سمجھنے لگے کہ کسی مجروحہ کی طرف جب تک کہ اس کے لئے کوئی خاص جہت اور موقع و محل معین نہ کر دیا جائے، توجہ بہ کی جاسکتی ہے، اس زمانے میں حضرت ابراہیم مبعوث ہوتے ہیں اور ان کے زمانے کا جو دستور تھا، اس کے مطابق ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معبد بنانے کا افسار ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے ایک مخصوص جگہ جو انہوں نے اس معبد کے لئے مناسب سمجھی، اس کا انتخاب کیا۔۔۔۔۔ اور اس سلسلہ میں قاعدے اور دستور مقرر ہوئے۔۔۔۔۔“

ان شمس اتر دینی کو بجالانے کی بھی مختلف شکلیں ہیں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں، ایک گروہ شعار اشر کے حقوق ادا کرنے میں صرف اپنی نیت کا

پھل پاتا ہے اور وہ اس طرح کہ یہ گروہ سمجھتا ہے کہ یہ شعارِ اشرقائے کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ اور وہ اس کا حکم سمجھ کر ان شعار کو بجا لاتا ہے۔ اور سرگروہ اُن لوگوں کا ہے جن کی روح کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ اپنے روحانی حاسہ سے شعارِ اشر کا نور محسوس کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے ان کی بہمی قوتوں پر ملکی قوتیں غالب آ جاتی ہیں، اور تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جو شعارِ اشر کے نور میں بالکل ڈوب کر اشرقائے کی اس تبدیلی کو جو ان شعار کی اصل ہے، پا لیتے ہیں۔ ... صفحہ ۴۷۔ یعنی ان شعار کو بجا لانے سے بعض لوگ تو قرب الہی کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں، اور بعض ان کے ذریعہ اپنی بہمی قوتوں پر قابو پاتے ہیں۔ اور ان کے اندر جو ملکی قوتیں ہوتی ہیں، وہ انھیں محسوس ہونے لگتی ہیں، اور بعض جو محض اشر کا حکم سمجھ کر ان پر عمل کرتے ہیں اس سے اُن کے اندر ایک نظم اور ضبط پیدا ہوتا ہے۔

آخرت کی زندگی

قرآن مجید میں آیا ہے کہ قیامت کے بعد جو لوگ دوزخ میں جائیں گے، اُن کے چہرے سیاہ ہوں گے اور ان کو تارکوں کے کپڑے پہننے کو ملیں گے۔ اور بہشت والے ریشم و حریر میں ملیں ہوں گے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جو دوزخ میں گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں کفر کیا، اور اس کفر کا رنگ ان کے چہروں پر چڑھ گیا۔ اور اس کی وجہ سے وہ اشرقائے کی نعمت کے مستوجب ہوئے۔ چنانچہ ان کا دنیا میں کفر کرنا دوزخ میں تارکوں کے کپڑوں اور چہروں کی سیاسی میں بدل جائے گا۔ اسی طرح جو بہشت میں جائیں گے یہ وہ لوگ ہیں، جو دنیا میں ایمان لائے، اور ان کے ایمان کا

رنگ ان کے نفوس پر چڑھ گیا۔ چنانچہ مرنے کے بعد ان کے ایمان کا یہی رنگ جنت میں ریشم کے کپڑوں اور چہروں کی بشارت میں بدل جائے گا، اور یہ اس لئے کہ شاہ صاحب کے نزدیک اس دنیا کی کیفیات جن کو ہماری جسمانی آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہیں، دوسری دنیا میں مادی شکلوں میں بدل جائیں گی۔۔۔۔۔ صفحہ ۳۸

اسی آخرت کی زندگی کے بارے میں ایک اور جگہ شاہ صاحب لکھتے ہیں :-

”جب قیامت کا دن آئے گا اور بدن کے یہ حجابات چھٹ جائیں گے تو اس دن روح کی آنکھ بذات خود مستقل حیثیت اختیار کرے گی۔ اور جسم کی آنکھ وہاں روح کی آنکھ کے تابع ہوگی۔ بات یہ ہے کہ آخرت میں زندگی کی جو بھی شکل ہوگی، وہ اس دنیا ہی کی زندگی کا حاصل نتیجہ ہوگی۔“ صفحہ ۱۵۵

ادیان و مل کا اختلاف

شاہ صاحب کے نزدیک ادیان و مل کا اختلاف فطری ہے، اور وہ اس لئے کہ دین و ملت کا خارجی حالات و اسباب کے مطابق ہونا ضروری ہوتا ہے اور چونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ خارجی حالات و اسباب بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے ادیان و مل بھی کبھی ایک حالت پر نہیں رہ سکتے، لیکن اس اختلاف کے باوجود ان میں اساسی ہم آہنگی اور وحدت پائی جاتی ہے، شاہ صاحب اس وحدت کے قائل ہیں، اور اس کی طرف وہ مکاشفے کی زبان میں بار بار اشارے کرتے ہیں مثلاً جو تھے مشاہدہ میں فرماتے ہیں، اشر تعالیٰ نے مجھے اپنی عظیم اشران اور جلال تقد تدلی کی حقیقت سے مطلع فرمایا، جو تمام بنی نوع بشر کی طرف متوجہ ہے۔ اس تدلی سے اشر تعالیٰ کو منظور یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے تک پہنچنے کی راہ کو لوگوں کے لئے آسان بنائے، اس تدلی کا عالم مثال میں ایک مثالی پیکر ہے

اور وہاں سے یہ عالم اجساد میں کبھی انبیاء کی صورت میں بالعموم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں بالخصوص اور کبھی نماز کی صورت میں اور کبھی حج کی شکل میں ظور پذیر ہوتی ہے، میں نے اس تدلی کو جو اپنی ذات میں ایک ہی دیکھا اور یہ پایا کہ جیسے جیسے خارجی حالات و اسباب ہوتے ہیں، ایسی مناسبت سے وہ طرح طرح کے مظاہر میں صورت پذیر ہوتی ہے۔

اس معاملے میں شاہ صاحب کو فکر کی جو وسعت اور ذہن کی جولا محدود حاصل تھی، اس کی ایک مکاشفہ میں انہوں نے بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں

..... اس کے بعد میرے لئے اللہ تعالیٰ کی تدلی اعظم ظاہر ہوئی [تدلی اعظم سے یہاں مراد ہدایت کا وہ ابدی سلسلہ ہے جو آفرینش سے اب تک برابر چلا کر رہا ہے۔ مترجم] تو میں نے اُسے بے کنار اور غیر متناہی پایا، اور اس وقت میں نے اپنے نفس کو بھی غیر متناہی پایا، اور میں نے دیکھا کہ میں ایک غیر متناہی ہوں جو دوسرے غیر متناہی کے مقابل ہے اور میں اس غیر متناہی کو نکل گیا ہوں۔ صفحہ ۱۵۶

مذہب فقہ کا اختلاف

شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اقامہ ہوا تھا کہ وہ فروعیات میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں، چونکہ ہندوستانی مسلمان عرصہ دراز سے حنفی مسلک پر تھے اس لئے شاہ صاحب نے بھی اپنے اوپر حنفی مذہب کی پابندی واجب کر لی لیکن ادیان و مل کی طرح وہ مختلف مذاہب فقہ میں بھی اساسی وحدت کے قائل تھے چنانچہ وہ اپنے ایک مکاشفہ کا ذکر فرماتے ہیں جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی بارگاہ سے استفادہ کیا۔ اس ضمن میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

”میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ آپ مذاہب فقہ میں سے کس خاص مذہب کی طرف رجحان رکھتے ہیں تاکہ میں فقہ کے اس مذہب کی اطاعت کروں، میں نے دیکھا کہ آپ کے نزدیک فقہ کے یہ سارے کے سارے مذاہب یکساں ہیں۔۔۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کی روح کے جوہر میں ان تمام فقہی فروعیات کا جو بنیادی علم ہے، وہ موجود ہے اور اس بنیادی علم سے مراد یہ ہے کہ نفوس انسانی کے متعلق اللہ تعالیٰ کی اس عنایت اور اہتمام کو جان لیا جائے، جس کے پیش نظر انسانوں کے اخلاق و اعمال کی اصلاح ہے۔ الغرض فقہ کے تمام قوانین کی اصل بنیاد تو یہ عنایت الہی ہے۔ اس کے بعد جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے، اسی کے مطابق اس اصل سے نئی نئی شاخیں اور الگ الگ صورتیں بنتی چلی جاتی ہیں، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کی اصل جوہر میں فقہ کا یہ بنیادی علم موجود ہے، اس لئے ضروری ہے کہ آپ کے نزدیک فقہ کے سارے مذاہب برابر ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ فقہ کے مذاہب گو ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن جہاں تک فقہ کے ضمن میں دین اسلام کے ضروری اصول و مبادی کا تعلق ہے، مذاہب فقہ میں ہر مذہب میں وہ موجود ہیں، مزید برآں اگر کوئی شخص فقہ کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کا بھی تابع نہ ہو تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتا کہ آپ اس شخص سے ناراض ہوں یا اس سلسلہ میں اگر کوئی ایسی بات ہو جس پر امت میں اختلاف ہو تو ظاہر ہو اس سے بڑھ کر آپ کی ناراضگی کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہو۔۔۔ مذاہب فقہ کی طرح تصوف کے تمام طریقوں کو بھی میں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک یکساں پایا۔ صفحہ ۱۲۲

حنفی فقہ

حنفی فقہ پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی بعض مسائل مشہور احادیث

کے خلاف ہیں۔ چنانچہ علمائے حدیث اور حنفی فقہاء میں صدیوں سے یہی نزاع چلا آتا ہے۔ شاہ صاحب گواہ اپنے اہل وطن کے خیال سے حنفی مسلک رکھتے تھے، لیکن وہ حدیث کی اہمیت کو بھی مانتے تھے، اس لئے وہ جانتے تھے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ حنفی مذہب و احادیث میں اختلاف نہ رہے۔ اس سلسلہ میں آپ کو ایک مکاشفہ ہوا جس میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے حنفی مذہب کے ایک بڑے اچھے طریقے سے آپ کو آگاہ فرمایا۔ اور حنفی مذہب کا یہ طریقہ ان مشہور احادیث میں جو امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں جمع کی گئیں، اور ان کی اس زمانہ میں جاپح پڑتا ہی ہوئی، موافق ترین ہے۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے اقوال میں سے وہ قول لیا جائے جو مسئلہ زیر بحث میں مشہور احادیث سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ اور پھر ان فقہائے احناف کے فتاویٰ کی پیروی کی جائے جو علمائے حدیث میں شمار ہوتے ہیں، بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے دونوں ساتھی جہاں تک کہ ان چیزوں کے اصول کا تعلق تھا، وہ اس معاملے میں خاموش رہے، اور انہوں نے ان کے بارے میں ممانعت کا کوئی حکم نہیں دیا، لیکن میں ایسی احادیث ملتی ہیں جن میں ان چیزوں کا ذکر ہے۔ اس حالت میں ان چیزوں کا اثبات لازمی اور ضروری ہو اعمال اور احکام میں اس دوش کو اختیار کرنا بھی مذہب حنفی میں داخل ہے۔ صفحہ ۱۰۵

سنت اور فقہ حنفی میں کس طرح تطبیق دی جائے۔ شاہ صاحب نے اس کا ذکر اکتیسویں مشاہدے میں بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ "اس معاملہ میں نہ تو دور از قیاس تاویل سے کام لیا جائے اور نہ یہ ہو کہ ایک حدیث کو دوسری حدیث سے بھڑایا جائے، اور نہ امت کے کسی فرد کے قول کے خیال سے بنی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کو ترک کیا جائے۔"

سنت اور فقہ حنفی میں یا ہم مطابقت دینے کا یہ طریقہ ایسا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس طریقے کو مکمل کر دے تو یہ دین کے حق میں کبریتِ احرار اور کسیرِ اعظم ثابت ہو۔
شاہ صاحب کے نزدیک کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں کسی مذہب فقہی کو ماننے والے ہی ملت کی حفاظت کرنے والے ہوں یا مثلاً ایک ملک میں ایک فقہی مذہب کے تمام پیرو ہیں، اور ان کا یہی فقہی شعار خاص و عام میں حق و باطل کے لئے وجہ امتیاز بن گیا ہے، اس طرح تدبیر الہی اسی فقہی مذہب میں محدود ہو جاتی ہے اور یہی مذہب فقہی مذہب حق بن جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:-

میں نے دیکھا کہ کسی فقہی مذہب کے حق ہونے کا جو دقیق پہلو ہے، اس کے لحاظ سے آج اس زمانے میں حنفی مذہب کو باقی سب مذاہب فقہ پر ترجیح حاصل ہے۔ ”صفحہ ۳۳۵، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر حنفی فقہ کی پابندی لازم کر لی تھی۔“

علماء اور صوفیاء کا اختلاف

علماء شریعت پر زور دیتے ہیں اور صوفیاء طریقت پر۔ ایک کے پیش نظر زیادہ تر ظاہری اعمال دین رہتے ہیں، اور صوفیاء کا گروہ باطن پر سارا زور دیتا ہے، علم اور عرفان کی یہ کشمکش بہت پرانی ہے۔ شاہ صاحب چونکہ عالم بھی تھے اور صوفی بھی، اس لئے قدرتی بات تھی کہ وہ شریعت اور طریقت میں مصالحت کرنے کی کوشش کرتے چنانچہ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں

”قرب الہی کے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں آئے تو قرب الہی کا یہ طریقہ بھی بندوں کی طرف منتقل ہو گیا۔“

قرب الہی کے اس طریقے میں واسطوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اس کے پیش نظر طاعات و عبادات کے ذریعہ اعضا و جوارح کی اور ذکر و تزکیہ اور اللہ اور اس کے بنی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کے ذریعہ تو اپنے نفس کی تہذیب و اصلاح ہوتی ہے چنانچہ عام لوگوں کی تہذیب و اصلاح کے لئے علوم کی نشر و اشاعت، نیک کاموں کا حکم دینا، برائیوں سے روکنا..... یہ سب کے سب قرب الہی کے اس طریقے میں داخل ہیں۔

”قرب الہی کا دوسرا طریقہ اللہ اور بندے کے براہ راست اتصال کا ہے..... جو شخص اس طریقہ پر چلتا ہے، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے ”انا“ کو بیدار کرتا ہے۔ اور اپنے ”انا“ ہی کی بیداری کے ضمن میں اس کو ذات حق کا تئید اور شعور حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اسی سلسلہ کے یہ فنا و بقا اور جذب اور توحید وغیرہ مقامات ہیں“ صفحہ ۱۸۰

شاہ صاحب کی رائے میں قرب الہی کا دوسرا طریقہ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عالی منزلت تھا، اور نہ آپ کو یہ مرغوب ہی تھا۔ اور آپ کی ذات اقدس تو قرب الہی کے پہلے طریقے کا عنوان ہی۔ اور آپ ہی کے ذریعہ یہ طریقہ عام طور پر پھیلا۔

تصوف

تصوف کیا ہے؟ تصوف کی تعریف میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے مختصراً اس کی تعریف یہ کی ہے۔ قرب الہی کا وہ طریقہ جس کے ذریعہ اللہ اور بندے کے درمیان براہ راست اتصال پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اذکار و اشغال سے انسان کے اندر جو ”انا“ ہے اس کی حقیقت کو بیدار کیا جاتا

ہے اور انا کی حقیقت کی اس بیداری ہی کے ضمن میں انسان کو ذات حق کا تنہا اور شعور حاصل ہوتا ہے۔ صفحہ ۸۰

تصوف کا حاصل "فنا و بقا"۔ "جذب" اور "توحید" وغیرہ مقامات ہیں۔ شاہ صاحب نے ان کمالات کے مقابلے میں جو شخصی اور انفرادی ہیں، اجتماعی خوبیوں کو جن کو وہ امور نبوت سے موسوم کرتے ہیں، بلند تر مانا ہے۔ صفحہ ۸۲

ہر انسان میں یہ استعداد رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے انا کو بیدار کر کے خدا تعالیٰ سے اتصال پیدا کر لے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ انسان کی اس استعداد پر پڑے پڑھتے ہیں اور اُن کو ہٹانے کی ضرورت ہوتی ہے، بات یہ ہے کہ انسان کے نفس کی خاصیت کچھ ایسی ہے کہ اس پر ہر طبیعت کا اثر پڑتا ہے، چنانچہ نفس انسانی ان طبائع سے جس قدر متاثر ہوتا ہے، اسی قدر اس کی فطری جلا میں کمی آ جاتی ہے۔ اور اس کے اندر "انا" کا جو نقطہ تدریجی موجود ہوتا ہے، وہ چھپ جاتا ہے۔ لیکن جب یہ پڑے پڑھ جاتے ہیں تو اب اس حقیقت الحقائق کی طرف توجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ صفحہ ۸۲

راہِ طریقت کے جو کمال ہیں، ان کو بالفعل ذات حق کا وصال ہوتا ہے اور یہ اس طرح کہ سالک جب اس حقیقت تک پہنچتا ہے، جس کو "انا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور نیز جب وہ اس حقیقت "انا" کو اس کے نیچے جو مراتب ہیں، ان سے منزہ اور مجرور کر لیتا ہے، تو اس حالت میں سالک کا اصل وجود مطلق کی طرف التفات ہوتا ہے، اس وجود مطلق کے کئی تنزلات اور ہیبت سے لباس ہیں۔ سالک وجود مطلق کی طرف التفات کے ضمن میں ہر منزل اور لباس کو جان جاتا ہے۔ اس سے وہ اور آگے بڑھتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس حقیقت کا جس کے بعد کوئی اور حقیقت نہیں۔ خود اس حقیقت کے ذریعہ ادراک کرتا ہے اور یہ ہے عارف کا ذات حق سے وصال۔ اس مقام میں اگر اس کو علم ہوتا ہے تو اسی حقیقت "انا" کا اور وہ ادراک کرتا ہے تو

اسی "انا" کی حقیقت کو صفحہ ۳۲۶

اولیاء اللہ سے جو کرامات ظاہر ہوتی ہیں، وہ نتیجہ ہوتی ہیں، ان کی اس قوت کا جو نفس نامطعم میں ہوتی ہے صفحہ ۲۸۹۔ اس سلسلہ میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک نفس میں یہ قوت موجود تھی، لیکن وہ اس کی دوسری قوتوں کے اس طرح تابع ہے کہ وہ ان میں فنا ہو گئی، اس حالت میں اس نفس کی یہ قوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ اب جب دوسرا کوئی نفس اس نفس پر اپنا اثر ڈالتا ہے تو اس میں وہ قوت ابھر آتی ہے اور ایسے موقع پر کہا جاتا ہے کہ فلاں نفس نے اس نفس پر اپنی تاثیر ڈالی۔ اور اس میں یہ کیفیت پیدا کی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ متاثر ہوئی والا نفس موثر کرنے والے نفس سے جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے، وہ اس کے اندر کہیں باہر سے نہیں آتا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ متاثر ہونے والا نفس اپنی عنان توجہ کو خود اپنی باطنی استعداد یا اس قوت کی طرف جو پہلے سے اس میں موجود ہوتی ہے، اس طرح پھیر دیتا ہے کہ اس استعداد یا قوت کے مقابلے میں اس نفس کے اندر جو دوسری قوتیں اس قوت کو دبا کر ہوئے ہوتی ہیں، موثر کرنے والے نفس کی تاثیر سے بے اثر ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح اس کی وہ استعداد یا قوت ابھر آتی ہے۔ صفحہ ۶۸

جماعت اولیاء میں سے ایک بڑی تعداد ایسے اولیاء کی بھی ہوتی ہے جن کو الہام کے ذریعہ یہ انکار کیا جاتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو شرعی قیود اٹھا دی ہیں، اور انھیں اختیار ہے کہ چاہیں تو عبادت کریں، اور چاہیں تو نہ کریں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے والد اور میرے چچا کو اور خود مجھے بھی اس طرح کا الہام ہوا، اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بیشک یہ الہام برحق تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی عاقل و بالغ سے شرع کی قیود نہیں اٹھ سکتیں۔ اس تضاد کو شاہ صاحب اس طرح دفع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں اس حالت

میں دراصل شرعی قیود کو کہیں باہر سے اپنے اوپر عائد کیا ہوا نہیں جانا جاتا بلکہ کمال ان کو اس طرح محسوس کرتا ہے، جیسے کوئی شخص بھوک اور پیاس کو محسوس کرے اور اس صورت میں ان طاعات و عبادات کو ترک کرنے کی اس میں استطاعت نہیں رہتی، چنانچہ اس شخص کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ طاعات و عبادات اس پر شریعت کی طرف سے عائد کی گئی ہیں یا نہیں۔ صفحہ ۱۰۵۔ اسی حقیقت کی توضیح ایک اور مقام پر وہ اس طرح کرتے ہیں ”فرد“ کے حق میں جو ان کمالات کا حامل ہوتا ہے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا، اپنے رب کی عبادت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ اپنی طبیعت کے کسی فطری تقاضے کو بجالا رہا ہو۔ صفحہ ۱۱۶، اقبال نے ”سانی نامہ“ میں شاید اسی حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ چنانچہ انسان کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

برٹھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر طلسم زماں و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیر و جود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا تری شوخی فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردش و زگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہوا شکار

اور اس کا نتیجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ تم ادھر سے عائد کئے ہوئے نیکی و بدی کے معیاروں کے پابند نہیں رہو گے۔ بلکہ ”تم خود“ فاتح عالم خوب و زشت ہو گے تو بھے فاتح عالم خوب و زشت تجھے کیا بتاؤں، تیری سر نوشت
یہ ہے کمال انسانی خودی کے ارتقار کا۔ اور اسی کمال کے حامل کو شاہ صاحب ”فرد“ کہتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی تفصیل کا مسئلہ

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال پیش کیا: "حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضرت علیؓ سے کس اعتبار سے افضل ہیں۔ باوجود اس کے کہ حضرت علیؓ اس امت کے پہلے صوفی، پہلے مجذوب اور پہلے عارف ہیں؟"

آپ کو بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک فضیلت کلی کا مدار امور نبوت پر ہے جیسے کہ عسلم کی اشاعت، لوگوں کو دین کا مطیع و فرمانبردار بنانا اور اس طرح کے اور امور جو نبوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ فضیلت جس کا مرجع ولایت یعنی "جذب اور فنا" ہے، یہ تو ایک جزئی فضیلت ہے، اور ایک اعتبار سے کم درجے کی..... وہ عنایت الہی جس کا مرکز و موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی، وہ بعینہ ان دونوں بزرگوں کے وجود گرامی میں صورت پذیر ہوئی..... اور گو حضرت علیؓ نسب کے اعتبار سے اور نیز اپنی جبلت اور محبوب فطرت کے لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے زیادہ آپ سے قریب تھے۔ اور "جذب" میں بھی قوی تر اور "معرفت" میں بھی بالاتر تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ منصب نبوت کے کمال کے پیش نظر حضرت علیؓ سے زیادہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرف مائل تھے..... صفحہ ۸۳

سیاست و تنظیم ملت

ایک مکاشفہ میں (صفحہ ۲۹۷) شاہ صاحب کو بتایا گیا کہ ہندوستان میں کفار کا غلبہ ہو رہا ہے، اور انہوں نے مسلمانوں کے مال و متاع لوٹ لئے

اور ان کی اولاد کو اپنا غلام بنالیا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نظام خیر کو قائم کرنے کا مجھے اپنا ذریعہ کار بنایا ہے۔ چنانچہ میں نے اسلام کے شعار کو تباہ اور کفر کے رسوم کو سر بلند پایا تو میں غصے سے بھر گیا۔ ساتھیوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس وقت اللہ کا کیا حکم ہے؟ میں نے ان سے کہا کہ ہر نظام کو توڑنا۔

ایک اور مکاشفہ میں (صفحہ ۲۱۹) شاہ صاحب کو بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ امت مرحومہ کے منتشر اجزا کو جمع کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے انھیں چاہیے کہ وہ فروعیات میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں۔ اور امت کی تنظیم کے لئے انبیاء کا طریقہ اختیار کریں۔ اور ان کے بارہائے گمراہ کو اٹھائیں اور ان کی خلافت کے لئے کوشاں ہوں۔

یہ انبیاء کی خلافت کیا ہے؟ ایک تو خلافت ظاہری ہوتی ہے جسے سیاسی اقتدار یا سلطنت کہہ لیجئے اور دوسری خلافت باطنی ہے جس سے مقصود تعلیم و تربیت کے ذریعہ قوم کی تنظیم ہے۔ شاہ صاحب کو ایک مکاشفہ میں (صفحہ ۲۳۷) دکھایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہر دو قسم کی خلافتوں کے لئے اسوہ حسنہ ہے۔ چنانچہ آپ کی بگی زندگی خلافت باطنی کا نمونہ ہے اور مدنی زندگی خلافت ظاہری کا، پہلے آپ نے مسلمانوں کو وعظ و ارشاد اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ تیار کیا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر مسلمان مدینہ میں سیاسی اقتدار کے مالک ہو گئے۔ شاہ صاحب کو بھی اسی طریقے پر کام کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ انبیاء کی خلافت کے لئے ان کے کوشاں ہونے کا یہی مطلب ہے۔

شاہ صاحب کے سیر و دین اسلام کی تحسین و ترمیم اور امت اسلامیہ کی تنظیم کی گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مکاشفہ میں دیکھا کہ وہ اس امت کے قطب مجدد

اور وحی ہیں۔ آپ کو علم نبوت کا حامل بنایا گیا ہے، اور انسانی نفوس کے حالات و کوائف کے مطابق شرعی احکام و قواعد کے معارف کو استنباط کرنے اور جو الہی کے جو مختلف مدارج ہیں، ان کے علوم سے آپ کو بہرہ ور کیا گیا ہے۔^{صفحہ ۱۶۹}
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت شاہ صاحب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی اس عنایت کا جو تمام نوع بشر کے لئے ہدایت عامہ کی مراد فہمی جسم انسانی میں مشخص ہونا ہے، اور یہی مطلب ہے "تدلی اعظم کے مثالی منظر کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مثالی کے ساتھ عالم مثالی میں قائم تھا، عالم ناسوت میں آنے کا اس تدلی اعظم کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک مکاشفہ میں^{صفحہ ۱۷۰} لکھتے ہیں۔ میں تدلی اعظم کے اس مثالی منظر سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس عالم ناسوت میں نازل ہوا متصل ہو گیا، اور اس سے گھل مل گیا اس وقت میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ اس مثالی منظر کے جو دو قالب ہیں، میں ان میں سے ایک ہوں۔۔۔۔۔ تدلی اعظم کے اس مثالی منظر کا یہ دوسرا قالب جو علمی سے قریب ہوتا ہے، یعنی میں نے اللہ تعالیٰ کی اس عنایت ازلی کا جو ہدایت عامہ کی شکل میں انبیاء کی صورت میں بالعموم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک میں بالخصوص ظہور پذیر ہوئی، علمی حاصل کر لیا، اور میں علمی طور پر اس عنایت الہی کا منظر بن گیا۔ شاہ صاحب کے لئے اس عنایت ازلی کا احصاء تجدید دین کے لئے ضروری تھا، کیونکہ جب تک کسی مسئلے کا تاریخی پس منظر سامنے نہ ہو، اور اس کے تمام پہلوؤں کو نہ جان لیا جائے، اس مسئلے کا صحیح جائزہ نہیں لیا جاسکتا،

اس کے بعد ایک اور مکاشفہ میں^{صفحہ ۱۶۹} شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ وسلم کا قلم عطا کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کے جو معارف و علوم

ان پر شکست ہوئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی تدلی اعظم کے اسرار و رموز کو جو بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے بروئے کار آتی رہی ہے، جس طرح انہوں نے مشاہدہ کیا ہے، اس کو وہ لکھیں اور اس طرح وہ دین اسلام کی تحسین و ترمیم اور مسلمانوں کو عروج و اقبال کی راہ دکھائیں۔

کونیات

تخلیق عبارت ہے مختلف اجزاء کو جمع کرنے اور ان جمع شدہ اجزاء کے لئے جو صورت مناسب ہو، ان پر اس صورت کے فیضان کرنے سے تاکہ ایک چیز وجود میں آجائے تخلیق کا عمل کبھی انسان کی صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی گھوڑے کی اور کبھی کسی اور چیز کی، یہ تخلیق تو عناصر میں ہوتی، اور بعض دفعہ یہ تخلیق خیالی صورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ صفحہ ۲۷

اس سلسلہ میں اس بات کا بھی خیال رہے کہ کسی محل میں کوئی تخلیق ہو، اس میں ایسا نہیں ہوتا کہ اس محل سے خارج کی کوئی چیز اس میں داخل ہو جائے، ایسا ہونا محالات میں سے ہے، اور عقل کبھی اس کو تسلیم نہیں کر سکتی، ہاں اس ضمن میں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ سلسلہ تخلیق میں نشو و نما کا ایک محل سبب بنتا ہے نشو و نما کے دوسرے محل کا، اور ایک محل ظہور میں ایک چیز جو موجود ہوتی ہے، وہ سبب بنتی ہے، دوسرے محل میں اس چیز کے ظہور کا۔ صفحہ ۲۸

نفیات

انسان کے اندر ایک لطیفہ "نسمہ" ہے، جسے "روح ہوائی" بھی کہتے ہیں، کان، آنکھ، ناک، زبان اور ہاتھ اسی نسمے کے آلہ کار ہیں، جن کے ذریعہ وہ سنتا

دیکھتا، سونگھتا، چکھتا اور چھوٹا ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ انسانی نسمے میں یہ بھی خاصیت ہے کہ وہ بغیر کان کے سُن سکے، اور بغیر زبان کے حکیم سکے، اور بغیر ناک کے سونگھ سکے، بغیر ہاتھ کے چھو سکے اور بغیر آنکھ کے دیکھ سکے۔ یہ کیسے؟ اس کی توجیہ وہ اس طرح فرماتے ہیں۔ نسمے میں ایک اجالی حس ہوتی ہے جس کا نام حس مشترک ہے، اس کے ذریعہ انسان کے حواس خمسہ میں سے ہر حس صرف قوت خیال سے ہی پہلے چیزوں کا ادراک کر لیتی ہے۔ مثلاً حکمنے کی حس کی قوت خیال یہ ہے کہ انسان کھانے کی ایک مزے دار چیز دیکھتا ہے اور چکھنے سے پہلے محض دیکھنے ہی سے اس کے منہ میں پانی آجاتا ہے، اسی طرح ایک آدمی دوسرے آدمی کو گدگدی کرنے کے لئے اس کے قریب ہوتا ہے لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کے بدن کو ہاتھ لگائے، دوسرا آدمی محض خیال سے گدگدی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ چھونے کی حس کی قوت خیال ہے اور حس سماعت کی خیالی قوت یہ ہے کہ وہ لغات اور اشعار کو سننے کے ساتھ ہی ان کے اوزان کا پتہ لگا لیتی ہے۔ بعض نسمے جن کی حس مشترک بڑی قوی ہوتی ہے، وہ بدن کے ظاہری جوارح کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے، بلکہ وہ ان کے بغیر ہی بصارت سماعت و قوت اور لمس کی محسوس سے لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ صفحہ ۴۹

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ مجھے آپ کے فیض صحبت سے یہ علم حاصل ہوا کہ ہر وہ عارف جو معرفت حق میں کامل ہوتا ہے، وہ جو کچھ بھی اخذ کرتا ہے، صرف اپنے نفس سے کرتا ہے، اب رہے اخذ کے ذرائع و اسباب، تو ان کی صورت یہ ہے کہ پہلے سے وہ چیز اس عارف کے نفس میں موجود ہوتی ہے، اور یہ ذرائع و اسباب صرف واسطہ بنتے ہیں، اس کو اس چیز سے آگاہ کرنے کے، جو عارف اس طرح سے اخذِ علم نہیں کرتا وہ معرفتِ الہی میں کامل نہیں ہوتا۔ صفحہ ۱۹۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

تہدید

اے اللہ! میں تیری حمد و ثنا کرتا ہوں، اور اسی کے ساتھ میں اس امر کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ میں تیری حمد و ثنا میں قاصر ہوں میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔ اور میں یہ جانتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی گناہوں کا بخشنے والا نہیں۔ اور تیرے سوا کوئی سختی و نرمی میں میری مدد نہیں کرتا۔ اے اللہ! میں سرتاپا تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اور اپنے آپ کو تیرے حوالے کرتا ہوں۔ میری عبادت، میری نماز، میرا جینا اور میرا مرنا تیرے ہی لئے ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اہل شرک جن کو تیرے ساتھ شریک کرتے ہیں، تو ان سب سے بلند و برتر ہے۔

اے اللہ! میں اپنے نفس کی بُرائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور تجھ سے اچھے اخلاق اور نیک اعمال کی طرف ہدایت پانے کا بڑے عجز اور اصرار سے سوال کرتا ہوں۔ اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ سوائے تیری ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا، اور جس نے کہ زمین اور آسمان کو بنایا، نہ تو کوئی مجھے بُرائیوں سے بچا سکتا ہے، اور نہ کوئی اچھے اخلاق اور نیک اعمال کی طرف ہدایت دے سکتا ہے، اور میں اس امر کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اور تو اکیلا ہے، کوئی تیرا شریک نہیں اور نیز میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ محمد تیرے بندے اور رسول ہیں، سب رسولوں سے اور انبیاء سے افضل۔ میری دعا ہے کہ تو آپ پر، تمام رسولوں اور انبیاء پر، آپ کی آل پر اور آپ کے صحابہ پر جب تک کہ دن اور رات کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور جب تک کہ آسمان سایہ کئے ہوئے، اور زمین سب کو اٹھائے ہوئے ہے خیر و سلامتی بھیجتا رہے۔

اما بعد ————— بندہ ضعیف ولی اللہ بن عبد الرحیم (خدا ان دونوں پر لطف و مہربانی فرمائے، اور ان کو اپنی رحمت کے واسطے سے) عرض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت،

جس سے کہ اُس نے مجھے سرفراز فرمایا، یہ ہے کہ ۱۱۷۳ھ اور اس کے بعد کے سال میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے مقدس گھر کے حج کی اور اپنے نبی علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی توفیق دی۔ لیکن اس سلسلہ میں اس نعمت سے بھی کہیں زیادہ بڑی سعادت جو مجھے پیش آئی، وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس حج کو میرے لئے مشاہدات باطن اور معرفت حقائق کا ذریعہ بنایا اور اسے محض حجاب اور بے علمی کا حج نہیں رہنے دیا۔ اور اسی طرح اُس نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس زیارت کو میرے لئے بصیرت افروز بنایا، اور اُسے بے بصری اور اندھے پن کی چیز نہ رہنے دیا۔ الغرض اس حج و زیارت کے ضمن میں مجھے جو نعمت عطا کی گئی، وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہے۔ اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حج کے ان مشاہدات باطنی میں جو اسرار و رموز مجھے تلقین فرمائے ہیں، اُن کو ضبط تحریر میں لے آؤں، اور نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانیت سے اپنی زیارت کے دوران میں جو کچھ میں نے استفادہ کیا ہے، اُس کو لکھ دوں تاکہ ایک تو یہ چیز خود میرے لئے ایک یادداشت کا کام دے، اور دوسرے میرے اور بھائیوں کو اس سے بصیرت حاصل ہو سکے۔ میرا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر جو اس نعمت کا شکریہ عاید ہوتا ہے، شاید اس طرح میں اس کا کچھ حق ادا کر سکوں گا۔

میں نے اس رسالے کا نام ”فیوض البحرین“ رکھا ہے۔ قصہ
 مختصر، اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہماری کفیل ہے، اور وہی سب سے
 اچھی ہماری کار ساز بھی ہے۔ اور پھر خدائے بزرگ و برتر کے سوا
 نہ تو کسی کے پاس کوئی اقتدار ہے اور نہ کوئی قوت۔

پہلا مشاہدہ

ان مشاہدات میں سے پہلا مشاہدہ یہ ہے کہ میں نے خواب دیکھا کہ اللہ والوں کی ایک بہت بڑی جماعت ہے۔ اور ان میں ایک گروہ ذکر و اذکار کرنے والوں اور نسبتاً یادداشت کے حاملوں کا ہے۔ ان کے دلوں پر انوار جلوہ گر ہیں، اور ان کے چہروں پر تروتازگی اور حسن و جمال کے آثار نمایاں ہیں۔ اور یہ لوگ عقیدہ وحدت الوجود کے قائل نہیں۔

میں نے دیکھا کہ اللہ والوں کی اس جماعت میں ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو عقیدہ وحدت الوجود کو مانتا ہے، اور اس کائنات میں

لے "یادداشت" عبارت ہے۔ ذات واجب الوجود کی طرف خالص توجہ کرنے سے، اسی توجہ جو الفاظ اور تخیلات سے مجرّد ہو۔

(مترجم)

ذاتِ باری کے وجود کے جاری و ساری ہونے کے متعلق وہ کسی نہ کسی شکل میں غور و فکر کرنے میں مشغول بھی ہے۔ اور چونکہ اس غور و فکر کے ضمن میں اُن سے ذاتِ حق کے بارے میں جو کل عالم کے انتظام میں بالعموم اور نفوسِ انسانی کی تدبیر میں بالخصوص مصروفِ کار ہے، کچھ تفصیل پڑتی ہے، اس لئے میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ندامت ہے اور اُن کے چہرے سیاہ ہیں، اور اُن پر خاک اُڑ رہی ہے۔ میں نے ان دونوں گروہوں کو آپس میں بحث کرتے پایا۔ ذکرِ واذکارِ والے کہہ رہے تھے کہ کیا تم ان الزار اور اس حسنِ تازگی کو نہیں دیکھتے جن سے ہم بہرہ یاب ہیں۔ اور کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ہمارا طریقہ تم سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔ ان کے خلاف عقیدہ وحدت الوجود کے قائل کہہ رہے تھے کہ کیا ذاتِ حق میں کل موجودات کا سما جانا یا گم ہو جانا امر واقعہ نہیں؟ اب صورت یہ ہے کہ ہم نے اُس راز کو پالیا، جس سے تم بے خبر رہے، ظاہر ہے کہ اس معاملے میں تم پر ہمیں فضیلت حاصل ہے۔

ان دونوں گروہوں میں اس بحث نے جب ایک طویل نزاع کی شکل اختیار کر لی تو انہوں نے مجھے اپنا حکم بتایا، اور اس مسئلہ کو فیصلے کے لئے میرے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ میں نے ان کا حکم بننا منظور کیا، اور اس ضمن میں میں نے یوں گفتگو کی :-

بات یہ ہے کہ علومِ حقہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ علوم جن سے

نفوس کی تہذیب و اصلاح ہوتی ہے، اور دوسرے وہ علوم جن سے نفوس کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفوس انسانی میں الگ الگ استعدادیں ودیعت فرمائی ہیں۔ اور ان نفوس میں سے ہر ہر نفس اپنی اپنی استعداد کے مطابق علوم حقہ کا ذوق رکھتا ہے چنانچہ جب کوئی نفس علوم حقہ میں ان علوم میں جو خاص اُس کے ذوق کے مطابق ہوتے ہیں اور ان سے اُس کی طبیعت کو مناسبت ہوتی ہے، پوری طرح مستغرق ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ سے اُس نفس کی تہذیب و اصلاح ہو جاتی ہے۔ بے شک وحدت الوجود کا یہ مسئلہ جو اس وقت مابہ النزاع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علوم حقہ میں سے ہے، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ تم دونوں کے دونوں گروہ نہ تو اس کے اہل تھے، اور نہ یہ چیز تمہارے ذوق اور مشرب کے مطابق تھی۔ اس لئے تمہارا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ جس طرح ملائکہ اعلیٰ کے فرشتے بارگاہ حق میں تضرع و نیاز مندی کرتے ہیں۔ تم بھی اُن کی طرح وجود باری کی اُس حقیقت کی طرف جو سب کو جامع ہے، یکسر متوجہ ہو جاتے۔

اب رہا ذکر و اذکار والے اصحاب الوار کا معاملہ، سو بات یہ ہے کہ گو وہ مسئلہ وحدت الوجود سے تو بیخبر رہے، لیکن علوم حقہ میں سے وہ علوم جو خود اُن کے ذوق اور مشرب کے مطابق تھے، وہ انہیں حاصل تھے اور ان کی وجہ سے ہی اُن کے نفوس کی تہذیب و اصلاح ہو گئی۔ چنانچہ جس درجہ کمال تک پہنچنے کی استعداد بیکروہ پیدا ہوئے تھے، اس طرح وہ

اُس درجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ باقی رہا وحدت الوجود پر اعتقاد رکھنے والوں کا معاملہ، تو گو اس مسئلہ میں اصل حقیقت تک تو اُن کی رسائی ہو گئی۔ لیکن علوم حقہ میں سے وہ علم جن سے اُن کی طبیعت کو قدرتی مناسبت تھی، وہ انہیں نصیب نہ ہوئے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب انہوں نے اپنے خیالات کو فکر کی اس دادی میں جہاں کہ یہ سوال درپیش ہوتا ہے کہ موجودات عالم میں وجود حق کس طرح جاری و ساری ہے۔ بے عنان چھوڑا تو اُن کے ہاتھ سے ذات حق کی تعظیم، اُس سے محبت، اور موجودات سے اُس کے ماوراء اور منزہ ہونے کا سررشتہ چھوٹ گیا۔ اور دراصل یہی وہ سررشتہ ہے جس کے ذریعے ملائکہ اعلیٰ کے فرشتوں نے اپنے رب کو پہچانا، اور اُن سے افلاک کی قوتوں نے اپنی فطری استعداد کی بنا پر عرفان الہی کے اس سررشتہ کی دراشت پائی، اور پھر آگے چل کر اس عالم کی یہ ساری فضا اُن کی معرفت سے بھر گئی۔ اب جو نفوس ذات حق کی تعظیم، اُس کے ساتھ محبت، اور موجودات سے اُسے منزہ ماننے کی اس معرفت کے وارث نہ ہوئے تو اس کی وجہ سے نہ تو انکی تہذیب و اصلاح ہو سکی، اور نہ وہ اپنے مقصد حیات ہی کو پاسکے۔

الغرض اسے وحدت الوجود کو ماننے والو اور وجود حق کو موجودات عالم میں جاری و ساری جاننے والو! تم میں سے اس گروہ نے اس

سہ یونانی فلسفہ میں افلاک کو اس دنیا میں موثر مانا جاتا تھا، انہیں سے یہ خیال

مسلمانوں میں بھی پھیلا۔ (مترجم)

راز کو زبان سے نکالا جو اس کا اہل نہ تھا۔ اور وہ گروہ جس کے مشرب اور ذوق کے مطابق یہ علم تھا، وہ خاموش رہا۔ اب تم میں بعض ایسے مسخ شدہ لوگ ہیں، جو اس راز سے بائگل بے خبر ہیں۔ اور اس ضمن میں حصول کمال کے لئے عقل و خرد کی جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے، اور وہ نتیجہ ہوتی ہیں فلکی عناصر کی تاثیرات کا، وہ تم میں سرے سے غائب ہیں۔ ان حالات میں قدرتی بات تھی کہ وحدت الوجود کے اس مسئلے کی وجہ سے تمہارے دلوں میں ندامت اور تمہارے چہروں پر سیاہی ہوتی۔ حقیقت میں اس راز کا اہل تو وہ شخص ہے جس میں عقل و خرد کی یہ صلاحیتیں برومند اور تروتازہ ہوں، اور اس عالم میں مظاہر و اشکال کے جو تہ بہ تہ حجابات ہیں، انہوں نے اس کی ان صلاحیتوں کو بے اثر نہ کر دیا ہو۔

میں نے اتنا کہا تھا کہ وہ اس مسئلے کو سمجھ گئے۔ اور انہوں نے اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ پھر میں نے اُن کو بتایا کہ یہ وہ اسرار ہیں جو خاص طور پر مجھے رب کی طرف سے عطا فرمائے گئے ہیں تاکہ میں معاملے میں تمہارے ان اختلافات کو حل کر سکوں۔ باقی تعریف تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے جو سب جہانوں کا پروردگار ہے۔ میں یہ کہہ چکا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں بیدار ہو گیا۔

۱۔ قدیم حکمت میں انسانوں کی بعض خصوصیات اور استعدادات کو فلکی عناصر یعنی نجوم کو اکب کی تاثیرات کا نتیجہ مانا جاتا ہے۔ (مترجم)

دوسرا مشاہدہ

میں نے اپنی رُوح کی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کی تدلی کو دیکھا۔ اور وہ مجھے یوں نظر آئی کہ ایک شے واحد ہے کہ اپنی ذات میں باہم اتصال رکھتی ہے اور سارے عالم میں جاری و ساری ہے۔ گویا کہ یہ عالم اُس کے اوپر ایک پردہ ہے اور وہ تدلی اُس کے اندر ہے۔ اُس وقت میں سمجھا کہ یہی وہ تدلی ہے کہ جب عارف اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنی چشم رُوحانی سے اسے دیکھتا اور اس کے اندر کم ہو جاتا ہے تو عارف کی تاثیر اور اُس کی رشد و ہدایت کی قوت

۱۰ سورہٴ النجم میں ہے "ثم دنا فتدلى فكان قاب قوسين أو أدنى" نقوف کی اصطلاح

"تدلی" اسی فتدلی سے لی گئی ہے۔ کمالات الہی اس دنیا میں تجلیات الہی کے ذریعہ ظہور پذیر

ہوتے ہیں۔ یہ تجلیات جس تصرف الہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اُسے اللہ تعالیٰ کی تدلی کہتے ہیں۔ مترجم

بہت بڑھ جاتی ہے اور راہِ حق میں حق کی خاطر اس کا تصرف کرنا جائز ہوتا ہے۔

اس تبدیلی کے دو رخ ہیں۔ اس کا ایک رخ تو وجودِ خارجی کے مقابل ہوتا ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ گویا ایک رنگ ہے جو الواحِ نفوس کے اندر جما ہوا ہے اس کا نام نور ہے۔ اور اس تبدیلی کا دوسرا رخ وجودِ ذہنی کے مقابل ہے۔ اور یہ صادق آتا ہے ذاتِ حق پر، اور اس کو "اسم" یا تبدیلی کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر نقشبندیہ کے ہاں "اندر اراج النہایہ فی البدایہ" ہے۔ جو عارف اس تبدیلی کے ذریعہ ذاتِ حق سے واصل ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اختیار کے سوا اور کسی چیز کو نہیں جانتا۔ اور وہ یوں محسوس کرتا ہے گویا ایک دریائے ناپید اکٹار ہے جس میں وہ ڈوبا ہوا ہے۔

معرفتِ عظیمہ :- ذاتِ حق جب بندوں کی طرف اپنی عظیم ترین تبدیلی کرتی ہے تو اس کا مشاہدہ اگر روح کی آنکھ سے ہو تو یہ افرادِ کاملین لے سالک جب حقیقت کی تلاش میں نکلتا ہے تو وجود کے ان گوناگوں تعینات اور مختلف مظاہر کے پردوں کو چاک کرتا ہوا آخر میں وہ جس مقام پر پہنچتا ہے، وہ خود اسی کا وہ نقطہ ہوتا ہے جو اس کے اپنے وجود کا عین ہے۔ چنانچہ اس بنا پر نقشبندی بزرگوں نے فرمایا ہے کہ "آخری نقطہ تک پہنچنے کے بعد پھر پہلے نقطے کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔" یہ ہے اندراج النہایہ فی البدایہ۔ (از مستزجم)

کا مقام ہوتا ہے۔ اور اگر اس تبدلی کا ادراک صرف رُوح کے علم سے ہو تو یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں کہ عوام بھی شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس تبدلی کی بات اگر رُوح کے قانون سے سنی جائے تو یہ کالمین کا مقام ہے۔ لیکن اگر رُوح محض اپنے علم کے ذریعہ تبدلی کے کلام کو سنے تو اس چیز میں عوام بھی شریک ہو سکتے ہیں۔

تحقیق شریف :- معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح ہمارے بدن کے لئے ظاہر میں آنکھیں، کان اور زبان ہے اسی طرح ہمارے نفس باطن کی بھی باطن میں آنکھیں، کان اور زبان ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے انسان کے اندر دو لطیفے رکھے گئے ہیں۔ ایک لطیفہ "قیومیت الہیہ" کا ہے، جو بدن سے تعلق رکھتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ وہ بدن کے اندر حلول کئے ہوئے ہے۔ لیکن اس لطیفہ کو "نسمہ" یعنی روح ہوائی سے الگ چیز سمجھنا چاہیے۔ معرفتِ اشیاء کے سلسلے میں انسان کے اس لطیفے کے دور رخ ہوتے ہیں۔ اس کا ایک رخ تو یہ ہے کہ اشیاء کی تمام صورت کا جو اصل مبداء ہے وہاں سے

یہ ہر شے عبارت ہے دو اجزاء سے، ایک جسم اور دوسرا صورت، تمام اجسام کو ایک جسم کل سے صادر مانا جاتا ہے، اور اسی طرح تمام صورتوں کا بھی ایک ہی اصل سے صادر مانا گیا ہے۔ اور یہ ہے مبداءِ صورت۔ (مترجم)

اس لطیفہ پر ایک مجرد صورت کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح کسی شے کی معرفت کا نام علم ہے۔ اس ضمن میں اس لطیفہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ انسان کا یہ لطیفہ ایک شے کی طرف بڑھتا ہے اور اس سے اتصال پیدا کر لیتا ہے۔ اس لطیفہ کا کسی شے سے یہ اتصال اگر کشف بصری کے اعتبار سے ہو تو اُس کو نفس ناطقہ کے اس لطیفہ کی بصارت کہیں گے۔ اور اگر یہ اتصال کشف سماعی کے اعتبار سے ہو تو اُسے اس لطیفہ کی سماعت کہا جائے گا۔ اور اگر یہ اتصال کشف علمی یعنی کسی کو سمجھانے یا کسی سے سمجھنے کے اعتبار سے ہو تو اُسے نفس ناطقہ کے اس لطیفہ کا کلام کہا جائے گا۔

معرفتِ اشیاء کے سلسلہ میں نفس ناطقہ کے اس لطیفہ کا یہی رخ ہے جس کی بنا پر بندہ اپنے رب عزوجل کو دیکھتا ہے۔ اور اسی بنا پر اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام بھی ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ سے، ارواح سے، ملائکہ اعلیٰ کے فرشتوں سے اور جو نیک لوگ پہلے گزر چکے ہیں، اُن کی ارواح سے باتیں کرتا ہے۔ چنانچہ ایسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی روح اللہ تعالیٰ کو دیکھتی ہے، اور روح کی اس روتِ حق کا ایک رنگ شمع یعنی انسان کی روح ہوائی میں آجاتا ہے۔ اور شمع سے یہ رنگ انسان کی آنکھ میں آجاتا ہے۔ اور پھر یہ رنگ ایک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور اُس وقت آدمی کہہ اُٹھتا ہے کہ میں نے رب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے،

اس میں بے شک وہ سچا ہوتا ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا، تو بات یہ ہے کہ آپ کا رب کو دیکھنا اسی قبیل سے تھا۔ اور اسی طرح حضرت موسیٰ کا اللہ تعالیٰ سے کلام کرنا بھی اسی ضمن میں آ جاتا ہے۔

میرا خود اپنا واقعہ ہے کہ ایک دن میں نے آفتاب کی روح سے اتصال پیدا کیا۔ میں نے اسے دیکھا، اور اس کی باتیں سنیں۔

لے روح آفتاب — مولانا محمد قاسم "تقریر دل پذیر" میں لکھتے ہیں "باقی رہا عالم کے لئے روح کا ہونا ہر چند نظر سرسری میں ایک نامعقول بات معلوم ہوتی ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ وجہ اسکی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ زندگی سالس کے لینے اور اپنے ارادے سے حرکتوں کے کرنے کا نام رکھ چھوڑا ہے۔ اور اگر ہم تم یہ بات جانتے کہ زندگی اسے نہیں کہتے، بلکہ زندگی حقیقت میں اسے کہتے ہیں کہ جس سے جاننا پہچاننا سوچنا سمجھنا تعلق رکھتا ہے تو ماسوا انسان اور حیوانات کے زمین، آسمان، درخت، پہاڑ بلکہ مجموعہ عالم کے حق میں بھی روح کے ہونے کا انکار نہ کرتے..... مجھے بڑی قوی دلیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ماسوا ان اشیاء کے جن کو ہم جاندار کہتے ہیں؛ اوروں میں بھی بلکہ ہر شے میں جان ہے اور ہر ذرہ اور ہر چیز کے لئے ایک روح ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پہلے اس سے واضح ہو چکا کہ اس عالم کی ہر چیز کا چھوٹی سے لیکر بڑی تک جو ذات اور ہے یعنی دو وجود ہیں، ظاہری اور باطنی، ماباطنی و جو کو ذات خداوندی سے کچھ اس قسم کی نسبت ہے، جیسے شعاعوں کو آفتاب سے، اور وجود ظاہری کو بتزلزلہ وجود پوں کے جو شعاعوں کو پیدا ہوتی ہیں اور بحرین اور ہر میدان میں مبداء جذباتی ہیں۔" مترجم

چنانچہ میں نے اُس سے کہا کہ اے روح آفتاب! لوگ تجھ سے روشنی حاصل کرتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور ہر رنگ اور ہر طور میں تیرا غلبہ اور ظہور دیکھنے کے باوجود وہ تیرا انکار کرتے اور تیرے خلاف جھوٹ باندھتے ہیں۔ لیکن تیری حالت یہ ہے کہ نہ تو اُن سے انتقام لیتی ہے اور نہ اُن پر خفا ہوتی ہے۔ یہ سن کر روح آفتاب بولی کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان لوگوں کا غرور اور تکبر اور نیز اُن کا اپنے آپ میں پھولانہ سمانا خود میری اپنی ذاتی، مسترت کا ایک منظر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میری نظر ان لوگوں کے غرور و تکبر کی طرف نہیں جاتی، بلکہ میں تو ان لوگوں کی خوشی و شادمانی کو دیکھتی ہوں اور جانتی ہوں کہ یہ سب میری اپنی خوشی و شادمانی کا ایک پر تو ہے۔ اس بات کو جانتے ہوئے کیا یہ جائز ہے کہ کوئی خود اپنے ذاتی کمال پر بگڑے۔ یا کوئی خود اپنی ذات سے انتقام لے۔ یہ گفتگو ہو چکی تو روح آفتاب سے میرا اتصال اور بڑھا۔ چنانچہ میں نے اُسے اپنی طبیعت اور جبلت میں بڑا فیاض پایا اسی طرح میں نے اُور افلاک سے بھی اتصال پیدا کیا اور روح آفتاب کی طرح میں نے افلاک کی ارواح کو بھی اپنے علوم اور اپنی ہمتوں میں باہم متوافق اور ہم آہنگ پایا۔

ایضاح مزید :- اگر تم اس وجدانی مسئلہ کی حقیقت دریافت

کرنا چاہتے ہو تو جو کچھ میں کہتا ہوں سنو! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نفسِ ناطقہ کا علم اس سے میری مراد نورِ بسیط سے ہے، یہ ہے کہ انسان کے اندر جو "قیومیت الہیہ" کا لطیفہ ہے اور جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، وہ ایک جسم سے مخصوص و مقید ہو جائے اور "طبیعت کلی" جو خارج میں ایک فعال نقطے کی حیثیت رکھتی ہے، وہ شے معلوم کی مخصوص صورت میں ظہور پذیر ہو۔ اور ہمارے نزدیک یہ اُسی وقت ہی ہوتا ہے، جب ادراک کرنے والے اور جس چیز کا کہ ادراک کیا جاتا ہے، دونوں اتحاد ہو جائے۔

اب اس ادراک کی یا تو یہ شکل ہے کہ یہ ادراک کلی منظر کا ہو اور یہ شامل ہو اس کلی منظر کے نفس پر یا جسم پر، جیسے صورتِ السانیہ یا حیوانیہ یا زمین یا نور اور باقی عناصر یعنی خاک، آگ اور ہوا اور نیز آفتاب اور ماہتاب کی قوت کا ادراک ہے۔ یعنی ادراک کی ایک صورت یہ ہوتی کہ وہ کلی منظر کا ادراک ہو۔ اور اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ یہ ادراک کسی خاص شے کا ہو۔ اور وہ شے ادراک کر نیوالے نفس کی قسم میں سے ہو۔ جیسے زید کا نفس عمر کے نفس کا ادراک کرے۔ اور اس کی پہلی صورت میں یعنی جب کلی منظر کا ادراک کیا جاتا ہے، یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نفسِ ناطقہ میں یہ ادراک اُس کلی منظر کے مقابلہ میں ایک مجرد نقطے کی صورت

لے ہر فرد کا اس دنیا کے علاوہ دوسرے موطن میں ایک کلی وجود مانا جاتا ہے۔ یہ کلی وجود محض ایک قیاس نہیں، بلکہ خارج میں اس کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ جو طبیعت ہے، اس کا بھی ایک کلی وجود ہے، اور اسے "طبیعت کلی" کہا گیا ہے۔ مترجم

اختیار کر لیتا ہے، چنانچہ جب تک اُس کی منظر کی حقیقت نفس میں باقی رہتی ہے اُس وقت تک ادراک کا یہ نقطہ مجرد بھی باقی رہتا ہے اور جب وہ فنا ہو جاتی ہے تو یہ نقطہ بھی باقی نہیں رہتا۔ نفس ناطقہ میں جب یہ نقطہ بیدار ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی منظر کی حقیقت نفس میں موجود ہوتی ہے، اُس کے آثار و احکام بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ ذوقی اور حقیقی دونوں لحاظ سے۔ اور یہ مراد اور مطلب ہے ہمارے اس قول کا کہ ادراک کی اس صورت میں ادراک کرنے والے نفس اور جس چیز کا کہ ادراک کیا جاتا ہے دونوں متحد ہو جاتے ہیں۔

اب جب کسی ایسی شے کا ادراک کیا جائے کہ وہ ادراک کر نیالے نفس کی قسم میں سے ہو تو اُس ادراک کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ادراک کرنے والا نفس اُس نفس کے ساتھ جس کا کہ وہ ادراک کر رہا ہے۔ اُن دونوں کی جو طبیعت ٹکلی ہے اُس کی ایک بارگاہ میں جمع ہوتا ہے اور وہاں یہ صورت پیش آتی ہے کہ ایک نفس دوسرے نفس پر غالب آ جاتا ہے کہ خود اُس

لے اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے آگ ایک حقیقت ہے، جس کا کہ تصور ذہن میں ہے اب نفس ناطقہ اس آگ کا ادراک کرتا ہے۔ اور یہ ادراک ایک مجرد نقطے کی صورت میں نفس ناطقہ میں قرار پذیر ہوتا ہے۔ یہ ادراک صرف اسی طرح ہی ممکن ہے کہ خارج میں جو آگ ہے اور جس کا کہ ادراک کیا جا رہا ہے، اُس کا اور نفس ناطقہ میں جو آگ کا پہلے سے تصور ہے اُن دونوں کا اتحاد ہو جائے۔ اور یہ مطلب ہے مدبرک اور مدبرک کے اتحاد کا۔

کے اندر غالب آنے کا جزو ہوتا ہے، یا وہ دوسرے سے قوت حاصل کر لیتا ہے، یا یہ ہوتا ہے کہ دوسرے نفس کے مقابلے میں اس میں زیادہ قوتیں ہوتی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے وہ اُس پر غالب آجاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ قوتیں ختم ہونے والی نہ ہوں۔

بات دراصل یہ ہے کہ نفوس کی ایک دوسرے پر تمام تر تاثیر یا تو غلبہ و قہر سے ہوتی ہے اور یا محبت کے ذریعہ، اور ان ہر دو طریقوں میں تاثیر ڈالنے کی صورت یہ ہے کہ ایک نفس کے اندر قدرت کی طرف سے جو قوت و ولایت کی گئی ہے، اب وہ قوت خواہ دوسرے پر غالب آنے کی ہو یا دوسرے سے متاثر اور مغلوب ہونے کی، یہ نفس سب سے کنارہ کش ہو کر صرف اُسی قوت کا ہو جائے۔ چنانچہ یہ وصف افراد کاملین کا ہے۔ اور اگر ایک نفس میں صرف غالب آنے والی ہی قوت ہو تو یہ غیر کاملین کی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ نفس کی ایک اور قسم ہے۔ جس میں غلبہ و محبت کی یہ قوت تو موجود ہوتی ہے، لیکن اس کے اثرات و احکام پہلے نفس کے مقابلے میں بہت کم اور ضعیف ہوتے ہیں، اس کے معاملے میں ہوتا یہ ہے کہ تاثیر کرنے والا نفس اُس نفس کا جس پر کہ تاثیر ڈالی جا رہی ہے۔ اور اسی طرح وہ نفس جس پر کہ تاثیر ڈالی جا رہی ہے، دوسرے نفس کا جو موثر ہے اس قوت کے ذریعہ ادراک کرتا ہے۔ اور یہ دونو نفس باہم متصل ہو جاتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان دونو نفسوں کے اس طرح ایک دوسرے سے متاثر ہوئے اور باہم ملنے سے نفس کی اس قوت سے ایسے

ایسے احکام و آثار ظاہر ہوتے ہیں، جو پہلے نہیں تھے۔ اس ضمن میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نفس میں یہ قوت موجود ہے، لیکن وہ اپنی دوسری قوتوں کے اس طرح تابع ہے کہ وہ اُن میں فنا ہو گئی ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ اپنی خصوصیات اور احکام و آثار بھی کھو بیٹھی ہے۔ چنانچہ اس حالت میں اس نفس کی یہ قوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ اب جب دوسرا کوئی نفس اس نفس پر اپنا اثر ڈالتا ہے تو اس میں وہ قوت ابھر آتی ہے۔ اور ایسے موقع پر کہا جاتا ہے کہ فلاں نفس نے اس نفس پر اپنی تاثیر ڈالی۔ اور اُس میں یہ کیفیت پیدا کی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ متاثر ہونے والا نفس موثر کرنے والے نفس سے جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے، وہ اُس کے اندر کہیں باہر سے نہیں آتا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ متاثر ہونے والا نفس اپنی عنان توجہ کو خود اپنی باطنی استعداد یا اُس قوت کی طرف جو پہلے سے اس میں موجود ہوتی ہے، اس طرح پھیر دیتا ہے کہ اس استعداد یا قوت کے مقابلے میں اُس نفس کے اندر اُس کی جو دوسری قوتیں اُس قوت کو دبائے ہوئے ہوتی ہیں، موثر کرنے والے نفس کی تاثیر سے بے اثر ہو جاتی ہیں اور اس کی وہ استعداد یا قوت ابھر آتی ہے۔

الفرض ایک نفس کی تاثیر دوسرے نفس پر خواہ غلبہ کے ذریعہ ہو یا غلبے کے قبیل کی جو اور چیزیں ہیں، اُن کے ذریعے سے، یا یہ تاثیر محبت کے ذریعے ہو یا جو محبت سے متعلق اور چیزیں ہیں، اُن کے ذریعے سے،

ہر حال ان دو میں سے کسی ذریعہ سے بھی تاثیر ہو، اس تاثیر کے لئے دو نفسوں میں اتحاد کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس اتحاد کے لئے ضروری نہیں کہ دونوں نفسوں کا ہر لحاظ سے مطلقاً اتحاد ہو۔ بلکہ اس کے لئے ایک قوت یا ایک جزو کا اتحاد ہی کافی ہے۔ اور نیز اس اتحاد کے لئے ضروری نہیں کہ ان دونوں نفسوں کی طبیعت کلی کے جو مواطن ہیں، اُن سب میں ان کا اتحاد ہو، بلکہ اس کے لئے طبیعت کلی کے جملہ مواطن میں سے ایک آؤدہ موطن ہی کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے اس قول میں کہ ادراک کی اس صورت میں ادراک کرنے والے اور جس شے کا کہ ادراک کیا جا رہا ہے، دونوں کا اتحاد ہو جاتا ہے، اتحاد سے اسی قسم کا اتحاد مقصود ہے۔

اب جب یہ بات واضح ہو گئی تو تمہیں جاننا چاہئے کہ ایک نفس کی دوسرے نفس کے ساتھ تعلق کی کئی صورتیں اور حالتیں ہوتی ہیں، ان میں سے ایک اتحاد، دوسرے نفس میں گم ہو جانے، اور اس نفس کے علاوہ ہر شے کو بھول جانے کی صورت ہے۔ اور اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر نفس خود اپنے آپ کی نفی کرنے کی طرف دھیان دے، دراصل حالیکہ وہ دوسرے نفس کے ساتھ اتحاد میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس سے یہ ہوگا کہ اُن میں سے ہر ایک نفس دوسرے نفس سے الگ ہونے کے باوجود اسکے رنگ میں رنگا جائیگا اور اسکے ساتھ ساتھ اُسے یہ بھی محسوس ہوگا کہ وہ ہر لحاظ اور ہر جہت سے تو دوسرے نفس کی طرح نہیں، البتہ ایک نہ ایک لحاظ اور جہت سے وہ دوسرے نفس کا سا ضرور ہے۔ اس صورت کا نام "رؤیت" ہے۔

ایک نفس کی دوسرے نفس کے ساتھ تعلق کی تیسری صورت یہ ہے کہ ایک پر دوسرے کے جملہ احکام اس طرح غالب آجائیں کہ اُس کے اندر جو قوت ہے، وہ بے اثر ہو جائے۔ گویا کہ وہ کہیں چھپ گئی۔ اس حالت میں یہ احکام "اتحاد" اور "رویت" کی دو سابقہ صورتوں کے مقابلے میں بہت کمزور شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نفس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کچھ اثر تو وہ "طرف غالب" سے لیتا ہے، اور مکتوڑا بہت اثر نفس کی جہت مغلوب" سے آتا ہے۔ دونفسوں کے تعلق کی اس صورت میں کہا جاتا ہے کہ زید کے نفس نے عمرو کے نفس سے بات کی اور اُس نے اس نفس کی بات سنی۔

دونفسوں کے تعلق کی چوتھی صورت یہ ہے کہ نفس میں غلبہ و محبت کی جو قوت ہے اُس کا اثر و نفوذ سرے سے غائب ہو جائے اور اُس کی بجائے اُس کا ایک ہلکا سا خیال رہ جائے۔ لیکن یہ خیال ایسا ہو کہ اس سے جو اثرات مترتب ہوں، وہ اُس قوت کے اصلی احکام کے خلاف اور اُن سے الگ ہوں۔ اس صورت میں یہ کہا جاتا ہے کہ ذہن میں ایک صورت آئی اور آئینے کی طرح اُس میں نقش ہو گئی۔

الغرض ایک نفس کی دوسرے نفس کے ساتھ تعلق کی یہ چار صورتیں ہیں جن کا کہ اوپر بیان ہوا۔ اور ہر صورت کے اپنے اپنے احکام ہیں۔ تمہیں چاہئے کہ ان معاملات میں غور و تدبیر سے کام لو۔ اس سے پہلے ہم بتا آئے ہیں کہ انسان کے اندر دو لطیفے ہیں۔

ایک لطیفہ "قیومیت الہیہ" کا ہے، جو بدن سے متعلق ہے، اور اس کے اندر حلول کے ہوئے ہیں۔ معرفت اشیاء کے ذیل میں یہ لطیفہ جس طرح موثر ہوتا ہے، ہم ابھی اس کے ذکر سے فارغ ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے اندر ایک اور لطیفہ "نسمہ" بھی ہے۔ نسمے میں ایک اجمالی حس ہوتی ہے اور اس حس کا جسم کے جوارح سے اتصال ہوتا ہے۔ اگر کان کے فعل سے نسمہ کی یہ اجمالی حس متصل ہو تو وہ سنتا ہے۔ اور اگر آنکھ سے اس کا اتصال ہو تو وہ دیکھتا ہے اور اگر زبان سے ہو تو وہ چکھتا ہے۔ اور اگر جسم کے کسی حصے سے چھونے سے نسمے کی اس اجمالی حس کا تعلق ہو تو وہ لمس ہے۔ نسمے کی اسی اجمالی حس کو "حس مشترک" کا نام دیا گیا ہے۔

نسمے کی اس اجمالی حس ہی کا نتیجہ ہے کہ انسان کے پانچ حواس میں سے ہر ایک حس چھونے، چکھنے، سونگھنے، دیکھنے اور سننے سے پہلے ہی ان چیزوں کا خیال کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک نقطہ ہے جو بڑی تیزی سے گھوم رہا ہے۔ اب آنکھ اُسے دیکھتی ہے اور اُسے دائرہ سمجھتی ہے، حالانکہ وہاں دائرہ کا کہیں وجود نہیں ہوتا۔ اس گھومنے والے نقطے کو دائرے کی صورت دینے والی چیز آنکھ نہیں بلکہ نسمے کی یہی حس اجمالی یا حس مشترک ہے۔ یہ تو ہوا دیکھنے کی حس کا معاملہ، ان پانچ حواس میں سے چکھنے کی حس کی قوت خیال یہ ہے کہ مثلاً انسان کھاتے کی ایک مرنے دار چیز دیکھتا ہے، اور چکھنے سے پہلے محض دیکھنے ہی سے

اُس کے مُشر میں پانی آجاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی دوسرے آدمی کو
گدگدی کرنے کے لئے قریب ہوتا ہے، لیکن قبل اس کے کہ وہ اُس کے
بدن کو ہاتھ لگائے، دوسرا آدمی محض خیال سے اگدگدی محسوس
کرنے لگتا ہے۔ یہ چھوٹے کی حس کا خیال ہے۔ اور حس سماعت کی خیالی
قوت یہ ہے کہ وہ نعمات اور اشعار کو سُنتے سماعت ہی اُن کے اذنان کا پتہ
لگا لیتی ہے۔ الغرض انسان کے کان، اُس کا جسم اور زبان وغیرہ تو
سُن کر، چھو کر اور چکھ کر ایک چیز کو معلوم کرتے ہیں، لیکن سننے کی حس
مشترک محض خیال سے اس چیز کو معلوم کر لیتی ہے۔
بعض لسمے جن کی حس مشترک بڑی قوی ہوتی ہے وہ بدن کے ظاہری
جوارح کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ ان کے بغیر ہی بصارت سماعت
ذوق اور لمس کی حسوں سے لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ہم اس مسئلے میں
اصل حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ لسمے کی یہی وہ حس اجمالی ہے
جس کے ذریعہ ظاہری جوارح کی حسیں چیزوں کا ادراک کرتی ہیں۔ اور نیز
مرنے پر جب رُوحیں اپنے بدلوں سے الگ ہو جاتی ہیں تو شاید لسمے کی
یہی وہ حس اجمالی ہے جو خود اپنی جگہ مستقل ہو جاتی ہے۔ اور اپنے خیال
سے جیسے جیسے اُس کے لئے ممکن ہوتا ہے، مثالی شکلیں پیدا کر لیتی ہے
بالکل اُسی طرح جیسے اس دُنیا میں جن اور فرشتے مختلف شکلوں میں ظہور پذیر
ہوتے ہیں۔

تیسرا مشاہدہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے لئے جو شعائر مقرر کئے گئے ہیں، میں نے دیکھا کہ اُن سے نور کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ اس سے میں ان شعائر کی حقیقت کو سمجھ گیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ روحانی امور کو سب سے زیادہ مناسبت اگر کسی چیز ہے تو وہ نور ہے۔ چنانچہ اسی روحانیت ہی کا اثر ہے کہ ان شعائر میں نور کی ہئیت راسخ ہو گئی ہے۔ انسان ان شعائر کے نور کا اپنے روحانی حاستہ سے ادراک بھی کر سکتا ہے۔ اور اس ادراک کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ادراک روح کے اندر نقش ہو جاتا ہے۔ اور اس سے انسان کے اندر انشراح پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور روحانیت سے اس کی مناسبت اور

لے خانہ کعبہ، نماز، حج، روزہ وغیرہ یہ سب اللہ کے شعائر ہیں۔ مترجم

بڑھ جاتی ہے۔

تیسرے شعائر اللہ کی طرف جب لوگ متوجہ ہوتے ہیں تو اس سلسلہ میں ان کے یہ یہ گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک گروہ شعائر اللہ کے حقوق ادا کرنے میں صرف اپنی نیت کا اجر پاتا ہے اور وہ اس طرح کہ یہ گروہ سمجھتا ہے کہ یہ شعائر اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ اس کا حکم ہے کہ ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ چنانچہ وہ اس کا حکم سمجھ کر ان شعائر کے حقوق بجالاتے ہیں، دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کی رُوح کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے روحانی حاستہ سے شعائر اللہ کا نور محسوس کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے ان کی بھی قوتوں پر ملکی قوتیں غالب آجاتی ہیں۔ اور تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو شعائر اللہ کے نور میں بالکل ڈوب جاتے ہیں۔ اور اس حالت میں جب وہ غور و خوض کرتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی اس تدبیر کا جو ان شعائر کی اصل ہے ادراک کر لیتے ہیں اور اس سے وہ حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

چوتھا مشاہدہ

یہ مشاہدہ مشاہدہ عظیم اور تحقیق تحقیق عالی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی اُس عظیم الشان اور جلیل القدر تدلی کی حقیقت سے مطلع فرمایا جو تمام بنی نوع بشر کی طرف متوجہ ہے۔ اس تدلی سے اللہ تعالیٰ کو منظور یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے تاک پہنچنے کی راہ کو لوگوں کے لئے آسان بنائے۔ اس تدلی کا عالم مثال میں ایک مثالی پیکر ہے۔ اور وہاں سے یہ عالم اجساد میں کبھی انبیاء کی صورت میں بالعموم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں بالخصوص اور کبھی کتب الہی کی شکل میں بالعموم اور قرآن کی شکل میں بالخصوص اور کبھی نماز کی صورت میں اور کبھی حج کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ میں نے اس تدلی کو جو اپنی ذات میں ایک ہے دیکھا اور یہ پایا کہ جیسے جیسے خارجی حالات

واسباب ہوتے ہیں، اُسی مناسبت سے وہ طرح طرح کے مظاہر ہیں
 صورت پذیر ہوتی ہے۔ خارجی حالات و اسباب سے میری مراد لوگوں کی
 عادات و اطوار اور اُن کے ذہنوں میں جو علوم مرکوز ہوتے ہیں، اُن
 سے ہے۔ اور یہ چیزیں ایسی ہیں کہ اس زندگی کے بعد بھی جب یہ
 لوگ عالم برزخ میں پہنچتے ہیں تو اُن کی یہ عادات و اطوار اور یہ علوم
 اُن کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ اور اُن کی یہ عادات اور اُن
 کے یہ اطوار اور اُن کے یہ مرکزی علوم ذریعہ بنتے ہیں حظیرۃ القدس میں
 اس عظیم الشان تبدلی کے خاص مثالی پیکر میں بروئے کار آنے کا۔ الغرض
 اس طرح ایک خاص زمانے میں اس تبدلی کا ایک مثالی پیکر حظیرۃ القدس
 میں بنتا ہے اور وہاں سے جب کہ ارادۃ الہی اس کا متقاضی ہوتا ہے
 اور جس وقت کہ دُنیا کے علوی اور سفلی حالات اس کے لئے سازگار ہوتے
 ہیں، یہ مثالی پیکر عالم جسمانی میں نازل ہوتا ہے۔
 اللہ تعالیٰ نے مجھے اس تبدلی کے مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں
 میں ظہور پذیر ہونے کی حکمت، اور پھر اس تبدلی کی ایک صورت کا
 دوسری صورت سے جو وجہ امتیاز ہے، اور جو دراصل نتیجہ ہوتا ہے،
 اُن خارجی حالات و اسباب کا جو اس تبدلی کا باعث بنتے ہیں۔ الغرض
 اللہ تعالیٰ نے مجھے اس حکمت اور اس وجہ امتیاز سے آگاہ فرمایا۔ چنانچہ
 اب ہم انشاء اللہ اس تبدلی کی جو خود اپنی ذات میں ایک ہے حقیقت
 اور مختلف زمانوں میں اس کی مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہونے کی

کیفیت بیان کریں گے۔

اس ضمن میں تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ خارج میں جب شخص اکبر کا وجود بنا تو سب سے پہلا کام جو اُس نے کیا، وہ یہ تھا کہ اُس نے اپنے رب کو پہچانا اور اُس کی جناب میں عجز و نیاز مندی کی۔ اور یہ عجز و نیاز مندی شخص اکبر کے ادراک میں ایک علمی صورت کی طرح نقش ہو گئی، اب اس علمی صورت کے دورخ ہیں۔ اس کا ایک رخ تو شخص اکبر کا حصہ جو جسم اور جسمانیات اور روح اور روحانیات سے متعلق ہے اس کے مقابل ہے، اور دوسرا رخ اُس کے وجود ذاتی کے مقابل ہے۔ اور اس طرح یہ دوسرا رخ علم کا مقصود یعنی خود "معلوم" بن گیا۔ چنانچہ تدلیات الہی میں سے یہ تدلی جو وصال الہی کا ذریعہ بنی اسی رخ سے متعلق ہے اور یہ شخص اکبر کے حصہ میں آئی ہے، اور اسی سے اُسے اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوئی۔ اب اس تدلی کا ایک اپنا مخصوص

لہ یہ سب کائنات جو ہمیں نظر آتی ہے، اس کا صدور ایک ہی وجود سے ہوتا ہے اور ہو رہا ہے۔ اس وجود کے دو مرتبے ہیں، ایک مرتبہ غیب ہے جس کے تین درجے ہیں۔ درجہ اول احدیت و دوسرا درجہ وحدت اور تیسرا واحدیت، وجود کا دوسرا مرتبہ خارج میں ظہور کا ہے جس کے تین منازل ہیں، ارواح، امثال اور اجسام۔ خارج سے یہاں مراد وجود کا یہ مرتبہ ظہور ہے۔ مترجم لہ ایک شخص واحد عبارت ہوتا ہے جسم اور نفس دونوں کے مجموعے سے۔ اسی طرح کل کائنات کا بھی ایک کلی جسم اور کلی نفس مانا گیا ہے۔ اور ان دونوں کے مجموعے کو شخص اکبر کا نام دیا جاتا ہے۔

مترجم

مقام ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتی، چنانچہ جو شخص اُس کے دائرہ اثر میں آتا ہے، اُس کو اس معرفت میں سے حصہ مل جاتا ہے۔ الغرض اس تبدیلی کے تنزلات میں سے جب کسی تنزل کا ایک محدود مقام میں نزل ہوتا ہے تو جیسے بھی اُس مقام کے حالات و مقتضیات ہوتے ہیں، ان کے مطابق یہ تبدیلی صورت پذیر ہوتی ہے، اور اس تنزل میں دو جانبوں کے احکام کی رعایت کی جاتی ہے۔ یعنی ایک یہ کہ جو تبدیلی اصل مقصود ہے، محفوظ رہے اور دوسرے اُس زمانے اور مقام کے جو حالات و مقتضیات ہوں۔ اُن کو ملحوظ رکھا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ معرفت کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تمہیں چاہئے کہ اسے خوب مضبوطی سے پکڑو، جیسے کہ کوئی کسی چیز کو دانتوں سے پکڑتا ہے۔

شخص اکبر کے ظہور پذیر ہونے کے بعد جب افلاک میں سے ایک ایک فلک اور عناصر میں سے ایک ایک عنصر اپنی ظاہری اور مخفی روح کے ساتھ معرض وجود میں آیا، تو ہر فلک اور ہر عنصر سے جو چیز سب سے پہلے ظاہر ہوئی، وہ یہ تھی کہ اُس نے اپنے رب کو پہچانا۔ اور اس کی جناب میں عجز و نیاز مندی کی، اور اس ضمن میں ان میں سے ہر ایک نے خود اپنے فطری تقاضے سے شخص اکبر سے مدد لی۔ اور یہ افلاک اور عناصر کیوں شخص اکبر سے مدد نہ لیتے۔ آخر ان کی اصل اور ان کے وجود کا مبداء تو شخص اکبر ہی ہے۔ چنانچہ یہ فلک اور یہ عناصر اسی طرح ذات حق کی طرف متوجہ ہوئے جس طرح کہ خود شخص اکبر اُس ذات حق کی طرف متوجہ ہوتا۔ لیکن اس میں

سلسلہ میں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ شخص اکبر اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی جو تدلی تھی، وہ سبب بنی ایک فیضان کا جو ایک ایک فلک اور ایک ایک عنصر کے ادراک میں ایک خاص صورت میں رونما ہوا۔ یہ اس باب میں مصرفت کا دوسرا نکتہ ہے۔

شخص اکبر، افلاک اور عناصر کی تخلیق کے بعد "اعیان" کا ظہور ہوا۔ ان اعیان کو "ارباب انواع" بھی کہا گیا ہے۔ الغرض جب یہ اعیان معرض وجود میں آئے تو ان میں سے ہر ہر نوع کے الگ الگ احکام کا تعین ہوا۔ لیکن یہ اس دنیا کا نہیں بلکہ عالم مثال کا ذکر ہے۔ اب ان انواع میں سے ایک نوع انسان کی ہے۔ اور یہ نوع اس لحاظ سے کہ اس میں معجزات الہی کی استعداد رکھی گئی ہے۔ اور یہ اپنے اعمال کی جواب دہ بھی ہے اور نیز اسے بیکار اور بھل نہیں چھوڑا گیا، اور پھر اس بنا پر کہ اس کو خدا کی امانت کا حامل بنایا گیا ہے دوسری انواع سے ممتاز ہے۔ جب عالم مثال میں نوع انسان کا یہ مثالی پیکر بنا تو اس سے تقسیم انحصاری کے قاعدہ پر افراد انسانی ظاہر ہو ہو کر عالم اجسام میں

لے "اعیان" جمع عین کی۔ افلاطون کے نزدیک ہر چیز جو اس دنیا میں پائی جاتی ہے اس دنیا کے ماوراء ایک دنیا ہے، جس میں اس چیز کی اصل موجود ہے۔ اس اصل چیز کو عین کہتے ہیں۔ ان اعیان کو مثل افلاطون کا نام بھی دیا گیا ہے۔ مترجم

لے یہ اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف انا عرفنا الامانة على السموات والارض
لہ تقسیم انحصاری۔ مثال کے طور پر کلمہ کو ہم صرف اسم، فعل اور حرف پر ہی تقسیم کر سکتے ہیں اور ان کے سوا کلمہ سے کچھ اور نہیں نکال سکتے۔ تقسیم تقسیم انحصاری کہلاتی ہے۔ مترجم

آنے لگے۔ ان افراد کے ظاہر ہونے کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کہ کوئی موسیقار ہو اور وہ اپنے ساز کی تاروں کو جانچنے کے بعد یہ معلوم کر لے کہ ان تاروں میں یہ یہ راگ ہے، نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔ اس کے بعد وہ سوچے کہ اگر میں اس راگ کو فلاں راگ سے ملا دوں تو ان دونوں کے ملنے سے یہ یہ اور راگنیاں پیدا ہو جائیں گی، نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم، جیسے کہ حصر کرنے والی عقلی تقسیم کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ۴۸ راگنیوں کو ایک دوسرے سے ملائے اور اس طرح وہ برابر کرتا رہے، یہاں تک کہ وہ راگوں اور راگنیوں کی ایک بہت بڑی تعداد جو بہر حال محدود ہی ہوگی، معلوم کر لے۔ اب وہ اپنے راگوں اور راگنیوں کو یاد کر لیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہر راگ کے کیا اصول و احکام ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی کیا خاصیت ہے۔ اور نیز ایک راگ کو دن کے کس حصے میں اور کس مجلس میں گایا جائے اور دوسرے کو دن کے کس حصے میں اور مجلس میں۔ الغرض اس طرح راگوں اور راگنیوں کا یہ سلسلہ بے نہایت حد تک چلا جاتا ہے اب فرض کیا اگر اس موسیقار کی عمر اب تک مستم ہو جائے تو ظاہر ہے اس شخص کی راگوں کے معاملہ میں یہ عجوبہ کاری کبھی ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔

قصہ مختصر، نوع انسانی کے اس مثالی پیکر سے جو عالم مثال میں قائم ہے، اس طرح افراد انسانی ظاہر ہوئے اور اس طرح وہ الگ الگ استعدادوں اور قوتوں کے مالک بنے۔ چنانچہ ان افراد انسانی

میں سے بعض ذہین ہیں اور بعض گند ذہین، اور بعض اُن میں سے پاک نفوس رکھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ حظیرۃ القدس میں ان افراد کی ہمتیں، ان کے نفوس اور ان کی انسانیت کا جو ہر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ وہاں یہ سب کے سب افراد اس طرح ہو گئے جیسے کہ یہ ایک چیز ہیں۔ اور ان پر ایک ہی نام صادق آتا ہے، اور ان تمام کے تمام کا ایک ہی طرف انتساب ہے۔ حظیرۃ القدس میں ان سب کے ایک ہونے کا "السان الہی" نام رکھا گیا ہے۔ اور حظیرۃ القدس میں اُن کے اس طرح ایک ہونے کا نتیجہ ہے کہ ہم مختلف افراد انسانی کو باوجود اُن کے باہمی اختلافات کے ان معاملہ اور ادراکات میں ایک دوسرے سے قریب پاتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی تدلی اعظم کا نزول ہوتا ہے۔ اور یہی چیز ہے جو عالم مثال میں اُن کے لئے "قدم صدق" اور ان کے پروردگار لے حظیرۃ القدس۔ تمہیں کہیں یہ گمان نہ گزرے کہ جس مقام کو ہم حظیرۃ القدس کہہ رہے ہیں، شاید وہ بنی آدم سے کئی مسافت دور ہوگا، یادہ اس دُنیا سے کہیں کسی بلندی پر یا کسی اُذر طرف واقع ہوگا۔ بات یہ نہیں ہے۔ بلکہ دراصل حقیقت یہ ہے کہ حظیرۃ القدس اور بنی آدم میں اگر فرق و تفاوت ہے تو صرف مرتبہ کا ہے، بعد و مسافت کا نہیں۔ اور حظیرۃ القدس کو ہم سے وہی نسبت ہے جو روح کو جسم سے ہوتی ہے۔

چو جاں اندر تن و تن جاں ندیدہ" ہمعات کا اردو ترجمہ (مترجم)
 ۱۔ اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف: "اِنَّ لَهُمْ قَدَامٌ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّہُمْ" سورہ یونس - ۲۔ (مترجم)

کی طرف سے "مقام معلوم" کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ نفوس انسانی جب کبھی اپنی حیوانی عادات کی آلودگیوں اور جسم کی شہوانی کیفیات سے تجر و اختیار کرتے ہیں تو وہ فوراً ہی حظیرۃ القدس کی طرف جھپک لئے جاتے ہیں۔ اور وہاں خدا تعالیٰ کے جلال کی بجلی چمکتی ہے، جس سے ان لوگوں کے ہوش گم ہو جاتے ہیں۔ اور یہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ انہیں اس بات کی سُدھ بُدھ نہیں رہتی کہ وہ کہاں سے آئے، اور کہاں جائینگے۔ اور جہاں سے آئے تھے، اُن کے واپس لوٹنے کی وہاں کوئی تدبیر ممکن بھی ہے یا نہیں۔ اس مقام پر ان لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر تدبیر الہی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ تدلی جو بندوں کو اس تک پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہے ان کی طرف حرکت کرے۔ چنانچہ یہ تدلی نیچے اُترتی ہے۔ اور شخص اور متعین ہوتی ہے، اور اس شخص اور تعین کی وجہ سے ان لوگوں کے لئے اس تدلی کا قُرب اور اس کے رنگ میں رنگا جانا ممکن ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس تدلی کا مختلف صورتیں اختیار کرنا اُن خارجی حالات و مقتضیات کا نتیجہ ہوتا ہے، جن میں یہ تدلی شخص اور معین ہوتی ہے۔ تدلی کی ان صورتوں میں سے ایک نبوت ہے۔

نبوت کی حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں جب لوگ آپس میں مل کر

لے اشارہ ہے سورہ "الصافات" کی آیت ۱۶۴ کی طرف۔ وَمَا مِّنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ (مترجم)

رہتے ہیں۔ تو اُن میں جو کامل تر، عاقل تر اور قابل تر ہوتا ہے، وہ اُن لوگوں پر جو اُس سے تدبیر منستزل اور سیاست اجتماعی میں کم درجے کے ہوتے ہیں، حکومت کرتا ہے، یہ رجحان انسانوں کی طبیعت میں داخل ہے۔ اور یہ گویا اُن کی عادت سی بن گئی ہے۔ چنانچہ جس طرح لوگوں کو کھانے، پینے، اور مٹھنے پہننے، گھر بنانے اور مل جل کر رہنے کی اجتماعی ضرورتوں کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح وہ اس فطری رجحان کو بھی اپنے دلوں میں بغیر کسی تکلف کے موجود پاتے ہیں۔ اور یہ چیز مرنے کے بعد برزخ اور معاد میں بھی اُن کے ساتھ رہتی ہے۔ چنانچہ انسانوں کی یہی وہ فطری خصوصیت ہے، جو تدریجی الہی کو ایک جسمانی صورت دینے کا باعث بنتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ لوگوں میں سے ایک شخص آگے بڑھتا ہے اور وہ اُن کا پیشوا بنتا ہے۔ اور سب اُس کی رائے پر چلتے ہیں۔ اور یہ جو تدریجی جسمانی صورت ہوتی ہے، اس میں روح الہی پھونکی جاتی ہے، اور اُس سے خیر و برکت کا ظہور ہوتا ہے۔ الغرض یہ ہے شکل نبوت اور رسالت کی۔ نبوت سے یہاں میری مراد اُس نبوت سے ہے جو لوگوں کی قیادت اُن کی رہنمائی، اُن سے بحث و جدل اور اُن کو مستحضر کرنے کے متعلق ہے، نہ کہ وہ نبوت جس سے فقط علوم کا فیضان ہوتا ہو۔ اور گواہ اسطرح اس سے لوگ مطیع بھی ہو جاتے ہوں۔ اور اس نبوت سے میری مراد یہاں وہ نبوت بھی نہیں جو سب پر جامع اور سب لوگوں کیلئے بطور شاہد کے

لہ اشان ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف۔ "وَلْيَوْمَ يُنْفَخُ الرِّقَابُ" اُمّہ شہیدہ
 شہیدہ ہوں اُنہیں ہم و جننا بائ شہیدہ علی ہمدانی (منزہم)

ہوتی ہے۔ جیسے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تھی۔
 تبدلی الہی کی ایک صورت نماز ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان
 کے اندر اخلاق و اطوار کی جو نفسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ اُن میں سے ہر
 نفسی کیفیت کا خارج میں کوئی نہ کوئی عملی مظہر ہوتا ہے۔ اور یہ عملی مظہر ہی
 اس عالم محسوس میں اُس خُلق کی نفسی کیفیت کا مادی قائم مقام بن جاتا ہے۔
 اب اخلاق انسانی کے یہ عملی مظاہر ذریعہ بن جاتے ہیں نفس میں ان اخلاق
 کی باطنی کیفیات کی تربیت کا۔ چنانچہ اگر تعریف ہوتی ہے تو ان عملی مظاہر
 کی، اور مذمت کی جاتی ہے تو ان کی۔ اور ذکر ہوتا ہے تو ان عملی مظاہر کا،
 اگرچہ اصل مقصود یہ عملی مظاہر نہیں، بلکہ وہ نفسی کیفیات ہوتی ہیں جن کے یہ
 اعمال خارج میں مظہر بنتے ہیں۔ الغرض نفس کے ان باطنی اخلاق کی بجائے
 خارج میں اُن کے قائم مقام ظاہری اعمال کا ذکر کرنا انسانوں کی طبیعت میں
 داخل ہو گیا ہے، اور یہ گویا اب ان کی ایک عادت سی بن گئی ہے۔ اور ان
 کے ذہنوں میں اچھی طرح سے راسخ ہو گئی ہے۔

انسانی زندگی کی اس حقیقت واقعی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے
 یہ کیلکہ انسانوں کے اخلاق میں سے ایک خُلق، اُن کی نفسی کیفیات میں سے
 اہم مثال کے طور پر نماز کو یعینے۔ قیام، رکوع، تشہد اور سجود سے اصل مقصود نفس کے
 اندر خدا تعالیٰ کے لئے عجز و نیاز کی کیفیت کا پیدا کرنا ہے لیکن یہ اعمال اس نفسی کیفیت
 کے قائم مقام بن گئے ہیں۔ اسی طرح روزے، زکوٰۃ اور حج کو یعینے، ان کے ظاہری اعمال
 بھی فی الحقیقت باطنی کیفیات کے لئے بطور ایک ذریعہ کے ہیں۔ (مترجم)

ایک کیفیت اور اُن کی رُوحوں کے رنگوں میں سے ایک رنگ، اور خاص طور پر وہ جو حظیرۃ القدس کے "مقام معلوم" میں انسانوں کے رنگے جانیکا رنگ ہے، انتخاب فرمایا۔ اس خُلق، اس باطنی کیفیت اور اس رُوحانی رنگ سے میری مراد "احسان" کی صفت یعنی خدا تعالیٰ کی جناب میں خشوع و خضوع اور انسان کی طبیعت کا نفس کی تاریک اور فاسد کیفیات سے پاک ہونا ہے۔ اس خُلق "احسان" کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان میں اُس وقت بھی موجود رہتا ہے، جب کہ اُس کا نفس حیوانیت سے امتزاج رکھتا ہو۔ اور گواہی میں یہ خُلق حظیرۃ القدس کے بلند مرتبہ "مقام معلوم" سے سب سے زیادہ مشابہ ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ خُلق گویا خود حظیرۃ القدس کا "مقام معلوم" بن جاتا ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح کہ انسان کا بدن کلیتہً اُس کے نفس کا مرادف بن جاتا ہے۔ قصہ مختصر، اللہ تعالیٰ نے انسان کے تمام اخلاق میں سے اُس کے اس خُلق "احسان" کو انتخاب فرمایا۔ اس کے بعد اُس نے وہ اقوال اور افعال منتخب فرمائے جو اس خُلق کی ترجمانی کرتے اور اس کے قائم مقام ہو سکتے ہیں، یہاں تک کہ اُن اقوال اور اعمال پر اس خُلق کا پوری طرح انطباق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان اقوال اور افعال کو مرادف اور قائم مقام قرار دیا اُس خُلق کا۔ گویا یہ اقوال و اعمال بعینہ یہ خُلق بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز کے افعال اور اقوال ترجمان اور قائم مقام ہیں نفس انسانی کے

۱۔ اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔ دیکھئے صفحہ ۸۶۔

اُس باطنی خلق کے جسے "احسان" کہتے ہیں۔ اور یہ خلق "احسان" نمونہ ہے حظیرۃ القدس کے "مقام معلوم" کا جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور حظیرۃ القدس کا یہ "مقام معلوم" ایک صورت ہے اللہ تعالیٰ کی تدلی کی تدلی الہی کی ایک صورت آسمانی کتابیں ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسانوں کو پہلے پہل جب یہ ضرورت پیش آتی کہ اُن کے ہاں جو علوم و اخبار مروج ہیں ■■■ زمانہ دراز تک محفوظ رہ سکیں، اور دور دور ملکوں والے بھی ان سے استفادہ کر سکیں تو الہام کے ذریعہ انہیں کتابوں کو لکھنے اور رسالوں کو مدون کرنے کی تعلیم دی گئی۔ اس میں مصلحت یہ بھی تھی کہ مصنف کی اصل تحریر بحکم محفوظ رہ سکے، اور اس میں نہ تو کوئی بھول واقع ہو، اور نہ اُس کے معانی کی غلط روایت ہو سکے۔ الغرض آگے چل کر کتابوں کو لکھنے اور رسالوں کو جمع کرنے کا رواج لوگوں میں خوب پھیل گیا، اور ان حالات میں جب اللہ کی تدلی حرکت میں آتی تو لامحالہ اُس وقت لوگوں کا جو دستور بن چکا تھا، اُسی کے مطابق اس تدلی نے صورت اختیار کی۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس امر کا مقتضی ہوا کہ رسول ایسی تخلیقات سے بہرہ یاب ہو جو اُسے عالم بشریت سے اُچک کر حظیرۃ القدس میں پہنچا دیں۔ اور اس طرح ملائعہ اعلیٰ کے علوم، ملائعہ اعلیٰ کی طرف سے انسانوں کو اُن کے ناپاک شبہات کے جوابات، رحمت الہی کے ارادے، اور وہ الہامات خیر جو لوگوں کے دلوں میں ہیں، یہ سب رسول کے ادراک میں تلاوت کی جانے والی وحی کی شکل میں قرار پذیر ہو جائیں۔

الغرض یہ ہے شان نزول الہامی کتابوں کے وجود میں آنے کا۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب تورات ہے، تورات سے پہلے جو صحف تھے، وہ اُن علوم پر مشتمل تھے جن کا بنی کے قلب پر فیضان ہوا تھا، اور بنی کے بعد اُس کی اُمت میں سے کسی فرد نے جس کے کہ جی میں آیا، ان علوم کو صحیفوں میں مدون کر دیا۔

تدلی الہی کی صورتوں میں سے ایک صورت "ملت" کی ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسانوں کو فطرت کی طرف سے یہ الہام ہوا کہ وہ اپس کے تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے دستور اور قواعد بنائیں۔ اس الہام کی بنا پر انہوں نے شہری زندگی کے قاعدے بنائے، خانہ داری کے طریقے وضع کئے، معاشی اور کاروباری دستور مرتب کئے۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کے لئے قواعد اور دستور بنانے کی یہ عادت اُن کی فطرت کا اصل الاصول بن گئی۔ اور اس کا شمار اُن کے ہاں ضروری علوم میں سے ہونے لگا۔ جب یہ چیز لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گئی تو اس کے بعد ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی کے قلب کو یہ قابلیت بخشی کہ اُس میں اللہ تعالیٰ کا تعلیم کردہ دستور جگہ پکڑ سکے۔ اس دستور میں اللہ تعالیٰ کی رُوح ہوتی ہے اور اس میں برکت اور نور ہے۔ یہ ہے اللہ کی شریعت، اور اس کا نام "ملت" ہے۔

تدلی الہی کی ایک صورت "بریت اللہ" ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے لوگ عبادت گاہیں اور معبد بناتے تھے۔ انہوں نے اُس زمانے میں جب کہ آفتاب کی روحانیت کا غلبہ

بھٹا، آفتاب کے نام پر عبادت گاہیں بنائیں۔ اور اسی طرح اور اسی خیال
 کے ماتحت ماہتاب اور دوسرے ستاروں کے نام سے معابد بنائے گئے۔
 اُس زمانے میں ان لوگوں کا اعتقاد یہ تھا کہ جو شخص ان معابد میں داخل ہوتا
 ہے، وہ ان کو اکب کا جن کے نام پر یہ معابد ہیں، مقرب بن جاتا ہے۔
 الغرض اس طرح کے معابد اور کھنڈے بنانا اُن کے ہاں ضروری امور میں
 سے قرار پایا۔ چنانچہ اس کے پیش نظر وہ اس بات کو ایک امر محال سمجھنے
 لگے کہ کسی مجروحہ کی طرف جب تک کہ اُس کے لئے کوئی خاص جہت اور
 موضع و محل معین نہ کر دیا جائے، توجہ کی جاسکتی ہے۔ اس زمانے میں
 حضرت ابراہیم مبعوث ہوئے ہیں۔ اور اُن کے زمانے کا جو دستور اور طریقہ
 تھا، اُس کے مطابق اُن کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے لئے معبد بنانے کا اہتمام
 ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مخصوص جگہ
 جو انہوں نے اس معبد کے لئے مناسب سمجھی، اُس کا انتخاب کیا۔ اس جگہ کی
 خصوصیت یہ تھی کہ افلاک اور عناصر کی قوتوں کا تقاعد تھا کہ اس جگہ
 کو بے قاعدے دوام حاصل ہو۔ اور لوگوں کے دل اس طرف خود بخود کھینچے چلے
 آئیں۔ اب اس معبد کی تعظیم و احترام کے سلسلہ میں قاعدے اور دستور مقرر
 ملے گزشتہ زمانوں میں جب کسی نئے شہر کی بنیاد رکھی جاتی تھی تو بچوں سے اُس کے
 محل وقوع کے متعلق اور جس مبلکہ ساخت میں اس کی بنا پڑتی تھی، اُس کے بارے
 میں استسباب کر لیا جاتا تھا۔ تاریخوں میں بغداد اور قاہرہ کی تاسیس کے ضمن میں اس قسم
 کی روایات بڑی تفصیل سے ملتی ہیں۔

ہوئے۔ اور تمدنی الہی کے ذریعہ ان قواعدوں کو مناسب حج کی صورت میں لوگوں کے لئے واجب کر دیا گیا۔

اس ضمن میں تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ شریعتوں کے احکام و قواعد کے تشکیل لوگوں کی عادات کے مطابق ہوتی ہے۔ اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی شریعت کی تشکیل ہونے لگتی ہے تو اُس وقت اللہ تعالیٰ لوگوں کی عادات پر نظر ڈالتا ہے۔ اب جو عادتیں بڑی ہوتی ہیں اُن کو ترک کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اور جو عادتیں اچھی ہوتی ہیں، اُن کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا ہے۔ یہی کیفیت ”وحی متلو“ یعنی وہ وحی جس کے الفاظ کی تلاوت کی جاتی ہے، کی ہے۔ یہ وحی اُن الفاظ، کلمات، اور اسالیب میں جو خود صاحب وحی کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، صورت پذیر ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عربوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں وحی کی۔ اور سریانی بولنے والوں کے لئے سریانی میں۔ اور اسی قبیل سے روئے صالحہ اور پتھے خواب ہیں۔

روئے صالحہ اور پتھے خوابوں کی کیفیت یہ ہے کہ خواب دیکھنے والے کے ذہن میں جو جو صورتیں اور خیالات پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، وہ انہیں کے لباس میں خوابیں دیکھتا ہے چنانچہ اسی بنا پر جب مادر زاد اندھا خواب دیکھتا ہے تو اُس کو خواب میں رنگ اور شکلیں دکھائی نہیں دیتیں، بلکہ وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ چیزوں کو چھو رہا ہے۔ یا اُن کی آوازیں سن رہا ہے۔

یا وہ خواب میں چیزوں کو چکھتا اور سونگھتا ہے۔ اور یا وہ اُن کے متعلق خیال آرائی کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص پیدائشی بہرہ ہے، وہ خواب میں کبھی آواز نہیں سنتا، بلکہ اُس کا خواب صرف دیکھنے، چھونے اور اس طرح کے دوسرے ذرائع علم تک محدود رہتا ہے۔ اور اگر اس معاملے میں مزید تحقیق چاہتے ہو تو سنو! عالم غیب سے جب کوئی فیضان ہوتا ہے، خواہ فیضان روزمرہ کا سا عام فیضان ہو یا یہ فیضان اعجاز اور خارق عادت کی نوعیت کا ہو، بہر حال یہ فیضان محل فیضان کی جو ضروری خصوصیات ہوتی ہیں، انہیں کے لباس ہی میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ اور یہی خصوصیات ہی ایک فیضان کو دوسرے فیضان سے جدا کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر گھوڑے کو دیکھئے۔ گھوڑے کی جو بھی ذاتی خصوصیات ہیں، وہ سب کی سب گھوڑے کی جنس میں موجود ہیں۔ اب گھوڑا چار ہاتھ لبا ہو سکتا ہے، اور اس سے قد سے زیادہ بھی اور کچھ کم بھی۔ غرضیکہ گھوڑے کا کم و بیش چار ہاتھ لبا ہونا خود اُس کی اصل جنس میں داخل ہے۔ اسی طرح اب ایک نوع کی خصوصیات کو لو، جو ایک نوع کو دوسری نوع سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ نوعی خصوصیات بھی خود اس نوع کی اصل جنس میں داخل ہوتی ہیں۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ہر فیضان عینی کی جو بھی اپنی مخصوص صورت اور وضع ہوتی ہے۔ اگر اُس مخصوص صورت اور وضع کا سبب ڈھونڈنا چاہو تو وہ تمہیں اُس محل کی خصوصیات میں ملے گا۔ جہاں کہ یہ فیضان واقع ہوا۔

اس بحث میں اب ایک مسئلہ باقی رہ گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ فیضانِ غیبی کی مختلف نوعیتوں کے الگ الگ صورت پذیر ہونے کا تو انحصار اس پر ہے کہ محل فیضان میں کون سی خصوصیات ممکن اور مقدر ہیں۔ لیکن جہاں تک تدلی اور شعائر کے ظہور کا تعلق ہے، تو لوگوں کے جو مسلمات ہوتے ہیں۔ اور جو چیزیں اُن کے ہاں مشہور ہوتی ہیں اور لوگوں کے دل اُن سے مطمئن ہوتے ہیں، تدلی اور شعائر اُن چیزوں کی صورت ہی ہیں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی تدلی کا ظہور ہوتا ہے، لوگوں کے مسلمات ہی اُس کے نزول کا ذریعہ بنتے ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو۔ آخر تدلی سے اللہ تعالیٰ کا مقصد تو یہی ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ جہاں تک کہ اُن سے ہو سکے، اُسی کی اطاعت کریں اور اپنے اعضاء و جوارح کو اعمالِ اطاعت کا عادی بنائیں۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ تدلی لوگوں کے لئے جو مانوس صورتیں ہیں ان میں ظاہر ہو۔

ہاں اس ضمن میں یہ ہو سکتا ہے کہ جہاں حالات و اسباب اس امر کے متقاضی ہوں کہ ایک دس ہاتھ کا انسان ظاہر ہو، وہاں ایک دس ہاتھ کا انسان وجود میں آجائے۔ بے شک یہ چیز ممکن ہے، لیکن ایسا ہونا مانوس اور معروف نہیں ہوتا کہ لوگ اس سے مطمئن ہو جائیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ تدلیاتِ الہی اور شریعتیں ہمیشہ لوگوں کے مسلمات اور جو چیزیں کہ اُن کے ہاں مشہور ہوتی ہیں، اُن کے موافق ہی صورت پذیر ہوتی ہیں۔ بیشک اس سلسلہ میں اتنا ضرور ہوتا ہے کہ اس تدلی کی وجہ سے ان چیزوں میں پہلے

کے مقابلہ میں مزید خیر و برکت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی سچ کو جھوٹ سے اور حق کو باطل سے تمیز کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

ممکن ہے ہمارے دل میں یہ خیال گزرے کہ ہر تدلی کا خارق عادت اور اعجاز ہونا ضروری ہے، اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تدلی لوگوں کے مسئلہ کے مطابق ہو۔ اس معاملے میں ہماری رائے یہ ہے کہ بس اس بھمل اور پیچیدہ بات پر رک کر نہ رہ جاؤ بلکہ اس مسئلے کی پوری تحقیق کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر چیز کا صدور اپنی اصل عادت ہی کے مطابق ہوتا ہے چنانچہ وہ کبھی اپنی عادات سے تجاوز نہیں کرتی۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کا مطالبہ تھا کہ رسول بشر نہ ہو بلکہ فرشتہ ہو۔ لیکن رسول فرشتہ نہیں ہو سکتا تھا، اور اسی طرح نہ قرآن مجید، عجمی زبان میں اور نہ بیت اللہ نور کا ہو سکتا تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ایسا ہونا ان چیزوں کی عادت کے خلاف تھا۔ ہاں اس سلسلے میں یہ ضرور ہوا کہ ان چیزوں کا خارق عادت ہونا دراصل اس غیر معمولی خیر و برکت کے لحاظ سے تھا، نہ کہ اس وجہ سے کہ ان چیزوں میں خلاف عادت کوئی تبدیلی ہو گئی ہو۔ اور اس معاملے میں قریش مکہ کا قصور یہ تھا کہ وہ ان دو چیزوں میں یعنی ایک چیز کا اعجاز اور اُس کا خارق عادت ہونا بلحاظ خیر و برکت کے اور اُس کا اعجاز و خرق عادت اس حیثیت سے کہ یہ چیز خلاف عادت ظاہر ہوتی ہے ان میں جو فرق ہے اُس کی حکمت کو وہ نہ سمجھ سکے۔ اور اسی نا سمجھی کی بنا پر ان کی یہ خواہش تھی کہ رسول انسان کی بجائے فرشتہ ہو۔ اور نیز انہیں اس بات پر تعجب ہوتا

تھا کہ یہ کیسا رسول ہے، جو عام آدمیوں کی طرح کھاتا پیتا اور نگلیوں بازو
میں چلتا پھرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی ان باتوں کی اور اس
معاملہ میں اُن کے جو فاسد عقائد تھے، اُن کی تردید فرمائی۔

واقعہ یہ ہے کہ رسول کے غالب آنے کی یہ صورت نہیں ہوتی کہ اُس
کے ساتھ فرشتہ ہو جو اس امر کی شہادت دے کہ یہ رسول سچا ہے۔ نہ رسول
کے برحق ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس کے لئے آسمان سے کوئی
کتاب اُترے، اور لوگ اپنی آنکھوں سے اس کو اُترنا دیکھیں جیسا کہ خدا
تعالیٰ نے سورۃ "الفرقان" میں اور دوسری جگہ اس کی صراحت فرمائی
ہے۔ بلکہ جس طرح بادشاہ جہاد اور جنگ کے ذریعہ اپنے مخالفوں پر غالب
آتے ہیں۔ یہی صورت رسول کے غلبے کی بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک طے شدہ
امر ہے۔ اور خود ہمارا وجدان بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔ اور ہم نے خود
کتاب و سنت کو اس امر کی اور نیز اس امر سے جو اُور شاخیں پھوٹی ہیں
اور پھر نہ صرف اس مسئلے میں بلکہ اس کے علاوہ اور بہت سے مسائل میں
وہ صاحت کرنے والا پایا ہے۔ پس اللہ ہی کے لئے تعریف ہے اول میں
بھی اور آخر میں بھی۔

لَهُ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا تَوَلَّاهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ عَلَيْهِمْ الْقُرْآنُ جَمْلَةً وَاحِدَةً ۔

پانچواں مشاہدہ

ملاء اعلیٰ کی طرف سے میرے دل میں بڑے بڑے اسرار القا کئے گئے
چنانچہ ان اسرار سے میرا نفس اور جسم بھر پور ہو گیا۔ اب میں یہاں ان اسرار کو
تمہارے لئے بیان کرتا ہوں۔ تمہیں چاہئے کہ ان اسرار کو خوب مضبوط پکڑو
جیسے کہ کوئی چیز دانتوں سے پکڑی جاتی ہے۔

اگر تمہاری خواہش ہو کہ تمہیں ملاء اعلیٰ کے فرشتوں کا جو آپس میں بحث
مباحثہ کرتے ہیں، کمال حاصل ہو تو اس کے لئے سوائے اس کے کہ تم دُعا
لے اشارہ ہے ترمذی اور حجازی کی اُس حدیث کی طرف جس کا ترجمہ یہ ہے: "میں نے
اپنے رب کو اچھی صورت میں دیکھا۔ میرے رب نے کہا کہ اے محمد! ملاء اعلیٰ کے فرشتے کس
بات میں جھگڑتے ہیں۔ میں نے کہا، آپ بہتر جانتے ہیں۔ پس اُس نے اپنا ہاتھ میرے
کاندھوں کے درمیان رکھا۔ اور اُس کی وجہ سے میں نے اپنے سینہ (باقی حاشیہ صفحہ ۹۶ پر)

کرو، اور کثرت سے اپنے رب کی جناب میں عاجزی کرو۔ اور اُس سے اپنے پورے ارادے اور پوری دلی ہمت سے سوال کرو، اور کوئی تدبیر نہ کر اور اس ضمن میں یہ اور بھی بہتر ہے کہ تمہارا یہ سوال کسی ایسی چیز کے متعلق ہو جس کو حاصل کرنے کے لئے تمہارے اندر عقلاً اور طبعاً دونوں لحاظ سے بڑا اشتیاق پایا جاتا ہو۔ اور پھر یہ چیز جس کا تم سوال کر رہے ہو، خود تمہارے لئے اور نیز دوسرے لوگوں کے لئے ترقی و تکمیل ذات کا باعث ہو۔ اور اس سے عام خلق اللہ کو بھی آرام و آسائش پہنچ سکتا ہو۔ الغرض اللہ تعالیٰ سے ایسی چیز کے سوال کے لئے جب تمہارے اندر دُعا کا ملکہ راسخ ہو جائے اور تم یہ بھی جان لو کہ اللہ تعالیٰ سے اس چیز کے لئے کس طرح خلوص ہمت سے دعا کی جاتی ہے، تو اُس وقت تم سمجھ لو کہ تم ملاءِ اعلیٰ کے زمرہ میں منسلک ہو گئے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں کہ ”جس کے لئے دُعا کا دروازہ کھلا، گویا اُس کے لئے جنت اور رحمت کا دروازہ کھل گیا“ یا اس ارشاد سے ملتا جلتا کہیں اور جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، تو گویا اس میں آپ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ تو ملاءِ اعلیٰ کے کمال کے حصول کا طریقہ ہوا۔ اب اگر کوئی شخص ملاءِ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۷) میں ٹھنڈک پائی۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمینوں کے درمیان ہے میں نے اُن سب (اسرار و حقائق) کو جان لیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”كَذَٰلِكَ نُرِيٰ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لِيَكُوْنُ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ“ آیت تلاوت فرمائی۔ مترجم

سافل کے فرشتوں کا کمال حاصل کرنا چاہئے تو اس کی یہ صورت
ہے کہ وہ سختی سے طہارت کی پابندی کرے۔ اور وہ اُن قدیم
مسجدوں میں جائے، جہاں کہ اولیاء کی جماعتوں نے نمازیں
پڑھی ہوں۔ اور وہ کثرت سے نمازیں پڑھے۔ کتاب اللہ کی
تلاوت کرے۔ اور اللہ کے کل اسمائے حسنہ کا یا اُن میں سے جو
چالیس اسماء مشہور ہیں، اُن کا ذکر کرے۔ یہ سب چیزیں جو
اوپر بیان ہوئیں، اس مقصد کے لئے جس کے حصول میں وہ
کوشاں ہے، ایک رکن کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور اس سلسلہ کا
دوسرا رکن یہ ہے کہ وہ اہم معاملات کے لئے کثرت سے استخارے
کرے۔ اور استخارے کے دوران میں وہ اپنے نفس کو اس ڈھب
پر رکھے کہ گویا اُس کے لئے اس کام کا کرنا یا اُسے ترک کر دینا
برابر ہے۔ اس کے بعد وہ شخص اللہ تعالیٰ سے جو کام کہ اُس کے
پیش نظر ہے، اُس کی وضاحت چاہے کہ آیا مصلحت کام کرنے
میں ہے یا اُس کو ترک کرنے میں، چنانچہ اس غرض کے لئے
وہ پاک اور طاہر ہو کر بیٹھے اور اُسے پوری دل جمعی نصیب ہو۔
اور اس حالت میں وہ اس بات کا برابر منتظر رہے کہ کام کرتے
یا اُسے ترک کرنے کے بارے میں اُس کے دل کو ان دونوں میں
سے کس جانب انشراح ہوتا ہے۔ الغرض جس شخص کو اللہ تعالیٰ
نے ملائ سافل کے فرشتوں کا یہ کمال عطا فرما دیا، تو اُس نے گویا نماز

اور طہارت کے نور کی حقیقت کو پایا۔ چنانچہ اس شخص کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب کبھی اُسے نماز میں دیر ہو جاتی ہے یا اُس پر ناپاکی اور کثافتوں کا، هجوم ہوتا ہے تو اُس کے حواس میں طرح طرح کے رنگ اور آوازیں بھر جاتی ہیں۔ اور اس سے اُس کے اندر ایک ایسی حالت پیدا ہوتی ہے۔ جس کو وہ سمجھتا اور جانتا ہے اور اس حالت سے اُس کو اذیت ہوتی ہے، اور اُس کی طبیعت اس سے متنفر رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد جب وہ خوب پاک صاف ہوتا ہے، کثرت سے نمازیں پڑھتا ہے۔ اور اپنے جملہ حواس کو ذکر میں لگا دیتا ہے، تو ان اعمال سے اُس کے اندر ایک اور کیفیت پیدا ہوتی ہے اور وہ اس کیفیت کو جانتا اور پہچانتا ہے اور اس کے اچھا ہونے کو محسوس کرتا ہے اور اس کیفیت سے اُس کے دل میں کشائش پیدا ہوتی ہے۔

الغرض جو شخص ناپاکی اور کثافتوں کے ردِ عمل سے نفس میں جو کثافت آمیز حالت پیدا ہوتی ہے اور تیز پاکیزگی اور نماز و ذکر سے نفس میں مسرت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، ان ہردو کو جان جاتا، اور ان میں ہر ایک کو ایک دوسرے سے تیز کر سکتا ہے، تو وہ شخص صحیح معنوں میں مومن ہے اور اس مومن کی صفت ایمان کو "احسان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا اسماء ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ جس شخص نے دعا و ذکر کے ضمن میں کیفیتِ حضور کو جان لیا۔ خواہ وہ اس کیفیتِ حضور کو الفاظِ حروف اور خیالات سے یکسر مجرور کر کے نہ دیکھ سکے، تو اس نے باب "احسان" کا جو اہم جزو تھا، اُس کو پورا کر دیا۔

چھٹا مشاہدہ

۱۱۴۲ھ ماہ صفر کی دسویں تاریخ کو مکہ معظمہ میں میں نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا کہ وہ میرے گھر میں تشریف لائے ہیں۔ اور حضرت حسنؑ کے ہاتھ میں ایک قلم ہے، جس کی کہ نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ آپ نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ وہ مجھے یہ قلم عطا فرمائیں۔ اور فرمایا کہ یہ میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔ اس کے بعد آپ نے قدرے توقف کیا اور فرماتے لگے کہ ذرا ٹھہر جاؤ تاکہ حسینؑ اس قلم کو ٹھیک کر دیں۔ کیونکہ اب یہ قلم ویسا نہیں ہے جیسا کہ پہلے تھا جب کہ حسینؑ نے اس کو ٹھیک کیا تھا۔ چنانچہ حضرت حسینؑ نے اُن سے یہ قلم لیا، اور اُسے ٹھیک کر کے مجھے عطا فرمایا۔ مجھے اس سے بے حد خوشی ہوئی۔ اس کے بعد

ایک چادر لائی گئی، جس میں سبز اور سفید رنگ کی دھاریاں تھیں۔ یہ چادر حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے سامنے رکھی گئی حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ چادر اٹھائی اور فرمایا کہ یہ چادر میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ چادر مجھے اُڑھائی۔ اور میں نے تعظیم و احترام کے خیال سے اُڑھتے کے بجائے اسے اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور اس نعمت کے شکرانے میں محمدؐ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے لگا۔ اس کے بعد ایک بارگی میری آنکھ کھلی گئی *

ساتواں مشاہدہ

یہ مشاہدہ، مشاہدہ عظیم اور تحقیق، تحقیق عالی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ اتارا ہے، اُس پر ایمان لانے کی دو قسمیں ہیں۔ اس کی ایک قسم تو یہ ہے کہ ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح اور روشن دلیل دیکھ کر ایمان لائے۔ اور اس ایمان کی دوسری قسم ایمان بالغیب ہے۔ وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح اور روشن دلیل دیکھ کر ایمان لاتا ہے، اُس کی مثال تو یوں سمجھئے کہ ایک شخص حاکم کو دیکھتا ہے کہ اُس نے اپنے وزیر کو خلعت وزارت پہنائی۔ اور سلطنت کا انتظام اُس کے سپرد کیا۔ اور اُسے لوگوں کی طرف اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ اور اس بات کا اعلان بھی کر دیا کہ میں منڈلاں

جو خود تو اندھا ہے، لیکن ایک آنکھوں والے نے اُس کو سورج کے طلوع ہونے کی خبر دی اور وہ اس پر یقین لے آیا۔ چنانچہ وہ اپنے دل میں اس خبر کے خلاف کوئی دوسرا خیال نہیں پاتا۔ اور نہ اُسے اس خبر کے بارے میں کوئی ادنیٰ سا احتمال باقی رہا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس اندھے آدمی کا یہ یقین کہ سورج طلوع ہو چکا ہے، محض اس بنا پر ہے کہ ایک آنکھوں والے نے اُسے بتایا ہے۔ ان حالات میں اس آدمی کا یقین ظاہر ہے آنکھوں والے کے اعتماد پر منحصر ہوگا۔

افرادِ انسانی میں فردِ کامل وہ ہے جو ایمان کی ان دو تہ قسموں کو اپنے اندر جمع کر لے۔ فردِ کامل کا ذاتِ حق کے ساتھ ایک وہ ربط ہوتا ہے، جس میں کہ وہ کسی توسط کو قبول نہیں کرتا۔ اس نوع کے ربط سے فردِ کامل کو وہ تمام علوم حاصل ہو جاتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر اتارے گئے۔ فردِ کامل ان علوم پر یقین رکھتا ہے اور صرف یقین نہیں، بلکہ فردِ کامل کو ان علوم پر پورا اطمینان بھی ہوتا ہے۔ اور اس بارے میں اُس کے پاس پروردگار کی طرف سے روشن اور واضح دلیل بھی ہوتی ہے۔ ذاتِ حق کے ساتھ فردِ کامل کے اس ربطِ خاص کے یہ معنی نہیں کہ اُس کے پاس اللہ تعالیٰ کا ایک فرمان ہو کہ وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اُس کو اپنے ہاتھوں میں لئے پھرے۔ بلکہ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فردِ

کامل کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔ اور وہ اُس کو ہر ایک سے بچاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ اُس کی اس طرح نگرانی اور حفاظت کرتا ہے کہ خود فرد کامل اس کو محسوس کرتا ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کی اس حفاظت اور نگہداشت سے محروم ہو گیا، تو میرا ٹھکانا جہنم ہے۔ الغرض فرد کامل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس ربط خاص کی بنا پر علوم الہیہ کا محقق بن جاتا ہے۔

فرد کامل کے ایمان کی یہ پہلی خصوصیت ہوتی۔ اس کے علاوہ اُس کے ایمان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اُس تدلی کا بھی حامل ہوتا ہے۔ جو کہ عوام کے لئے ہوتی ہے۔ اور جس کا نقطہ کمال عبارت ہے "ایمان بالغیب" سے اور نیز شریعت کے قواعد و قوانین کی پابندی سے کہ نبی کے محض بتانے سے وہ اُن کی بات پر یقین کر لیتا اور مخبر صادق کی پوری پوری فرمانبرداری اور اُس سے پُر خلوص محبت کرنے لگتا ہے۔ الغرض فرد کامل کی ذات میں یوں تو ایمان کی یہ دو تقسیمیں جمع ہوتی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں تو یہ ہے کہ جب دل پر ایمان کی پہلی قسم کے انوار کی بارش ہوتی ہے تو اُس وقت ایمان کی دوسری قسم کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں خانہ کعبہ میں تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا کہ پہلی قسم کے انوار میرے باطن میں چمک اُٹھے۔ اور میں اُن کی تاثیر سے اپنے آپ سے بے قابو ہو گیا اور مجھ پر ایک حیرت سی چھا گئی۔

اُس وقت میں نے اپنے دل کو ٹھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اُس سے ایمان بالغیب مفقود ہے۔ میں نے پھر اپنے دل کی طرف توجہ کی اور اُس میں دوبارہ ایمان بالغیب کو تلاش کیا، لیکن اب بھی میں نے اُسے وہاں نہ پایا۔ اس سے مجھے بڑی حسرت ہوئی اور میں ایمان بالغیب کے جانے پر افسوس کرنے لگا۔ لیکن ذرا سی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ”ایمان بالغیب“ میرے دل میں موجود ہے۔ چنانچہ اس سے مجھے اطمینان ہو گیا۔ الغرض یہ واقعہ خود مجھ پر گزرا ہے۔ اب تم اس میں غور و خوض کر کے ایمان بالغیب کی اس حیثیت کو سمجھ لو۔

تحقیق عالی۔۔۔ جماعت اولیاء میں سے ایک بڑی تعداد ایسے اولیاء کی بھی ہوتی ہے جن کو الہام کے ذریعے یہ القاء کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں سے شرع کی قید اٹھا دی ہے، اور تمہیں اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہو تو عبادات اور طاعات بجا لاؤ اور چاہو تو بجا نہ لاؤ۔ اس سلسلہ میں والد بزرگوار رضی اللہ عنہ نے اپنے متعلق یہ فرمایا کہ خود مجھے ایک دفعہ یہ الہام ہوا کہ تم سے شرع کی قید اٹھائی جاتی ہے۔ اور تمہیں اب اختیار ہے کہ چاہو تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور چاہو تو نہ کرو۔ لیکن والد

بزرگوار فرماتے ہیں کہ اس الہام کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ التماس کی وہ مجھ سے شریعت کی قیود کو نہ اٹھائے۔ چنانچہ آپ نے اس معاملہ میں کہ اُن کا جی چاہے تو عبادت کریں۔ اور جی نہ چاہے تو نہ کرے، اَوَّل الذکر چیز کو اپنے لئے پسند فرمایا۔ اور اس ضمن میں والد بزرگوار کا مسلک یہ تھا کہ اللہ کی مخلوق میں سے کسی شخص سے بھی اگر وہ عاقل و بالغ ہے، شرع کی قیود نہیں اٹھ سکتیں۔ اور اس معاملہ میں میں نے انہیں دیکھا کہ اس الہام کو بھی کہ "تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو عبادت کرو اور چاہو تو نہ کرو" اور اپنے اس مسلک کو بھی کہ کسی بشر سے کسی حال میں اگر وہ عاقل و بالغ ہے، شرع کی قیود اٹھ نہیں سکتیں، برحق مانتے تھے اور وہ حیران تھے کہ ان دو متضاد باتوں کو باہم کیسے تطبیق دیں۔

والد بزرگوار کی طرح اعم بزرگوار کے متعلق بھی مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ انہیں بھی اپنے آپ سے شرع کی قید کو اٹھا دینے کا الہام ہوا تھا۔ اور اُن سے بھی یہ کہا گیا تھا کہ اگر تم دوزخ کے در سے عبادت کرتے ہو تو جاؤ ہم نے تمہیں دوزخ سے امان دے دی۔ اور اگر تمہاری یہ عبادت جنت کو حاصل کرنے کے لئے ہے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں جنت میں ضرور داخل کریں گے۔ اور اگر اس عبادت سے تمہیں ہماری خوشنودی مطلوب ہے تو جاؤ ہم تم سے ایسے راضی ہوئے کہ اس کے بعد کبھی ناراضگی کی نوبت نہ آئے گی۔

اس کے جواب میں عثم بزرگوار قدس سرہ کا بھی اس معاملہ میں یہی میلان تھا کہ کاملوں سے شریعت کی قیود اٹھ تو جاتی ہیں۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ ان کاملوں کو خود اپنی طرف سے شرع کا مکلف بنا دیتا ہے۔ اور اس صورت میں ان قیود کے متعلق اُن کے اختیار یا عدم اختیار کا کوئی سوال نہیں رہتا۔

اس طرح کے الہام کا یہ واقعہ بہت سے اور اولیاء کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس الہام کی اصل حقیقت یہ ہے کہ قوانین شریعت کو ماننے کے ضمن میں جب کوئی شخص "ایمان بالغیب" سے اُس قسم میں آتا ہے، جہاں کہ روشن اور واضح دلیل کے ذریعہ ان چیزوں کا ایمان حاصل ہوتا ہے تو اُس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ شرعی قیود کو کہیں باہر سے اپنے اوپر عائد کی ہوئی نہیں جانتا، بلکہ وہ اپنے اندر شریعت کی مقرر کی ہوئی طاعات و عبادات کی ضرورت کو اس طرح محسوس کرتا ہے، جیسے کوئی شخص بھوک اور پیاس کو محسوس کرے۔ اور اس میں ان طاعات و عبادات کو ترک کرنے کی استطاعت نہیں رہتی۔ چنانچہ اس حالت میں اُس شخص کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ طاعات و عبادات اُس پر شریعت کی طرف سے عائد کی گئی ہیں یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ چیزیں خود اُس شخص کی اصل جبلت میں اس طرح داخل ہو جاتی ہیں کہ گویا وہ ان چیزوں کو اپنی جبلت میں ساتھ لے کر پیدا ہوا تھا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ

یہ حقیقت اس شخص پر کھلے طور پر منکشف ہو جائے یا اُس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجمالی طور پر یہ خیال ڈال دیا جائے۔ بہر حال اُس شخص پر اس حقیقت کے انکشاف کا کوئی بھی ذریعہ ہو، اصل مقصود تو صرف اتنا ہے کہ اُس شخص کے اندر اجمالی طور پر یا تفصیل سے یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس سے شریعت کی قید اٹھادی ہے۔ اور اس کے بعد خود اُس نے اپنی مرضی اور اختیار سے شریعت کے قواعد کو اچھے اوپر عائد کر لیا ہے۔ ✓

میرے نزدیک اس طرح کے الہامات میں ضرورت ہوتی ہے کہ خوابوں کی طرح اُن کی تعبیر کی جائے۔ اور ان کی تعبیر کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس مقام کو حاصل کر لے، جس کا اقتضاء یہ الہامات ہیں۔ اور اس مسئلہ میں اگر تم مجھ سے اصل حقیقت پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے کہ اس طرح کے جو بھی الہامات ہوتے ہیں، وہ سب اپنی جگہ صحیح اور برحق ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک قسم تو اُن الہامات کی ہوتی ہے، جن کا خاص زبان اور خاص مقام سے فیضان ہوتا ہے۔ اور بعض الہامات نتیجہ ہوتے ہیں اُس قضا و قدر کا جو ہر زمانے پر نافذ ہے۔ جہاں تک پہلی قسم کے الہامات کا تعلق ہے اُنکا دائرہ اثر محدود ہوتا ہے کہ ایک مقام پر انکی اطاعت ضروری ہوتی ہے اور دوسرے مقام پر نہیں لیکن اس قبیل کے الہامات کی جو دوسری قسم ہے، انکی بہر حال میں اطاعت ضروری ہے۔ اور نیز اس قسم کے بعض الہامات میں تعبیر کی ضرورت

پڑتی ہے ، اور بعض میں نہیں ۔ اور ان الہامات کی تعبیر وہ آدمی
 کرے جو تمام المعرفت ہو ۔ ان معاملات میں اب تم خوب غور و
 تدبیر کرو *

اکھواں مشاہدہ

تحقیق عالی اور متعدد مشاہدے — تمہیں معلوم ہونا چاہئے
کہ انسانوں کی رُوحیں جب اپنے بدلوں سے جدا ہوتی ہیں، تو اس
سے ایک تو اُن کی بھی قوت میں قدرے کمی ہو جاتی ہے اور دوسرے
اُن کی ملکی قوت — اور ترقی کر جاتی ہے۔ اور نیز ان رُوحوں
نے اس دُنیا کی زندگی میں جو کمالات حاصل کئے تھے، وہ کمالات
ان رُوحوں کے ساتھ بدن چھوڑنے کے بعد مستقل طور پر ملحق ہو جاتے
ہیں۔ ان کمالات کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو "نورِ اعمال"
کا کمال ہے۔ اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ انسان کی ملکی قوت جب
اُس کی بھی قوت کو مجبور کرتی ہے کہ وہ نیک کام کرنے تو بھی
قوت اس کا حکم مانگتی ہے۔ اور اپنے آپ کو وہ بالکل یہ اُس کے

تصرف میں دے دیتی ہے۔ اس سے ایک تو قوت ملکیہ میں ایک قسم کا بسط اور انشراح پیدا ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے اس کی وجہ سے خود قوت بھیہمی بھی ملکی قوت کے مناسب کوئی ہیئت اختیار کر لیتی ہے۔ قوت بھیہمی کا ملکی قوت کے رنگ میں اس طرح رنگا جانا دراصل نقطہ کمال ہوتا ہے اس قوت بھیہمی کا، الغرض اس طرح جب بار بار ہوتا ہے اور بھیہمی قوت پیہمی ملکی قوت کے رنگ میں رنگی جاتی ہے تو اس سے انسان کی ملکی قوت اور بھیہمی قوت کے اصل جوہر میں "نور اعمال" کا یہ کمال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور آگے چل کر یہ کمال نفس کے لئے بمنزلہ ایک عادت اور جبلت کے بن جاتا ہے۔ جو کسی حال میں بھی اُس سے الگ نہیں ہوتا۔

ان کمالات کی دوسری قسم "نور رحمت" ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جب کوئی ایسا کام کرتا ہے، جس سے کہ اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اُس شخص پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس کام سے یا تو تمام انسانوں کی تکلیف دور ہوئی، یا وہ کام شیب بنا اللہ تعالیٰ کے کسی ارادہ کی تکمیل کا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ دنیا میں ہدایت و نور کی اشاعت کرنا چاہتا تھا۔ اس شخص نے جو کام کیا، تو اس کا یہ کام ہدایت و نور کی اس تہذیبی الہی کے طور کا ذریعہ بن گیا یا ایسا ہوا کہ اس شخص کا خود اس تہذیبی الہی کے ضمن میں شمار ہونے لگا اور وہ اس طرح کہ شخص اس تہذیبی کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے اپنی ساری بہت اُدھر لگا دی۔ یہاں تک کہ خود اس تہذیبی

کا ایک حصہ بن گیا۔ الغرض نیک کام کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رحمت نازل ہوتی ہے، اس سلسلہ میں اوپر جو تین صورتیں بیان ہوئیں، ان سب کے یکجا ہونے یا ان میں سے کسی ایک کے وقوع پذیر ہونے سے نیک کام کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی رحمت گھیر لیتی ہے۔ اور اس سے اُس شخص کے نفس کو ملکی سرور و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ”نور رحمت“ کے فیضان کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص جب اللہ تعالیٰ کے جلال و جبروت کا ذکر کرتا ہے۔ اب یہ ذکر الفاظ سے ہو یا محض خیال سے جیسے کہ قلب کے اشتغال ہوتے ہیں، یا یہ شخص عالم جبروت کو اپنے خیال میں منعکس کرنے کی کوشش کرے۔ اور ہمارے زمانے کے اکثر لوگ اس کو ”یادداشت“ کا نام دیتے ہیں۔ قصہ مختصر، اس ذکر سے نفس کے اندر ایک بسیط ملکہ اور جبروتی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بہت سے لوگ اس کو ”نور یادداشت“ کہتے ہیں۔

ان کمالات میں سے ایک کمال ”نور احوال“ کا ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص کے نفس پر جب خوف، اُمید، بےقراری، شوق، اُفس، ہیبت، تعظیم و احترام اور اس طرح کی کیفیات برابر وارد ہوتی رہتی ہیں، تو ان سے اُس شخص کے نفس میں صفائی اور رقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جب اس شخص پر موت آتی ہے اور اُس کا نفس جسم سے جدا ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس

حالت میں یہ نفس تغیر پذیر ارادوں میں گھرنے جائے تو اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنة کے رنگ اور ان کے انوار سرایت کر جاتے ہیں۔ اور اس سے اُس نفس میں بڑی لطافتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ہر لطافت اُس نفس کے لئے مسرت و انبساط کا باعث بنتی ہے۔ غرضیکہ اکثر ارواح کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان انوار سے نفس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ جیسے ایک آئینہ ہے جو دھوپ میں کھا ہوا ہے اور اُس پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی ہیں، جن کی وجہ سے وہ سرتاپا نور بن گیا ہے۔ یا جیسے کوئی حوض ہو جو پانی سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ اور دو پہر کا وقت ہو۔ اور اُس حوض پر سورج اپنی پوری تابانی سے چمک رہا ہو۔ اور اس طرح پانی نے سورج کو اپنے دامن میں لے لیا ہو۔ اب اگر تم یہ بات جو ہم ابھی بتا رہے ہیں، سمجھ گئے ہو، اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، اُس کی حقیقت کو جان گئے ہو تو پھر اس صحن میں میں تم سے ایک اور بات کہتا ہوں، ہوا یہ کہ جب میں نے غزوہ بدر کے شہداء کی زیارت کی اور ان کی قبروں پر کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ان کی قبروں سے یکبارگی ایک نور روشن ہوا اور وہ ہماری طرف بڑھا۔ شروع میں تو میں یہ سمجھا کہ یہ نور ان انوار میں سے ہے، جن کو صرف ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد میں اس نور کے معاملے میں کچھ تردد میں پڑ گیا۔ اور میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ آیا میں اس نور کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں یا اسے

روح کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ چنانچہ پھر میں نے اس پر غور کیا اور سوچتے لگا کہ آخر اس نور کی نوعیت کیا ہے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ یہ نور انوار رحمت میں سے ہے۔ بعد ازاں جب میں نے مقام صفراء میں اس قبر کی زیارت کی جو حضرت ابوذر غفاریؓ کی بتائی جاتی ہے (اس کی اصل حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے) الغرض جب میں اس قبر کے پاس بیٹھا۔ اور میں نے حضرت ابوذر غفاریؓ کی روح کی طرف توجہ کی تو ان کی روح میرے سامنے تیسری رات کے چاند کی طرح ظاہر ہوئی۔ میں نے جب اس میں مزید غور کیا تو مجھ پر یہ کھلا کہ حضرت ابوذرؓ کی روح کا یہ نور، "نور اعمال" اور "نور رحمت" دونوں پر جامع ہے۔ البتہ اس میں "نور رحمت" "نور اعمال" پر غالب ہے۔

اس سے پہلے میں مکہ معظمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ولادت پر حاضر ہوا تھا۔ یہ دن آپؐ کی ولادت مبارک کا دن تھا، اور لوگ وہاں جمع تھے اور آپ پر درود و سلام بھیج رہے تھے اور آپؐ کی ولادت پر آپؐ کی بعثت سے پہلے جو معجزات خوارق ظاہر ہوئے تھے ان کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس موقع پر یکبارگی انوار روشن ہوئے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ ان انوار کو میں نے جسم کی آنکھ سے دیکھا یا ان کا روح کی آنکھ سے مشاہدہ کیا۔ بس یہ حال اس معاملہ کو صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ جسم کی آنکھ اور روح کی آنکھ کے بین بین کون سی حق تھی جس سے میں نے ان انوار کو دیکھا۔ پھر میں نے ان انوار پر مزید توجہ کی تو مجھے ان فرشتوں کا فیض اثر نظر آیا، جو اس قسم کے مقامات اور اس نوع کی مجالس پر ٹوکل ہوتے ہیں الغرض اس مقام پر میں نے دیکھا کہ فرشتوں کے انوار بھی انوار رحمت سے غلط ملط ہیں۔

نواں مشاہدہ

میں مدینہ منورہ میں داخل ہوا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روحہ مقدسہ کی زیارت کی، تو میں نے آپ کی روح اقدس کو ظاہر اور عیاں دیکھا۔ اور عالم ارواح میں نہیں، بلکہ عالم محسوسات سے قریب جو عالم مثال ہے، میں نے اُس میں آپ کی روح کو دیکھا۔ چنانچہ اُس وقت میں سمجھا کہ عوام مسلمانوں کا یہ جو کہنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں تشریف لاتے ہیں، اور نمازیوں کے امام بنتے ہیں۔ اور اسی قبیل کی جو وہ اور باتیں کہتے ہیں، وہ سب اسی نازک مسئلہ کے متعلق ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عامۃ الناس کی زبانوں سے جو کچھ نکلتا ہے، وہ دراصل نتیجہ ہوتا ہے، اُس علم کا جو اُن کی روحوں پر ارتقاء ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اُن

کے اس علم کی دو صورتیں ہو جاتی ہیں۔ یا تو وہ اس علم کی جو اُن کی رُوحوں پر القاء کیا جاتا ہے۔ اصل حقیقت کو پا لیتے ہیں۔ یا وہ محض اُس کی ظاہری شکل ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ پھر اُن میں سے ایک اس کی دوسرے کو خیر دیتا ہے، اور دوسرا اجمالی طور پر اس بات کو سمجھتا ہے اور اُس کو قبول کر لیتا ہے۔ پھر وہ اپنی اس سمجھی ہوئی بات کو تیسرے کو بتاتا ہے۔ تیسرا اس کو سُنتا ہے اور وہ کسی اور نقطہ خیال سے اس کو مان لیتا ہے۔ پھر یہ چوتھے آدمی کو بتاتا ہے۔ اور چوتھا آدمی یہ بات سُن کر اُس کو اپنے خیال پر ڈھالتا ہے اور پانچویں کو بتاتا ہے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ آگے چلتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ بات لوگوں میں مشہور ہو جاتی ہے۔ اور بہت سے لوگ اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ضمن میں لوگوں کا ایک بات پر متفق ہو جانا بے کار محض نہیں ہوتا۔ اور نیز عوام میں جو باتیں زبان زد اور مشہور ہو جاتیں، اُن کی تحقیق نہیں کرنی چاہئے بلکہ اس سلسلہ میں ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ جو کچھ عوام کی زبانوں پر ہو، اُنم اُس کی جو اصل حقیقت ہو، اُس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔

بعد ازاں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند مرتبہ اور مقدس قبر کی طرف بار بار توجہ کی تو آپ میرے سامنے لطیف و ر لطیف صورت میں ظہور فرما ہوئے۔ چنانچہ کبھی آپ مجھ و عظمت و جلال کی صورت میں ظہور فرماتے اور کبھی جذب و شوق اور اُنس و انشراح کی

صورت میں نظر آتے۔ اور کبھی اس طرح کی جاری و ساری صورت میں ظاہر ہوتے کہ مجھے خیال ہوتا کہ تمام کی تمام فضا آپ کی رُوح سے بھری ہوئی ہے۔ اور آپ کی رُوح اس فضا میں تیز ہوا کی طرح یوں حرکت کر رہی ہے کہ دیکھنے والا اس میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسری لطافتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ نیز میں نے یہ محسوس کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار مجھے اپنی وہ صورت مبارک دکھاتے ہیں، جو آپ کی اس دنیا کی زندگی میں تھی۔ اور آپ مجھے اپنی یہ صورت اس حالت میں دکھا رہے تھے جب کہ میری تمام توجہ آپ کی رُوحانیت کی طرف تھی، نہ کہ آپ کی جسمانیت کی طرف۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کی رُوح جسمانی شکل میں صورت پذیر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف آپ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے: ”بے شک انبیاء کو اوروں کی طرح موت نہیں آتی۔ وہ اپنی قبروں میں نمازیں پڑھتے اور حج کرتے ہیں۔ اور انہیں وہاں زندگی نصیب ہوتی ہے۔۔۔۔۔ الخ“۔ الغرض اس حالت میں میں نے آپ پر درود بھیجا تو آپ نے مسرت کا اظہار فرمایا۔ اور مجھ سے خوش ہوئے اور میرے سامنے ظہور فرمایا۔ اور آپ کا اس طرح لوگوں کے سامنے آنا، اور آپ کی رُوح کا فضا میں جاری و ساری ہونا بیشک نتیجہ ہے آپ کی اس خصوصیت کا کہ آپ سب جہانوں کے لئے باعث رحمت بن کر مبعوث ہوئے تھے۔

لے اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ سورۃ الانبیاء ۱۰۷

دسواں مشاہدہ

مدینہ منورہ میں پہنچنے کے تیسرے دن بعد پھر میں روضہ اقدس پر حاضر ہوا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں ساتھیوں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو سلام کیا۔ اور میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو فیضان فرمایا تھا، اُس سے مجھے بھی مستفید فرمائیے۔ میں خیر و برکت کی امید لے کر آپ کے حضور میں آیا ہوں۔ اور آپ کی ذات رحمت اللعالمین ہے۔ میں نے اتنا عرض کیا تھا کہ آپ حالت انبساط میں میری طرف اس طرح ملتفت ہوئے کہ میں یوں سمجھا کہ گویا آپ نے اپنی چادر میں مجھے لے لیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر خوب بھینچا۔ اور آپ میرے سامنے روٹنا ہوئے۔ اور مجھے اسرار و رموز

سے آگاہ فرمایا۔ اور نیز خود اپنی ذات اقدس کی حقیقت مجھے بتائی۔ اور اس ضمن میں آپؐ نے اجمالی طور پر مجھے بہت بڑی مدد دی۔ چنانچہ آپؐ نے مجھے بتایا کہ میں کس طرح اپنی ضرورتوں میں آپؐ کی ذات سے استمداد کروں۔ اور آپؐ نے مجھے اُس کیفیت سے بھی آگاہ فرمایا۔ کہ آپؐ کس طرح اُن لوگوں کو جو آپؐ پر درود بھیجتے ہیں، جواب دیتے ہیں۔ اور جو لوگ آپؐ کی مدح و ثنا کرتے اور آپؐ کی جناب میں عجز و نیاز مندی کرتے ہیں، اُن سے آپؐ کس طرح خوش ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کو دیکھا کہ آپؐ اپنے جوہرِ روح، اپنی طبیعت، اپنی فطرت اور جبلت میں سرتاسر منظر بن گئے ہیں اُس عظیم الشان تدریٰ کا، جو کہ تمام بنی نوع بشر پر حاوی ہے۔ اور میں نے دیکھا کہ اس حالت میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے کہ ظاہر اور منظر یعنی ظاہر ہونے والی چیز اور جس چیز میں کہ اُس کا اظہار ہو رہا ہے، ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ چنانچہ یہی وہ تدریٰ ہے، جسے صوفیاء نے "حقیقتِ محمدیہ" کا نام دیا ہے۔ اور اس کو وہ "قطبِ الاقطاب" اور "نبی الانبیاء" کا بھی نام دیتے ہیں۔ غرضیکہ یہ "حقیقتِ محمدیہ" عبارت ہے اللہ تعالیٰ کی اس تدریٰ کے منظرِ بشری میں ظہور سے۔ چنانچہ جب کبھی عالمِ مثال میں اس تدریٰ کی حقیقت متمثل ہوتی ہے تاکہ وہ عالمِ مثال سے بنی نوع انسان کے لئے عالمِ اجمام میں ظاہر ہو تو حقیقتِ محمدیہ کے اس بروز کو قطب یا نبی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہوتا یہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کوئی شخص لوگوں کی ہدایت کے لئے
 مبعوث ہوتا ہے تو حقیقت محمدیہؐ کا اُس شخص کی ذات کے ساتھ اتصال
 ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ اس زندگی میں اپنا فرض پورا کر لیتا ہے اور
 لوگوں سے منہ موڑ کر اس دُنیا سے اپنے رب کی رحمت کی طرف لوٹتا
 ہے تو یہ حقیقت محمدیہؐ اُس کی ذات سے الگ ہو جاتی ہے۔ لیکن
 ان سب کے برعکس جہاں تک ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تعلق
 ہے، یہ حقیقت محمدیہؐ اُن کی اصل بعثت میں داخل ہے۔ اور یہ اس
 لئے تاکہ آپؐ قیامت کے دن تمام بنی نوع انسان کے لئے شاہد
 ہوں۔ اور نیز اس لئے کہ آپؐ ذریعہ بنیں اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم
 کا اُس کے فرمانبردار بندوں کی طرف، اور وہ اس طرح کہ آپؐ قیامت
 کے دن اُن سب کی شفاعت کریں۔ الغرض یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بنا
 پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے عظیم الشان ہمت کا
 ظہور عمل میں آیا۔ چنانچہ آپؐ کی اس ہمت کا تقاضہ یہ ہوا کہ تمام کے
 تمام انسانوں کو آپؐ کی رحمت اپنے دامن میں لے لے۔ اور ان سب
 کی ملکی قوتوں کو بھی قوتوں سے امان دلا دے۔ اور اس طرح آپؐ کا
 وجود تمام اقوام کے لئے اللہ کی رحمت کا واسطہ بن جائے۔ اس کی
 مثال یوں سمجھئے کہ قدرت کو نسلوں کی بقا اور تسلسل منظور تھا تو اس کے

لے یہ اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف "وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ
 أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَؤُلَاءِ"

لئے اُس نے انسانوں میں قوت تناسل پیدا کر دی۔ یا جیسے ہر نوع کو اپنے آپ کو خطرات سے بچانے کی ضرورت تھی تو اُس کے لئے قدرت کی طرف سے ہر نوع میں مدافعت کی کوئی نہ کوئی چیز پیدا کر دی گئی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامہ کو بھی ایک واسطہ کی ضرورت تھی جس کے ذریعہ وہ تمام افراد انسانی کو مستفید کر سکتی، چنانچہ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس یہ واسطہ بنی۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپؐ موت کے بعد بھی ہمیشہ خلقت کی طرف متوجہ رہتے ہیں، اور سب کا خیال رکھتے ہیں۔ اور اسی بنا پر آپؐ ہی کی ذات تمام انبیاء سے زیادہ اس امر کی مستحق تھی کہ وہ اس تدلی الہی کا جو کہ تمام نوع بشر پر حاوی ہے، اور جسے صوفیاء نے "حقیقت محمدیہ" کا نام دیا ہے، مستقر بنی۔ اور اس تدلی الہی کی مثالی شکل جو عالم مثال میں قائم ہے، آپؐ کی ذات سے اس طرح متصل ہوتی کہ ظاہر اور مظهر میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا، گویا کہ ظاہر ہی عین مظهر ہے۔ اور دونوں اس طرح مل جاتے کہ ان کو کسی طرح جدا نہ کیا جاسکتا۔ چنانچہ اس مشہور شعر کے ایک معنی یہی ہیں :-

أَفَلَتْ تَمُوسُ الْأَوَّلِينَ وَشَمْسُنَا

أَبَدًا عَلَى أَفْقِ الْعَالِي لَا تَقْرُبُ

رہیلوں کے سورج کبھی کے غروب ہو گئے۔ لیکن ہمارا سورج ایسا

ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ افقِ عظمت پر تاباں ہے گا اور کبھی نہیں ڈوبے گا

الغرض "حقیقت محمدیہ" کے ساتھ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس کا اتحاد و اتصال میں نے اپنی روح کی آنکھ سے دیکھا۔ اور اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ گیا۔

علاوہ ازیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ■ اُسی ایک ہی حالت پر قائم ہیں۔ اور آپ کی اُس حالت میں نہ تو کوئی نیا ارادہ نکل ہوتا ہے۔ اور نہ کوئی اس میں رخنہ ڈالتا ہے۔ ہاں اس ضمن میں یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب آپ خلقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو آپ اُن سے اتنا قریب ہو جاتے ہیں کہ اگر انسان اپنی پوری ہمت سے آپ کی طرف توجہ کرے تو آپ اس کی مصیبت میں مدد کرتے ہیں۔ اور اس پر اپنی طرف سے خیر و برکت کا فیضان فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس حالت میں آپ کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ کی ذات اقدس نئے نئے ارادوں کا مورد بن رہی ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے کہ ایک شخص ہے جو دادخواہوں اور محتاجوں کی مدد میں کوشاں ہے، ظاہر ہے اُن کی مدد کرتے وقت اُس شخص کے دل میں ضرور نئے نئے ارادے وقوع پذیر ہوں گے۔

اس حالت میں میں نے اس بارے میں سوچ۔ بچار کی اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ آپ مذاہب فقہ میں سے کس خاص مذہب کی طرف رجحان رکھتے ہیں تاکہ میں فقہ کے اُس مذہب کی اطاعت کروں۔ اور اُس کو مضبوطی سے پکڑوں۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے نزدیک فقہ کے یہ

سارے کے سارے مذاہب یکساں ہیں۔ اور اس حالت میں جس میں کہ آپؐ اس وقت ہیں، آپؐ کی رُوح کے لئے یہ مناسب بھی نہیں ہے کہ وہ مذاہب فقہ کے بارے میں ان فروعات میں پڑے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپؐ کی رُوح کے جوہر میں تو ان تمام فقہی فروعات کا جو بنیادی علم ہے، وہ موجود ہے۔ اور اس بنیادی علم سے مراد یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے متعلق اللہ تعالیٰ کی اُس عنایت اور اہتمام کو جان لیا جائے جس کے پیش نظر انسانوں کے اخلاق و اعمال اور اور اُن کی اصلاح ہے۔ الغرض فقہ کے تمام قوانین کی اصل بنیاد تو یہ عنایت الہی ہے۔ اس کے بعد جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے، اُسی کے مطابق اس اصل سے نئی نئی شاخیں اور الگ الگ صورتیں بنتی چلی جاتی ہیں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح کے اصل جوہر میں فقہ کا یہ بنیادی علم موجود ہے، اس لئے ضروری ہے کہ آپؐ کے نزدیک فقہ کے سارے مذاہب برابر ہوں۔ اور آپؐ کی نظر میں ان میں سے ایک کو دوسرے پر کوئی امتیاز نہ ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ فقہ کے مذاہب گو ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن جہاں تک فقہ کے ضمن میں دین اسلام کے ضروری اصول و مبادی کا تعلق ہے، مذاہب فقہ میں سے ہر مذہب میں وہ موجود ہیں۔ مزید برآں اگر کوئی شخص فقہ کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کا بھی تابع نہ ہو تو اس کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ آپؐ اُس شخص سے ناراض ہوں۔ ہاں اس

سلسلہ میں اگر کوئی ایسی بات ہو جس سے ملت میں اختلاف ہو یا اس بنا پر لوگ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں۔ اور ان میں ناچاقی پیدا ہو جائے تو ظاہر ہے اس سے بڑھ کر آپ کی ناراضگی کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

مذہب فقہ کی طرح تصوف کے تمام طریقوں کو بھی میں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک یکساں پایا۔ لیکن اس مقام پر ایک نکتے کے بارے میں متنبہ کر دینا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک آدمی کو یہ خیال گزرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں مذہب فقہ کو پسند فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ سمجھتا ہے کہ وہی مذہب فقہ برحق و مطلوب من اللہ ہے۔ اب اگر اس شخص سے فقہ کے اس مذہب کے متعلق کوئی کوتاہی ہو جاتی ہے، تو اُس کے دل میں یہ یقین بیٹھ جاتا ہے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے حق میں تقصیر کی ہے۔ اس کے بعد جب یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کھڑا ہوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اُس کے اور آپ کے درمیان ایک بند دروازہ حائل ہے۔ چنانچہ وہ سمجھتا ہے کہ آپ کا یہ عتاب عجب ہے میری اس کوتاہی کا جو فلاں مذہب فقہ کے متعلق مجھ سے ہوئی۔ لیکن واقعہ یوں نہیں ہے۔ اس معاملہ میں اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اس حالت میں آتا ہے کہ اس کا دل مخالفت و سرکشی سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور چونکہ خود

اُس کے اندر قبولیت کی استعداد نہیں ہوتی، اس لئے یہ اپنے سامنے فیض کا دروازہ بند پاتا ہے۔

اسی طرح بعض دفعہ ایک آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ فقہ کے یہ جو مدقن اور مروج مذاہب ہیں، اُن سے خروج کے معنی یہ ہیں کہ گویا آدمی شریعت کی حدود سے خارج ہو گیا۔ اور اُس نے احکام الہی کی اطاعت چھوڑ دی۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ سمجھنے لگتا ہے کہ فقہ کے ان مذاہب کے علاوہ شریعت کا اور کوئی قابل اعتماد مسلک ہی نہیں ہے۔ اسی لئے اُس کے نزدیک ان مذاہب فقہ سے خروج اطاعت خداوندی سے سرتاپی کے مرادف یا اُس کے لوازم میں سے بن جاتا ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح کرنے سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عتاب کا مستوجب ہو جاتا ہے۔ الغرض یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے شبہے ہیں، جو اس سلسلہ میں طالب کو پیش آتے ہیں۔

پہلے ایک اور مسئلے کے متعلق بھی متنبہ کر دینا ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ جب مدینہ منورہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اور وہ مدینہ والوں کو ایسے اعمال کرتے دیکھتے ہیں، جو اُن کے نزدیک یا تو وہ فی نفسہ اچھے نہیں ہوتے یا وہ انہیں اچھے نہیں لگتے، تو اس بنا پر یہ لوگ مدینہ منورہ کے باشندوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں، اور ان کی طرف سے ان لوگوں کے دلوں میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ روضہ مقدسہ پر حاضر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اُدھر توجہ

کرتے ہیں، اور اُن کے دلوں کی صفائی و طہارت کا وقت آتا ہے تو اُس کیفیت کی وجہ سے جو اُن کے دلوں میں پہلے سے راسخ ہو چکا ہوتا ہے، اُن کے اندر تلخی پیدا ہو جاتی ہے اور بجائے اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اُن کے دل صاف و طاہر ہوں، اُلٹا اُن میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضروری اور اشد ضروری ہے کہ تم اس طرح کی باتوں سے بچو۔ اور بار بار بچو تاکہ کہیں یہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نورِ کامل سے استفادہ کرنے کی راہ میں تمہارے لئے روک نہ بن جائیں۔ (✓)

علاوہ ازیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ "عظمت" کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اور "جبروت" سے مشابہ ہیں۔ اور آپ کی ذات اقدس حال ہے بہت سی لطافتوں کی۔ اور یہ لطافتیں ایک تو خود آپ کے ذاتی کمالات میں سے ہیں۔ اور دوسرے جو مختلف استعدادوں کے لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو اُن کی ان استعدادوں کے اعتبار سے بھی آپ میں یہ لطافتیں موجود ہیں۔ چنانچہ اس مجلس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے اپنی اجمالی مدد سے سرفراز فرمایا اور یہ اجمالی مدد عبارت تھی مقامِ مجددیت، وصایت اور قطبیت ارشاد یہ سے، یعنی آپ نے مجھے ان مناصب سے نوازا۔ اور نیز مجھے شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور امامت بخشی۔ اور تصوف میں میرا جو مسلک ہے۔ اور فقہ میں میرا جو مذہب ہے، ہر دو کو اہل اور فرخ دو لہذا اختیار ہے۔

لے دوسرے صفحہ پر

راہِ راست پر بتایا۔ لیکن سب کے لئے نہیں بلکہ صرف مخصوص لوگوں کے لئے جن کی فطرت میں تحقیق کا مادہ ہے۔ لیکن اس میں بھی شرط یہ رکھی کہ اس مسلک تصوف اور مذہب فقہی کا اتباع باہمی اختلاف اور آپس کی لڑائی جھگڑے کا باعث نہ بنے۔ چنانچہ جو شخص بھی فقہ میں اصل اور فرع کے لحاظ سے اور تصوف میں سلوک کے اعتبار سے ہمارے مذہب فقہی اور مسلک تصوف کو اختیار کرے، اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں مندرجہ بالا نکتہ پر اپنی نگاہ رکھے۔

اس کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ آپ سے مبادئی وجود کے مسائل، جوہر کے مراتب اور فنا و بقا کے مقامات کے بارے میں سوال کروں۔ لیکن اُس وقت میں نے دیکھا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کی اُس تدلی کی طرف پوری طرح متوجہ ہیں، جس تدلی کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ چنانچہ جب کبھی میں آپ سے ان مسائل کے متعلق پوچھنے کا ارادہ کرتا تو میں خود بھی تدلی مذکور کی طرف آپ کی توجہ کی اسی کیفیت میں کھو جاتا۔ اور یہ چیز آپ سے سوال کرنے میں مانع آتی۔ اس ضمن میں آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میں آپ کے سامنے بیٹھوں اور اپنے رب سے ان مسائل کے بارے میں اپنی اُس زبان میں سوال

لے ذات حق کا پہلا مرتبہ ذات بحت کا ہے۔ اسی مرتبے میں ذات حق ہر اسم و رسم و لغت و وصف سے منزہ ہے۔ اس کا نام عالم لاہوت ہے۔ جب اُس ذات نے اسم و رسم و لغت و وصف پایا تو اس کا نام وحدت ہوا۔ اس کو عالم جبروت کہتے ہیں۔ اور وہی عالم کو حقیقت محمدیہ کا نام دیا۔

کروں جو زبان کہ ماءِ اعلیٰ کے مقابل میں ہوتی ہے۔ میں اس حالت میں
 تھا کہ آپ کے نور نے مجھے پوری طرح سے گھیر لیا۔ پھر میں نے سوال
 کرنا چاہا تو آپ کے نور نے پھر مجھے گھیر لیا۔ اس کے بعد پھر میں نے
 سوال کرنا چاہا تو پھر آپ کے نور نے مجھے حلقہ میں لے لیا۔ الغرض یہ
 سلسلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ میرا سوالی اور آپ کی ہمت عالی
 دونوں مل گئے۔ اور اس طرح تیرنشانے پر جا کر لگا۔ چنانچہ میں نے آپ
 کو دیکھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی تدلی مذکور کے محل اور طرف بھی ہیں۔ اور
 اس کے ساتھ ساتھ آپ اپنی مبارک صورت کو محفوظ رکھے ہوئے ایک
 ہی حالت پر قائم بھی ہیں اور خلقت کی طرف متوجہ بھی ہیں۔ اور آپ
 "عظمت" کا لباس بھی پہنے ہوئے ہیں۔ اور آپ کی ذات اقدس
 میں قبولیت، اور جذب و الفت کی اتنی فراوانی ہے کہ نہ اُس کا
 حساب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اُس کی آخری حد کا ادراک کر سکتا ہے۔
 میں نے دیکھا کہ جب کوئی شخص اپنی پوری ہمت کے ساتھ آپ کی
 ذات اقدس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ یہ شخص
 عالی ہمت ہی ہو۔ بہر حال کوئی شخص ہو، جس کے سینے میں دل ہے،
 اور وہ کسی چیز کا اس طرح شوق رکھ سکے کہ وہ اُس کی طرف پورے
 عزم و ارادہ اور شوق و رغبت سے متوجہ ہو جائے۔ الغرض یہ شخص
 جب اپنی پوری ہمت سے آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو آپ بھی
 اُس کی طرف تدلی فرماتے ہیں۔ اور آپ کی تدلی یہ ہے کہ آپ اُس کے

سلام اور اُس کے درودوں کا جواب دیتے ہیں۔ یعنی یہ شخص جب اس طرح آپ کی طرف توجہ کرتا ہے تو اُس کی اس توجہ سے آپ میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو مشابہ ہوتی ہے تجدد پذیر ارادے کے۔ یہاں میں تمہیں ایک بہت بڑے راز سے آگاہ کرتا ہوں۔ اور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آپ کے نسمہ مبارک کو اپنی اس تدلی کا محل اور ظرف بنایا، تو اُس میں حکمت یہ تھی کہ اس طرح ذات حق دُنیا والوں سے اور خاص طور پر اُن لوگوں سے جو پستی میں ہیں، بہت زیادہ قریب ہو جائے۔ اور یہ اُس وقت تک ممکن نہ تھا۔ جب تک کہ عنایت الہی کسی انسانی نسمے کو اپنا واسطہ نہ بناتی۔ چنانچہ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسمہ مبارک تدلی الہی کا محل و ظرف بنا۔ اس ضمن میں میں نے دیکھا کہ جب کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتا ہے یا آپ کی مدح و ثنا کرتا ہے تو آپ اس بات سے بہت مسرور ہوتے ہیں۔ اور نیز جس طرح مشائخ صوفیاء کے فیض صحبت کا اہل مجلس پر اثر ہوتا ہے، اسی طرح میں نے آپ کی ذات اقدس کو بھی ظاہر و عیاں دیکھا۔ اور آپ کو توجہ کرنے والوں پر فیضان فرماتے پایا۔ میں اس وقت آپ کے روبرو حاضر تھا۔ اور جو کچھ میں تمہیں بتا رہا ہوں، یہ میرے مشاہدات میں سے ایک مشاہدہ ہے۔ میرا بھائی محمد عاشق جو اس سفر میں میرا رفیق ہے، وہ اس عجیب راز کو خوب سمجھ گیا ہے۔ اور مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ

اُس کا اس عجیب راز سے واقف ہوتا محض فیضان الہی کا عطیہ ہے۔
 اور عجیب راز یہ ہے کہ جملہ کمالات میں سے حج ایک بہت بڑا کمال ہے۔
 چنانچہ حج کے بہت بڑا کمال ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ حج میں حاجیوں کے
 دل مسرت و سرور سے بھر جاتے ہیں۔ اس امر کی تفصیل یہ ہے کہ اس
 میں شک نہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا قُرب بمنزلہ ایک کمال کے ہے۔
 اب یوں ہوا کہ جب ذات حق نے خلقت کی طرف تدلی فرمائی۔ اور خانہ
 کعبہ کو اُس نے اپنی اس تدلی کے شعائر میں سے ایک شعار بتایا، تو اس
 طرح بلحاظ مسافت کے خانہ کعبہ کا قُرب اللہ تعالیٰ کا قُرب قرار دیا گیا۔
 بات دراصل یہ ہے کہ اللہ سے قُرب حاصل کرنے کی کئی صورتیں ہیں۔
 چنانچہ اللہ تک مسافت طے کر کے پہنچنے کا جو راستہ ہے، اُس کی
 آخری منزل حج ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ ان معاملات کو بہتر جانتا ہے *

گیارہواں مشاہدہ

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے اس قول کے کہ ”ابھی آدم کا خمیر پانی اور مٹی میں تیار ہو رہا تھا کہ میں نبی تھا“ معنی دریافت کئے۔ لیکن میرا یہ سوال زبانِ مقال سے نہ تھا۔ اور نہ یہ سوالی خیال کی صورت میں میرے دماغ میں آیا تھا۔ بلکہ ہوا یہ کہ میری رُوح اس راز کو جاننے کے شوق اور اُس کی محبت میں سرشار ہو گئی۔ اس حالت میں میں نے اپنی رُوح کو زیادہ سے زیادہ جتنا بھی مجھ سے ممکن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے قریب کر دیا۔ اس کی وجہ سے میری رُوح آپ کی ذات اقدس کی جو مثالی صورت ہے، اُس سے بھر گئی۔ اس کے بعد آپ نے مجھے اپنی مثالی صورت دکھائی، جو اس عالم اجسام میں تشریف فرما ہوئے سے پہلے عالمِ مثال میں آپ کی

نہی۔ پھر آپؐ نے مجھے عالم مثال سے اس عالم اجسام میں اپنے منتقل ہونے کی کیفیت بتائی۔ اور اس طرح مجھے دوسرے انبیاء کی بھی مثالی صورتیں دکھائی گئیں۔ اور خداوند کار ساز کی جناب سے ان انبیاء پر جیسے جیسے نبوت کا فیضان ہوا۔ اور نیز جس طرح آپؐ پر عالم مثال میں خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس نعمت کا فیضان ہوا تھا، اُس کی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ بعد ازاں مجھے اولیاء کی مثالی صورتیں، اور اُن پر جس طرح علوم و معارف کا فیضان ہوتا ہے، یہ چیزیں دکھائی گئیں۔ اور اس طرح میرے لئے یہ حقائق خوب واضح ہو گئے۔ الغرض جو کچھ اُس مثالی صورت سے مجھ پر فیضان ہوا، میں نے اُسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اور اس فیضان سے جو مقصود و مطلوب تھا، وہ میں اچھی طرح سمجھ گیا۔ چنانچہ اس ضمن میں جو کچھ میں سمجھا ہوں، اب تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔

✓ تمہیں جاننا چاہئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک عظیم شان تہدی ہے، جو خلق کی طرف متوجہ ہے۔ لوگ اسی تہدی کے ذریعہ ہدایت پاتے ہیں اور اسی کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اس تہدی کی ہر زمانے میں ایک نئی شان ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک زمانے میں ایک منظر میں ظاہر ہوتی ہے اور دوسرے زمانے میں دوسرے منظر میں۔ اور جب کبھی یہ تہدی تمہاری نظر میں ظاہر ہوتی ہے تو دنیا میں اس منظر کا ایک عنوان بنتا ہے، اور یہ عنوان عبارت ہوتا ہے رسول سے، جو لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دینے اور برے کاموں سے روکنے، اور اُن کو فرائض و واجبات بتانے کیلئے

مبعوث کیا جاتا ہے۔ الغرض یہ رسول اور جو کچھ کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے لے کر آتا ہے، وہ اس تبدلی کے منظر کا عنوان بنتے ہیں۔ اور یہ منظر فی نفسہ اصل حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی تبدلی کے مظاہر میں سے کوئی منظر بروئے کار آتا ہے تو اسی منظر کی مناسبت سے لوگوں میں علوم و معارف کا ظہور ہوتا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ لوگوں کو اس کا سرے سے علم ہی نہ ہو کہ یہ علوم و معارف تبدلی الہی کے اسی منظر کا فیضان اور اُسی کے مناسب اور مطابق ہیں۔ وہ لوگ جن پر ان علوم و معارف کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر وہ اُس گروہ میں سے ہوں جن کا کام کسی رسول کے کلام سے مسائل کا استنباط کرنا ہوتا ہے تو یہ احبار اور رہبان کی جماعت ہوگی۔ اور اگر وہ اُس گروہ میں سے ہوں جن کی اس طرح ان مسائل کے استنباط کی طرف توجہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ برائے راست اللہ تعالیٰ سے اخذِ علم کی ہمت رکھتے ہیں، تو یہ حکماء اور محدثین یعنی حکمت ربانی کے حاملوں کی جماعت ہے۔ غرضیکہ احبار اور رہبان اور حکماء اور محدثین، یہ دونوں کے دونوں گروہ تبدلی الہی کے اسی منظر سے علم حاصل کرتے ہیں، خواہ وہ اس حقیقت سے باخبر ہوں یا نہ ہوں۔ تبدلی الہی کی اس طرح ظہور فرمائی ہی دراصل اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ورنہ جہاں تک رسول کی تبلیغ و اشاعت کا تعلق ہے، اُس کا تو حلقہ ظاہر سے بڑا محدود ہوتا ہے یعنی اُس کی آواز ایک قوم سننتی ہے، اور دوسری قوم تک اُس کی آواز نہیں

پہنچتی، اور وہ اُس سے محروم رہتی ہے۔ لیکن اس تبدیلی کا فیصلہ عام ہے۔ اور اس سے احبار اور رہبان اور علماء اور محدثین برابر اختلاف علم کرتے ہیں۔

تفسیر مختصر، جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو پیدا کرے، تاکہ وہ تمام بنی نوع انسان کے لئے بمنزلہ باپ کے ہوں تو اللہ تعالیٰ کے اس ارادے کا دراصل مقصد یہ تھا کہ وہ آدم کے ساتھ ساتھ تمام بنی نوع انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہوا یہ کہ تخلیق آدم کے وقت تمام بنی نوع انسان کی ارواح نے عالم مثال میں اُن کے اجسام کی جو مثالی صورتیں تھیں اُن کی طرف حرکت کی۔ اس ضمن میں عالم مثال میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مثالی پیکر بھی متشکل ہو گیا اور اس مثالی پیکر کے مناسب تالی الہی کا جو منظر تھا، وہ اس پر منطبق ہو گیا۔ آپ کے مثالی پیکر پر تبدیلی الہی کے منظر کا انطباق ایسا تھا جیسے کہ ایک گل پر اُس کے جزو کا انطباق ہو جائے۔ اور ایسا اس لئے ہوا کہ اول تو عنایت الہی میں آپ کی ذات اقدس کے لئے یہ خصوصیت مقدر ہو چکی تھی۔ اور دوسرے ایک ایسے فرد کا وجود میں آنا ایک طے شدہ امر تھا، جو حشر کے دن تمام بنی نوع انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا واسطہ بنے۔ اور اُس کے ذریعے اُن کے لئے شریعت کی تکوین ہو۔ اور نیز جب لوگوں کو ضرورت پڑے تو وہ اُن کی بیماریوں کو بھی دور کر سکے، الغرض آدم کی تخلیق سے پہلے آپ کے نبی ہونے سے یہ مراد ہے۔

ہر حال جب افراد انسانی وجود میں آگئے۔ اور انہوں نے اپنی اپنی راہیں اختیار کر لیں، تو ان میں سے بعض افراد ط کے مرکب ہوئے۔ اور ان میں سے بعض تفریط میں پڑ گئے۔ چنانچہ اس وقت تدبیر الہی اس امر کی متقاضی ہوئی کہ وہ سب کو ایک ہی راہ پر لے آئے، اس کے لئے ان افراد میں سے ایک فرد پر تدبیر الہی منطبق ہوئی، اور اس فرد کو وحی کے ذریعہ بتایا گیا کہ کس کس چیز میں اُس کی قوم کے لئے فلاح ہے۔ غرضیکہ اس طرح اس فرد کے اس منصب پر مبعوث ہونے سے تدبیر الہی کے مظاہر میں سے ایک منظر ظاہر ہوا۔ اور عام طور پر اس صحن میں ہوتا یہ ہے کہ تدبیر کے اس منظر کا انطباق اس بنی کے وجود بشری پر ہوتا ہے۔ باقی رہا عالم مثال میں اُس کا مثالی وجود، وہ تو اس سلسلے میں محض اس بات کی حکایت کرنے کے لئے ہے کہ اس فرد میں یہ یہ استعداد ہے، اور اس لئے اس استعداد کے مطابق اُس پر فیضان ہونا چاہیے۔

لیکن اس کے برعکس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود خارج میں ظہور پذیر ہوا۔ تو اُس کے ساتھ ساتھ تدبیر الہی کا بھی ایک منظر ظاہر ہوا۔ اور چونکہ یہ منظر قوت مثالی پر مشتمل تھا۔ اس لئے اُس نے پوری طرح مثالی لباس اختیار کر لیا۔ اور اس حالت میں تمام آفاق اس سے بھر گئے۔ اور یہ اس لئے کہ اس سے پہلے کوئی تدبیر مثالی لباس میں ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کے یہی معنی

نہیں کہ عالم مثال فی نفسہ اُس وقت تک موجود نہیں تھا۔ یعنی عالم مثال تو موجود تھا، لیکن کسی تدلی نے اُس وقت تک مثالی ہیئت اختیار نہیں کی تھی۔ غرضیکہ اس سے میری مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تدلی الہی کے اس منظر کی کوئی مثالی صورت نہیں تھی۔ لیکن آپ کے بعد تدلی الہی کی اس مثالی صورت سے یہ ساری کی ساری فضا اور یہ کل زمینیں اور آسمان بھر گئے۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ جو شخص بھی علم، معرفت، روحانی کیفیت یا اس قبیل کا کوئی اور کمال اخذ کرتا ہے، تو اُس کے لئے سب سے قریبی ماخذ تدلی الہی کا یہی مثالی منظر ہوتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ اس حقیقت کو جانتا ہے، یا وہ اس سے بے خبر ہے۔ الفرض یہ ہیں وہ وجوہ، جن کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا کیونکہ آپ کی ذات اقدس کی اصل حقیقت جس کے لئے آپ کا لوگوں کے لئے بنی مبعوث ہونا محض ایک عنوان تھا، تدلی الہی کا یہی مثالی منظر ہے۔ اور یہی وہ مثالی منظر ہے۔ جس سے یہ فضا اور زمین اور آسمان بھر گئے ہیں۔

اب اگر تم یہ بات سمجھ گئے تو بے شک تم اس حقیقت کو بھی پاؤ گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی تمام جہانوں کے لئے رحمت اور خاتم النبیین تھے۔ اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام اس عالم

اجسام میں اللہ تعالیٰ کی اسی تدلی سے فیض حاصل کرتے تھے لیکن جہاں تک اولیاء کا تعلق ہے، اُن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس تدلی کے مثالی منظر سے اخذ معرفت کرتے ہیں۔ اور اس مثالی منظر کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقتِ بعثت ہے۔ گروہِ انبیاء میں سے میں نے اس معاملے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ممتاز پایا ہے کہ بے شک اُن کی نبوت بھی عالم ارواح میں یعنی جب تخلیقِ آدم کے ساتھ تمام بنی نوع انسان کی ارواح اپنے مثالی پیکروں میں ظاہر ہوئی تھیں، متشکل ہوئی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت کی مثالی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی مثالی صورت سے قدرے کمزور تھی، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت سے تدلی الہی کا ایک روحانی منظر ظاہر ہوا۔ لیکن یہ بھی اُس روحانی منظر سے ضعیف تھا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ظہور پذیر ہوا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد اُن کی امت کے سوا اور کہیں کامل نبی اور محدث پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اس کے باوجود نبوت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ پر جب ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ظاہر ہوئے تو تدلی الہی کا مثالی منظر خوب نمایاں طور پر ظاہر ہو گیا۔ اور اسی بنا پر آپؐ کی نبوت کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت نہ رہی۔ اور نبوت کا سلسلہ سرے سے ختم ہو گیا۔ اور علوم و معارف کا فیضان موصلاً دھار بارش کی طرح ہونے لگا۔ کیونکہ

جہاں تک ان علوم و معارف کا تعلق ہے، اُن کا مستقر تو زیادہ تر
عالم مثال ہی ہوتا ہے *

تحقیق عالی ————— اب اگر تم مجھ سے یہ پوچھو کہ آخر اس
میں کیا حکمت ہے کہ زمانہ قدیم میں آدم علیہ السلام کے بعد لوگوں
کا رجحان ذہن کے جمود اور طبیعت کی سستی کی طرف زیادہ رہا۔
اور وہ حیوانی خواہشات میں بیشتر الجھے رہے۔ اور اُس زمانے میں
محدود و بے چند کے سوا کہیں اجتماعی ادارے وجود میں نہ آئے۔ اور
شاذ و نادر ہی خطابت، طبیعات اور انبیات کے علوم میں سے کوئی
علم ایجاد ہوا۔ باوجود اس کے کہ اُس زمانے میں لوگوں کی بڑی لمبی
عمریں ہوتی تھیں۔ اور وہ ان علوم میں بہت غور و خوض بھی کرتے
تھے۔ لیکن جب حضرت ابراہیمؑ مبعوث ہوئے ہیں تو اُن کے بعد
یونان، روم، فارس، ہنری اسرائیل، مغرب اور عرب میں ان
علوم میں قدرے ترقی ہوتی ہے پھر جوہنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی بعثت ہوتی ہے، ان علوم کا بڑے زور شور سے فیضان ہوتا ہے۔
اور علوم حکمت، فنون ادب و خطابت اور علوم شرعیہ اس طرح
بھوٹ پڑتے ہیں کہ اُن کی کوئی اور چھور نہیں رہتی *
اس کے جواب میں میں عرض کرتا ہوں کہ بات یہ ہے کہ اللہ

تعالے کی ایک بہت بڑی تبدیلی ہوئی، جس سے کہ زمینوں اور آسمانوں کی کل فضا بھر گئی۔ اس تبدیلی کی حقیقت عبارت ہے اُس معرفت سے جو شخص اکبر کو اپنے رب کے بارے میں حاصل ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شخص اکبر نے جب اپنے رب کو اس طرح جان لیا جیسا کہ اُس کے جاننے کا حق تھا۔ اور اس نے اپنے رب کا اُسی طرح تصور کر لیا، جس طرح کہ اُس کا تصور کرنا چاہئے تھا، تو رب کو اس طرح جاننے اور اُس کا اس طرح تصور کرنے سے شخص اکبر کے ادراک میں اللہ تعالیٰ کی ایک با عظمت صورت نقش ہو گئی، جو توحمان بن گئی اللہ تعالیٰ کی جلالت شان اور اُس کی عزت و رفعت کی پہچانچہ جب تک شخص اکبر کا وجود قائم ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ صورت بھی اُس کے اندر موجود رہے گی۔ اس صورت کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کا کلیتہً اشد پر انطباق ہوتا ہے۔ اور وجود باری تعالیٰ جو فی نفس الامر ہے، یہ صورت اُس وجود کی بہت اچھی طرح اور بہت صحیح توجہ مانی کرتی ہے۔

بعد ازاں جب طبیعت کلیہ کے اندر عناصر و افلاک کا ظہور ہوا تو یہ طبیعت کلیہ ان عناصر و افلاک میں اسی طرح محفوظ ہو گئی، جس طرح کہ طبیعت ارضی معدنیات، نباتات، حیوانات، اور نوع انسانی میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ اور نیز اس طبیعت کلیہ کے خواص، اُس کے

لے جس طرح ہر چیز کا ایک کلی وجود ایک دوسرے عالم میں موجود ہے۔ اسی طرح طبیعت جو کل کائنات کی ہے، اُس کا بھی ایک کلی وجود پہلے ظہور میں آیا تھا۔ اس کا نام طبیعت کلیہ ہے۔

تقاضے اور اُس کی قوتیں بھی ان عناصر و افلاک میں داخل ہو گئیں۔
 اب ان عناصر و افلاک کے بعد جب معدنیات، نباتات، حیوانات،
 اور بنی نوع انسان معرض وجود میں آئے۔ تو عناصر و افلاک کے طبائع
 ان میں منتقل ہو گئے۔ اور اس ضمن میں معدنیات، نباتات، حیوانات
 اور بنی نوع انسان کی حیثیت آئینوں کی سمجھئے کہ یہ چیزیں افلاک کے
 خواص، اور ان کی حرکات، اور عناصر اور ان کے طبائع کے اطوار کا ذریعہ
 بن گئیں۔ باقی رہا طبیعت کلیہ، وہ تو پہلے ہی اپنی تمام قوتوں کے ساتھ
 افلاک و عناصر میں محفوظ ہو چکی تھی۔

الغرض اس طرح بنی نوع انسان کے ہر فرد کے دل کی گہرائیوں
 میں، اُس کے جوہر نفس میں، اور اس کی اصل بناوٹ میں اللہ تعالیٰ
 کو جاننے کی استعداد رکھی گئی ہے۔ لیکن اس استعداد پر بہت سے
 پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ پردے انسان کی اس استعداد پر کیسے
 پڑے؟ بات یہ ہے کہ انسان کے نفس کی خاصیت کچھ ایسی ہے
 کہ اُس پر ہر طبیعت کا خواہ وہ عناصر و افلاک کی ایسی طبیعت میں سے
 کوئی طبیعت ہو، یا معدنیات، نباتات اور حیوانات کی طبیعت میں سے،
 ان میں سے ہر ایک کا انسان پر اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ نفس انسانی ان
 طبائع سے جس قدر متاثر ہوتا ہے، اُسی قدر اس کی فطری جہالتیں
 آجاتی ہیں اور نفس کے اندر جو نقطہ تدلی موجود ہوتا ہے، اور جس
 کی کم حیثیت ایک مضبوط رستی کی ہے کہ جس نے اسے پکڑ لیا، اُس نے

گویا اپنے رب کی معرفت کی رستی کو پکڑ لیا، طبائع کے ان اثرات کی وجہ سے چھپ جاتا ہے۔ الغرض یہ پردے جو انسان کی اس استعداد پر پڑ جاتے ہیں، یہ تہ بہ تہ اور ایک دوسرے کے اوپر سجے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب ایک شخص ہے، جس کو کہ "حقیقت الحقائق" کی طرف تئیب نصیب ہوا۔ اور اُس نے یہ بھی جان لیا کہ اسی حقیقت الحقائق سے طبیعت کلیہ اور اس کے اجزاء اور انواع کا ظہور ہوا ہے۔ اس شخص کے لئے اللہ کے نور کی مثال قرآن مجید کی اس آیت کی ہے۔ "ایک طاق ہے، جس میں کہ چراغ رکھا ہوا ہے۔ اور یہ چراغ شیشے کے اندر ہے۔" اس نور سے اس شخص کے تمام حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ اور یہ حجابات خود اس نور کی روشنی سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ یہ حجابات جو پہلے معرفت الہی میں حارج تھے، اس نور کی وجہ سے اب بجائے اس کے کہ یہ پہلے کی طرح معرفت الہی میں سد راہ ہوں، یہ حجابات اُس شخص کو اللہ تعالیٰ کے پہچاننے میں مدد دیتے ہیں۔ اب ایک اور شخص ہے جس کو حقیقت الحقائق کی طرف یہ تئیب نصیب نہیں ہوا۔ اور نہ وہ حقیقت الحقائق سے طبیعت کلیہ اور اُس کے اجزاء کا ظہور سمجھ سکا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے اس شخص کے نفس پر جو پردے پڑ جاتے ہیں، اُن کی مثال قرآن مجید کی اس آیت کی ہے کہ "ایک عمیق سمندر ہے جس پر تاریکیوں کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ اور سمندر میں موجیں اٹھ رہی ہیں اور اوپر سے بادل

گھیر گھر کر آ رہے ہیں۔“

الغرض یہ تو اس بحث کی تمہید ہوئی۔ اس کے بعد ہمیں جاننا چاہئے کہ نفس انسانی کے جس نقطہ تدلی کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اُس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے جیسے اسباب و حالات ہوتے ہیں، اُنہی کے مطابق یہ نقطہ تدلی اور اُس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اسباب و حالات وافر اور درجہ کمال کے ہوں تو اُسی قدر یہ نقطہ تدلی واضح اور روشن ہوتا ہے۔ اس نقطہ تدلی کو برسرِ ظہور لانے والے اسباب میں سے ایک سبب ملاءِ اعلیٰ ہے۔ اور ملاءِ اعلیٰ سے میری مراد یہاں صرف فرشتوں سے نہیں۔ بلکہ ملاءِ اعلیٰ میں اُن کاملوں کے نفوس کا بھی شمار ہوتا ہے، جب کہ وہ موت کے بعد اپنے آپ سے اپنے بدلوں کے ثقیل حجابات اُتار دیتے ہیں، جو اس دُنیا کی زندگی میں اُن کے نفوس کو گھیرے رہتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ملاءِ اعلیٰ سے بہت زیادہ مشابہ اور اُن میں بہت بڑا درجہ رکھنے والے ہو جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جب کوئی کامل اس دُنیا سے گزر جاتا ہے تو عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بزرگ دُنیا سے نابود ہو گئے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس موت کے بعد اس کامل کا وجود عرضِ دِجور کے مرکب سے نکل کر سرتاپا جوہر ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے کمال میں اور قوی تر ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ ملاءِ اعلیٰ کے

جو اکابر ہیں اُن میں سے ہر بڑے فرد کو اس امر کی توفیق نصیب ہوتی ہے کہ اپنے نفس سے وہ تہ بہ تہ حجابات جو اُس کے اوپر پڑے ہوتے ہیں اٹھا کر نقطہ تہائی تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد اُس کمال کے نقطہ تہائی سے ایک موج اٹھتی ہے جو اُس کمال کے نفس کے اندر داخل ہوتی ہے۔ اور اُس سے یہ نفس معرفت الہی سے بھر جاتا ہے۔ پھر یہ موج اُسی تہائی کی طرف لوٹتی ہے، چنانچہ اب یہ تہائی ایک اور تہائی کے ظہور کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ دوسری تہائی اُن انسانی نفوس سے جو اجسام میں محبوس ہیں، زیادہ قریب ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسانی نفوس پر اس زندگی میں معرفت الہی کا فیضان ہوتا ہے۔ الغرض اس طرح جوں جوں زمانہ گزرتا ہے، اور طلاء اعلیٰ کے انوار بڑھتے جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کے اسباب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ان افراد کا طین میں سے بعض افراد تو درجہ اعلیٰ کے قریب ہوتے ہیں اور بعض اُن سے نیچے، اور بعض ان دو درجوں کے بیچ ہیں۔ غرضیکہ ان انوار سے نفوس انسانی کی زمین سے لے کر معرفت الہی کے آسمان تک جو بھی فضا ہے، وہ پوری بھر جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پہلے کے مقابلے میں بعد کے زمانے میں نفوس انسانی کی معرفت زیادہ تیز اور زیادہ واضح اور نمایاں ہوتی گئی۔ چنانچہ اسی نکتہ کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے۔

”جب قیامت کا زمانہ قریب آئے گا تو عموماً جو بھی خواب دیکھے گا،
اس میں شاذ و نادر ہی غلطی ہو کرے گی۔“

القصد جس طرح عناصر و افلاک میں طبیعت کلیہ محفوظ ہے۔ اور
معدنیات، نباتات، حیوانات اور بنی نوع انسان میں طبیعت ارضی موجود
ہے، اسی طرح ایک طبیعت عرشی ہے، جس میں انسانی زندگی کے اجتماعی
تقاضوں کے علوم جمع ہیں، اور نہ صرف یہ علوم بلکہ اس طبیعت عرشی
میں ہر نوع کے اجتماعی تقاضے، نیز تمام کے تمام نفوس اور انواع کے
سب کے سب احکام و معاملات کے علوم جمع ہیں۔ چنانچہ جب کوئی
شخص زندگی کے ان اجتماعی علوم کو استنباط کرنے میں کمال حاصل کرتا
ہے، تو وہ دراصل اسی طبیعت عرشی سے کسب فیض کرتا ہے۔ اور
جب یہ فیض اُس شخص کے قلب میں اچھی طرح سے راسخ ہو جاتا ہے۔
تو پھر یہ فیض اپنے اصلی مقام یعنی طبیعت عرشی کی طرف لوٹتا ہے، اور
اس موقع پر اس شخص کے کمال کے مطابق طبیعت عرشی سے دوسرے
انسانی نفوس کے لئے ایک اور تدلی کا ظہور ہوتا ہے۔ اور اس طرح یہ
اجتماعی علوم عام ذہنوں میں آسانی سے اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں۔
اس کے بعد جب یہ کمال اس دنیا سے وفات پاتا ہے، تو نہ تو وہ
خود بالکل نابود ہوتا ہے، اور نہ اُس کا یہ کمال اور نہ اُس کے نفس کا وہ
طرف جو طبیعت عرشی کی تدلی کا مرکز بنا تھا، فنا ہوتا ہے۔ بلکہ ان میں
سے ہر چیز اپنی اصلی حالت پر رہتی ہے۔ چنانچہ اس طرح کے جو

صاحب کمال نفوس ہوتے ہیں، اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے تقویت کا سبب بنتا ہے۔ ان نفوس کی نسبت ”طبیعت الانسانیہ“ سے جو عالم مثال میں ایک شخص واحد کی طرح موجود ہے، ایسی ہی ہے، جیسے کہ انسان کی قوتوں اور اُس کے فہمی تصویر کی نسبت خود اُس سے ہوتی ہے۔ غرضیکہ جس طرح منطقی استدلال میں مقدمات ذریعہ بنتے ہیں نتیجہ اخذ کرنے کا، اسی طرح پاکیزہ نفوس بھی اسطہ ہوتے ہیں دوسرے نفوس کے لئے حصول پاکیزگی کا۔ اور یہی وہ معرفت ہے جس کی طرف میں نے اپنے قصیدہ ”لامیہ“ کے اس شعر میں اشارہ کیا ہے :-

شَهِدَتْ تَدَاوِيرُ الْوُجُودِ جَمْعِيَهَا

تَدَوُّرُ كِبَادِ الرَّاحِ الْمَتَايِلِ

وجود کے جتنے بھی چکر ہیں، میں نے اُن سب کا مشاہدہ کیا۔

اور وجود اس طرح چکر کاٹ رہا جیسے کہ چکی ایک طرف جھکی ہوئی چکر لگاتی ہے :-

بارہواں مشاہدہ

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران میں بالجملہ میرے ساتھ یہ اکثر ہوا کہ جب بھی میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تو آپ کو حاضر و ظاہر پایا۔ اور وہ اس طرح کہ یا تو میری روح کی آنکھ کھل گئی۔ اور میں نے آپ کو جس حالت میں کہ آپ تھے دیکھا اور یا میرا نفس آپ سے بے حد متاثر ہوا۔ اور میرا یہ تاثر ہی ذات اقدس کا ترجمان بن گیا۔ چنانچہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں آپ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس وقت میرے اندر یہ شوق بھرا ہوا تھا کہ انسانی نفوس کے حالات و کوائف کے مطابق مجھے جو شرعی احکام و قواعد کے معارف کو استنباط کرنے، اور جود الہی کے جو مختلف مراتب ہیں، ان کے علوم سے بہرہ ور ہونے کی خصوصیت دی گئی ہے، خدا

کرے میرے سامنے اس خصوصیت کی جو اصل حقیقت ہے، وہ عیاں ہو جائے۔ الغرض میں اس فکر میں تھا کہ میرا نفس ذات اقدس ۲ سے ملحق ہو گیا۔ اور اس کی وجہ سے میرے اندر ان علوم و معارف کی خوشی اور ٹھنڈک بکسر سما گئی +

علاوہ ازیں ایک دن مجھ پر ذات حق کی نظر کا فیضان ہوا۔ اور یہ وہ چیز ہے جو انبیاء میں سے صرف ہمارے ہی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نصیب ہوئی ہے، جیسا کہ تدلی کے سلسلہ میں ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ ذات حق کی نظر کا یہ فیضان آپ کی ذات کے لئے خاص تھا۔ اور جب آپ عالم ناسوت میں تشریف لائے، تو وہ فیضان بھی عالم ناسوت میں آپ کے ساتھ منتقل ہو گیا۔ الغرض جب مجھ پر ذات حق کی نظر کا یہ فیضان ہوا تو میں بھی پوری توجہ سے اُدھر مشقت ہوا۔ اس سے اس فیضان کا ایک رنگ میرے اندر جا گزرا ہو گیا۔ اور اس وقت میں نے اپنے آپ کو یوں محسوس کیا جیسے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ مجھے یقین ہو گیا کہ ذات حق کی یہ جو نظر ہے اور جس کا مطلق میں بنا ہوں، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ جس شخص پر ذات حق کی اس نظر کا فیضان ہوتا ہے، وہ شخص جب کسی جگہ بیٹھ کر اپنے رب کا ذکر کرتا ہے، تو تمام کی تمام زمینیں اور سارے کے سارے آسمان اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور خاص طور پر زمین کے وہ اجزاء جو پاتال تک نیچے چلے گئے ہیں، اور فضا کے وہ حصے جو ساتویں آسمان بلکہ عرش تک

پھیلے ہوئے ہیں۔ اور نیز جب یہ نظر حق کسی شخص میں جاگزیں ہو جائے
 تو وہ قطب بن جاتا ہے۔ مزید برآں میں اس نظر کے فیضان کے وقت
 اس حقیقت کو بھی جان گیا کہ یہ نظر اور نقوش کی طرح دل کے اندر نقش
 نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ انسان کی رُوح کے اصل جوہر اور اُس کے نفس
 کی گہرائی میں اپنی جگہ بناتی ہے۔

نیز ایک دن کا واقعہ ہے کہ میرے سامنے ملا سافل کے رنگ
 میں ایک نور ظاہر ہوا۔ اور میں نے دیکھا کہ یہ نور رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کی قبر مبارک سے چہتے کی طرح پوری قوت سے پھوٹ رہا ہے۔

تیرھواں مشاہدہ

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلىٰ پر جو مسجد نبوی کے منبر اور آپ کی قبر کے درمیان ہے، چاشت کی نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھ پر وہ راز ظاہر ہوا، جس راز کی اصل کا میں نے حقیقت کعبہ سے استفادہ کیا تھا، اور وہ راز ہے ملائعہ اعلیٰ کا قرب اور عبادت کا جوہر اصلی۔ چنانچہ اُس وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اشارہ کا کہ ”مسجدوں میں خوب دعائیں کرو“ اور نیز آپ کے ایک صحابی کو یہ کہنے کا کہ ”کثرتِ سجود سے اپنے نفس کی مدد کرو“ مطلب سمجھا۔ بات یہ ہے کہ ملائعہ اعلیٰ کا قرب صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ بڑی عاجزی اور پوری توجہ سے دعا کی جائے۔ اور آدمی اپنے آپ کو اللہ کے روبرو ڈال دے۔

اور اُس کی بارگاہ میں عجز و زاری کرے۔ اور اُس کے آستانے کو اپنے لئے پناہ گاہ بنائے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی سجدے میں پڑ کر خدا سے پوری توجہ اور ہمت سے دعا کرے۔ کیونکہ سجدہ ہی دراصل ملائعہ کے قُرب کا قالب ہے۔ اور ایک چیز کے قالب کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ یہی قالب راستہ اور ذریعہ بنتا ہے اُس چیز کے اصل جو ہر تک پہنچنے کا پتہ دیتا ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامہ جب نوعِ بشر کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور اُس نے انسانوں کو اس رحمت سے مستفیض فرمانے کا ارادہ کیا تو اس رحمتِ عامہ کی معطر لپٹوں سے متعلق ہونا، اُس کے نزول کو ممکن بنانا، اور اُس کے لئے وجود میں آنے کا سامان کرنا، ظاہر ہے یہ سب چیزیں اس رحمت کے لئے بطور مدد و اعانت کے ہوں گی۔ اور ان سے رحمت کا جو اصل مقصد ہے، وہ تکمیل پذیر ہوگا۔ اور چونکہ سجدہ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامہ سے تعلق کی قریب ترین صورت ہے، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر کثرتِ سجدہ کا حکم دیا۔ اس ضمن میں مجھ پر آپ کے اس ارشاد کی بھی حقیقت ظاہر ہوئی، جس میں کہ آپ نے اپنے صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ "کیا تمہاری آنکھوں کو چودھویں رات میں ماہِ کامل کو دیکھنے سے اذیت ہوتی ہے۔" اس پر صحابہ نے جواب دیا کہ بالکل نہیں۔ اس پر آپ

نے ارشاد فرمایا۔ کہ ”تم بعینہ اسی طرح قیامت میں اپنے رب کو دیکھو گے۔ تمہیں چاہئے کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے کی جو نمازیں ہیں، اُن کو کبھی ترک نہ کرو۔ اور اس معاملہ میں کسی چیز سے مغلوب نہ ہو۔“ یعنی مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی جو تجلی ہوگی، وہ وہی تجلی ہے جو نمازی کے سامنے جب کہ وہ نماز پڑھ رہا ہوتا ہے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور یہی وہ تجلی ہے جو اُس حدیث کے مطابق جس میں کہ آپؐ نے فرمایا کہ ”بندہ جب نماز پڑھتا ہے تو خدا اُس میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ یعنی جب وہ کہتا ہے ”الحمد للہ“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف کی..... الخ الخ الخ اللہ تعالیٰ کی یہی وہ تجلی ہے جو نماز میں بندے کے ساتھ شریک ہوتی ہے اور اُس کی دعاؤں کا جواب دیتی ہے۔ لیکن اس ضمن میں ہوتا یہ ہے کہ لوگوں کو اس زندگی میں ان کے حجابات بدن روح کی آنکھ سے بھی اس تجلی کو دیکھنے نہیں دیتے۔ اگرچہ روح کی آنکھ جسم کی آنکھ پر غالب ہوتی ہے۔ لیکن جب قیامت کا دن آئے گا۔ اور بدن کے یہ حجابات چھٹ جائیں گے تو اُس دن روح کی آنکھ بذات خود مستقل حیثیت اختیار کر لے گی۔ اور جسم کی آنکھ وہاں روح کی آنکھ کے تابع ہوگی۔ بات یہ ہے کہ آخرت میں زندگی کی جو بھی شکل ہوگی، وہ اس دنیا ہی کی زندگی کا حاصل نتیجہ ہوگی۔

چنانچہ رُوح کی آنکھ جو اس دُنیا میں بعض افراد کو عطا ہوتی ہے۔ اس رُوح کی آنکھ میں، اور وہ آنکھ جو آخرت میں عامۃً مسلمین کو پیش ہوگی، کوئی فرق نہیں۔ البتہ عامۃً مسلمین کو اس زندگی کے بعد حجابات بدن اُتارنے پر ہی رُوح کی اس آنکھ سے بہرہ یاب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن بعض ممتاز افراد کو اس دُنیا کی زندگی ہی میں یہ آنکھ پیش ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ قرآن کی ہر آیت اور ہر حدیث گویا ایک بحرِ متواج ہے اسرار و رموز کا۔ اور اگر میں ان میں سے ایک کی بھی شرح لکھنے بیٹھوں تو جلدیں کی جلدیں لکھی جاتیں۔ اور پھر بھی اُس کا حق ادا نہ ہو۔ نیز میں نے دیکھا کہ قرآن اور سنت کے اشارات میں بڑے بڑے پوشیدہ اسرار ہیں، اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوا۔ اس کے بعد میرے لئے اللہ تعالیٰ کی تدریسی اعظم ظاہر ہوئی تو میں نے اُسے بے کنار اور غیر متناہی پایا۔ اور اُس وقت میں نے اپنے نفس کو بھی غیر متناہی پایا اور میں نے دیکھا کہ میں گویا ایک غیر متناہی ہوں، جو دوسرے غیر متناہی کے مقابل ہے۔ اور میں اُس غیر متناہی کو اپنے اندر نگل گیا ہوں۔ اور میں نے اُس غیر متناہی میں سے کچھ باقی نہیں چھوڑا۔ اسکے بعد جو میں نے اپنے نفس کی طرف رجوع کیا تو کچھ دیر تک میں اپنے نفس کی اس عظمت اور وسعت سے حیرت میں رہا لیکن پھر یہ حالت مجھ سے جاتی رہی تو میں نے دیکھا کہ میں نور سے بھرا ہوا ہوں اور میرے اوپر میرے نیچے، میرے دائیں اور میرے بائیں، الغرض ہر طرف سے مجھ پر نور کی بارش ہو رہی ہے بلکہ میں نے تو یہاں تک دیکھا کہ میرے دل سے میری آنکھوں سے، میرے ہاتھ سے، میرے تمام اعضاء و جوارح سے نور چھٹنے کی طرح اُبل رہا ہے۔

چودھواں مشاہدہ

میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی صورت
میرے سامنے سے غائب ہو گئی۔ اور اُس کی بجائے آپ کی رُوح
کی حقیقت اُن تمام لباسوں سے جو اُس نے پہن رکھے تھے، یہاں
تک کہ لسنے کے بعض اجزاء سے بھی منزہ اور مجرّد ہو کر میرے
سامنے تجلّی پذیر ہوئی۔ اُس وقت میں نے آپ کی رُوح کو اُسی
طرح پایا، جس طرح میں نے بعض اولیائے متقدّمین کی ارواح کو
دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد خود میری رُوح سے آپ کی رُوح
سے ملتی جلتی ایک مجرّد صورت ظاہر ہوئی۔ اور اس وقت میں نے
اس قدر جذب و شوق، اور رفعت و بلندی کا مشاہدہ کیا کہ زبان
اس کو بیان نہیں کر سکتی۔

پندرہواں مشاہدہ

میں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس سے کسب فیض کیا، تو اس سے میرے نفس میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی۔ اور اس کی وجہ سے میں آپ کی دراشت کے ضمن میں تدلی اعظم کے اس مثالی منظر سے جا ملا جو کہ آپ کے ساتھ عالم مثال سے عالم ناموت میں منتقل ہوا تھا۔ چنانچہ میں اس منظر سے متصل ہوا۔ اور اس سے گھل مل گیا۔ اور اس سے میں مخلوط ہو گیا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ تدلی اعظم کے اس مثالی منظر کے جو دو قالب ہیں، میں ان میں سے ایک قالب ہوں۔ اس مثالی منظر کا ایک قالب زیادہ مکمل اور زیادہ عام ہے۔ اور یہ وجود خارجی سے زیادہ قریب ہے۔ اور اس قالب سے دوسرے قالب کی نسبت ایسی ہے جیسے کہ فقہ کا

ایک صاحب مذہب (مثلاً امام ابو حنیفہؒ) ہو۔ اور دوسرا گو فقہ
میں اُس صاحب مذہب کا تابع ہو، لیکن وہ نئے نئے فقہی مسائل
کا استنباط کر سکے۔ تدتی اعظم کے اس مثالی منظر کا یہ دوسرا قالب وجود
علمی سے قریب ہوتا ہے *

اس موقع پر میرا نام "ذکی" اور "تقاطب علم کا آخری نقطہ" رکھا
گیا۔ اور نیز اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ جو شخص تدتی اعظم کے اس
مثالی منظر سے متصل ہو جاتا ہے اور اُس سے اس طرح کھل مل جاتا ہے
یعنی یہ مثالی منظر اُس کے جوہر روح میں اس طرح داخل ہو جاتا ہے
جیسے راہ سلوک کے سلسلہ میں "یادداشت کی نسبت سالک کے جوہر
نفس میں داخل ہو جاتی ہے تاکہ اس طرح بیداری کا وہ نقطہ جس کو
لے کر انسان پیدا ہوتا ہے، وہ اُس کے اندر بیدار ہو جائے۔
الغرض جو شخص تدتی اعظم کے اس مثالی منظر کو اس طرح اپنے اندر
لے لیتا ہے، اُس کے مقامات میں سے مجددیت، وصایت، قطبیت
اور طریقت کی امامت ہے۔ اور اُس شخص کی خصوصیت یہ ہوتی ہے
کہ اُس کے بعد بھی اُس کا نام باقی رہتا ہے۔ یہ ایک عمیق راز ہے
تمہیں چاہئے کہ اس میں خوب غور کرو *

سوطھوال مشاہدہ

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کھڑا ہوا۔ اور
میں نے آپ کو سلام عرض کیا۔ اور بڑی عاجزی سے میں نے آپ کی
بارگاہ میں ہاتھ پھیلائے۔ اور اپنی روح کو آپ کی روح اقدس سے
متصل کر دیا۔ چنانچہ آپ کی روح اقدس سے ایک بجلی چمکی۔ اور میری
روح نے لمحہ بھر میں یا اُس سے بھی کم مدت میں اس بجلی کو اچھی طرح
سے اپنے اندر جذب کر لیا۔ مجھے اس پر تعجب ہوا کہ میری روح سے
کتنی جلدی اس بجلی کو جذب کر لیا ہے۔ اور یہ کس طرح اُس بجلی
کی اصل، اُس کی فرع، اور اُس کے تمام اطراف پر آن واحد ہیں
بلکہ اُس سے بھی کم مدت میں بھادی ہو گئی ہے۔ یہ بجلی کو یا بجلی یعنی
قدرت کے اُس سلسلہ دراز کی، جس میں کہ یہ تمام کا تمام عالم بندھا

نہوٹا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ تجلی آپ کی روح کے اصل جوہر میں داخل
 ہے۔ اور یہ سلسلہ دراز عبارت ہے اس تدبیر واحد سے جس کا کہ
 مبدائے اول سے فیضان ہوتا ہے۔ اور یہ سارے کا سارا عالم بس
 اس کی تفصیل ہے۔ اور اس سلسلہ دراز کی فروع وہ تفصیلی تدبیریں
 ہیں، جن پر یہ سارا عالم قائم ہے۔ اس وقت میں یہ سمجھا کہ یہی سلسلہ
 دراز اصل حقیقت ہے حقیقت محمدیہ کی۔ اور جو بھی قطب، محدث یا نبی
 ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرتا ہے تو اس کو اسی حقیقت محمدیہ
 سے حصہ ملتا ہے۔ باقی ان امور کو اللہ بہتر جانتا ہے +

مشترحوں کا مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خود بہ نفس نفیس سلوک کے راستے پر چلایا۔ اور اپنے مبارک ہاتھوں سے میری تربیت فرمائی۔ چنانچہ میں آپ کا اویس اور برائے راست آپ کا شاگرد ہوں۔ اور اس مغلے میں میرے اور آپ کے درمیان اور کوئی واسطہ نہیں۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی روح اقدس کے دیدار سے مشرف فرمایا۔ اور اس سے

سے حضرت اویس قرنی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے لیکن آپ سے مل نہ سکے۔ اور اس کے باوجود آپ کے فیوض روحانی سے مستفید ہوئے۔ وہ ادگ جو کسی شیخ سے ملے بغیر اس کی روح سے فیض حاصل کریں۔ وہ اویسی کہلاتے ہیں۔ (مترجم)

میرا تعارف کرایا۔ کیونکہ بات یہ ہے کہ فیض پانے سے پہلے خود فیض کرنے والے کی ذات کو جانتا ضروری ہے۔ اسی ضمن میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح تو محسوس تک کو بھی خوب جانتی ہے۔ اس کے بعد میرے سلوک کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے آپؐ نے مجھ پر ذات حق کی تجلیات میں سے ایک تجلی کا فیضان فرمایا۔ اور یہ وہی تجلی تھی جو آپؐ کے وجود اقدس کے ساتھ ساتھ مثالی منظر میں ظہور پذیر ہوئی۔ چنانچہ میں نے اس تجلی کو اپنی روح کے جوہر میں لے لیا۔ اور میں اس میں محو ہو گیا۔ اور مجھے اس کے اندر درجہ فنا حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد میں اس تجلی کے ساتھ پھر اپنے وجود میں آگیا۔ اور اس طرح میں اس تجلی میں فنا ہونے کے بعد مقام بقا سے سرفراز ہوا۔

دوسری بار آپؐ نے مجھ پر ایک اور تجلی کا فیضان فرمایا۔ اور یہ تجلی اصل تھی اور پر ذکر شدہ مثالی منظر کی۔ اور اسکی حقیقت گویا ایک نقطے کی ہے جو اس دنیا میں ذات حق کے تمام کاموں اور اس کی تمام تدبیروں کی اصل ہے۔ میں نے اس تجلی کو بھی پہلی تجلی کی طرح اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور میں اس میں فنا ہو گیا۔ اور اس میں فنا ہونے کے بعد میں نے پھر مقام بقا حاصل کر لیا۔ آپؐ نے تیسری بار ایک اور تجلی کا مجھ پر فیضان فرمایا۔ اور

یہ تجلی عبارت تھی نقطہ ذات سے جس کے ساتھ جبروت کا رنگ بھی ملا ہوا تھا۔ میں نے اس تجلی کو بھی جذب کر لیا۔ اور میں نے اس میں بھی فنا ہو کر بقا حاصل کر لی۔ پھر جو تھی بار مجھ پر ایک اور فیضان ہوا اور یہ فیضان ایک نقطے کا تھا جو روحانیات میں مستقر ہے۔ اور اسی سے ”اندراج البہایہ فی البدایہ“ حاصل ہوتا ہے۔ میں نے اُسے بھی قبول کر لیا۔ اور اُس میں بھی میں نے فنا اور بقا کا مقام حاصل کیا۔ پانچویں بار آپ نے مجھے نسیم کے احوال و کوائف میں سے ایک ایسے نقطے سے متعارف کرایا جو اُس نقطہ کے مقابل ہے جس کا کہ ذکر ابھی ہوا ہے۔ اور نسیم کا یہ نقطہ گویا اُس نقطہ روحانیت کا بالکل عین ہے۔ اس ضمن میں مجھے معلوم ہوا کہ جو شخص نسیم کے اس نقطہ کو حاصل کرے، وہ اپنے شاگرد پر بڑی تاثیر ڈال سکتا ہے۔ اور یہ نقطہ عزم اور جرأت سے بہت مشابہ ہے۔ عزم اور جرأت سے میری مراد کسی چیز کا عزم کرنے یا کسی کے خلاف جرأت کرنے سے نہیں ہے، بلکہ اس سے میرا مطلب فی نفسہ عزم و جرأت سے ہے۔ الغرض راہ سلوک میں میرے لئے صعود اور ہیوط کی یعنی اوپر جانے اور نیچے اُترنے کی یہ مہم اس طرح تمام ہوئی۔ اور سلوک کا یہی وہ مختصر طریقہ ہے جو ”جذب“ سے بہت مناسب ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کے حال سے بھی بہت مشابہ ہے۔

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے صفحہ ۶۰

اٹھا رکھو اس مشاہدہ

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے لوگوں میں اپنے طریقے کا ایک قالب مجھے عطا فرمایا۔ چنانچہ میں نے اس کا آپا کی روح اقدس سے براہ راست استفادہ کیا۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو چیز مجھے عطا فرمائی تھی، اُس نے اُس چیز کی حقیقت سے بھی مجھے مطلع کیا۔ اور میں نے اُس چیز کو جہاں تک کہ اُس کے سمجھنے کا حق تھا، سمجھ بھی لیا۔ اور اسی ضمن میں میں نے یہ بھی جان لیا کہ یہ جو کچھ مجھے عطا ہوا ہے، یہ اُس حقیقت کا صرف قالب ہے، یہ خود بنفسم وہ حقیقت نہیں، الغرض اس سلسلہ میں جو کچھ میں نے جانا ہے، اُس میں سے چند باتیں تم سے کہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اشریت نو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے، جو کہ تمام جہانوں کا پرکار ہے۔

طریقہ سلوک کی حقیقت کا بیان ————— تمہیں معلوم ہونا چاہیے

کہ اللہ تعالیٰ کے جو مقرب بندے ہیں، ان میں سے جس پر چاہتا ہے، وہ اپنا فضل و کرم کرتا ہے۔ یعنی اُس کو طریقہ سلوک سے نوازتا ہے، چنانچہ کتنے ہی عارف ہیں جو اس نکتہ کو صحیح طور پر سمجھنے سے عاجز رہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عارف کو ایسے اذکار و افکار سے مطلع فرماتا ہے، جن کے ذریعے یہ عارف سلوک کی راہ طے کر کے فنا و بقا کے مقام پر پہنچ جاتا ہے، اُس وقت یہ عارف یوں کہتے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے سلوک کے طریقے سے سرفراز فرمایا۔ اور بے شک اس میں نہ اپنے خیال کے مطابق سچا ہوتا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ طریقہ سلوک ان اذکار و افکار کا نام نہیں۔ بلکہ یہ عبارت ہے اُس حقیقت سے جو ملاءِ اعلیٰ میں مستقر ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر سلوک کے اس طریقے کے متعلق ایک فیصلہ فرماتا ہے اور یہ فیصلہ وہاں سے ملاءِ اعلیٰ میں نازل ہوتا ہے۔ اور وہاں پر یہ جاگزیں ہو جاتا ہے۔ پھر اس فیصلے کے مطابق عالمِ ناسوت میں حکم اُترتا ہے۔ باتِ اصل میں یہ ہے کہ ملاءِ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ کے ہر ارادہ اور اُس کی ہر خواہش کے لئے جب تک کہ وہ وہاں موجود ہے، اس عالمِ ناسوت میں اُس کا کوئی نہ کوئی نمونہ یا اُس کا محلی اور ظرف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس عالم میں کسی سلوک کا طریقہ منسوخ ہو جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ میں اللہ کا جو ارادہ اس سلسلہ

میں قائم و مستقر رکھا، اور جس کا لازمی نتیجہ سلوک کا یہ طریقہ تھا، وہ ارادہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد تم کو لوگوں میں کہیں بھی اس طریقہ سلوک کا نمونہ یا اس کا محل اور ظرف نظر نہیں آئے گا۔ اب اگر تمام کے تمام اہل زمین جمع ہو جائیں، اور وہ چاہیں کہ وہ طریقہ سلوک جس کے متعلق ارادہ الہی ملا، اعلیٰ میں قائم رہے، اس طریقے کا عالم ناسوت میں جو محافظ ہے، اور میری مراد محافظ سے اس ارادہ الہی کے نمونے یا محل یا ظرف سے ہے، جس کا کہ ابھی ذکر ہوا ہے، اس محافظ کو ناپو کر دیں۔ اور اس سلسلہ میں وہ اس طریقے کے اصحاب اور اس کی حفاظت کرنے والوں کو بے دریغ قتل بھی کریں، لیکن جب تک اس طریقے کی اصل بنیاد یعنی اس کے متعلق ارادہ الہی جو ملا، اعلیٰ میں قائم و مستقر رہے برقرار ہے، یہ سب کے سب لوگ خواہ وہ کتنی بھی کوشش کریں، اس طریقے کو عالم ناسوت سے فنا نہیں کر سکتے۔ اور اس طرح اگر تمام کے تمام اہل زمین جمع ہو کر اس اسیر میں کوشاں ہوں کہ جب ملا، اعلیٰ میں اس طریقہ سلوک کا تقاضہ موجود نہیں رہا، وہ اس زمانے میں اس طریقے کی کسی کجی کو ٹھیک کر دیں۔ یا اس میں جو مفاسد پیدا ہو گئے ہیں، ان کی اصلاح کریں، تو وہ کبھی بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک تالاب یا حوض ہے، جس میں ستاروں کا عکس پڑ رہا ہے، اب جب تک کہ تالاب یا حوض میں پانی ہے۔ اور آسمان پر ستارے، کسی بشر کی یہ طاقت نہیں کہ وہ پانی میں ان ستاروں

کے عکس کو روک سکے +

الغرض سلوک کا یہ طریقہ درحقیقت وہ اذکار و افکار نہیں ہیں جو اس عالمِ ناسوت میں موجود ہوتے ہیں۔ بلکہ اس طریقے کی اصل وہ ارادہ الہی ہے، جو ملائعہ اعلیٰ میں قائم ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ خود کسی بندے کے حق میں فیصلہ فرماتا ہے تو پھر اُسے سلوک کا یہ طریقہ عطا ہوتا ہے، اب اس طریقے کے متعلق ارادہ الہی جو ملائعہ اعلیٰ میں قائم ہے، اُس کی تشریح و توضیح اور اُس کے اجزاء اور ارکان کا بیان تو یہ سوائے اُس شخص کے جو بہت ہی ذہین ہو، کسی کے لئے ممکن نہیں، اور اس ضمن میں میرے رب نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ پہلے آسمان سے ارادہ الہی کے سلسلہ میں جو مدد نازل ہوتی ہے، وہ بقول،
توسطات اور لباس کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور دوسرے آسمان سے مدد و مرتبہ قواعد جو لکھے جاتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں، نازل ہوتے ہیں۔ اور پھر ایک بزرگ سے دوسرے بزرگ تک ان کی روایت ہوتی ہے اور ان قواعد کو انسانوں کے سینے اپنے اندر جگہ دیتے، اور کتابوں کے سفینے اُن سے اپنے صفحات بھرتے ہیں۔ تیسرے آسمان سے ایک طبیعی رنگ کا فیضان ہوتا ہے۔ اور یہ رنگ طبیعت بن جاتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کے طبائع اس طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور اس طبیعی رنگ کے لئے اُن کے اندر جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اُس کی حمایت کرتے ہیں، اُس کی مدد کو پہنچتے ہیں، اور اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور اُس سے

ایسی محبت کرتے ہیں، جیسے اپنے اموال سے اپنی اولاد سے، اور اپنی جالوں سے +

جو کھٹے آسمان سے نکلے، قوت اور تسخیر کا نزول ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے بڑے اور چھوٹے، علماء اور امراء سب کے سب اُس سے مسخر ہو جاتے ہیں۔ پانچویں آسمان سے سختی اور شدت نازل ہوتی ہے، چنانچہ اُس سے جو اذکار کرتا ہے، تم اُس کو مصیبتوں میں گرفتار، بلاؤں میں مبتلا اور ملعون اور عذاب میں اسیر دیکھو گے۔ گویا غیب کی کوئی قوت ہے جو اُس کی مدد کر رہی ہے۔ چھٹے آسمان سے اُس پر بڑی پُر عظمت ہدایت کا فیضان ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ شخص لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک واسطہ بن جاتا ہے۔ اور ساتویں آسمان سے اُسے ایک مستقل شرف عطا ہوتا ہے جو پتھر کے اندر کی اُس لکیر کی طرح ہوتا ہے کہ جب تک پتھر کے جوڑ جوڑ الگ نہ کئے جائیں۔ اور اُس کے اجزاء کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا جائے، یہ لکیر اُس پتھر سے زائل نہیں ہو سکتی +

یہ سات ارکان ہیں، جن کا ارادۃ الہی کے ضمن میں سات آسمانوں سے اس طرح فیضان ہوتا ہے۔ اور یہ سب سب ارکان ملا ملے ہیں اس طرح مل جاتے ہیں کہ ان تمام کا وہاں ایک جسم بن جاتا ہے۔ اور پھر اس جسم میں تبدیلی اعظم کی طرف سے "حذب" کی روح پھونکی جاتی ہے، جو اس کے لئے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک انسانی جسم میں روح کی ہوتی ہے۔ چنانچہ جو شخص اس طریقہ سلوک کے اذکار و

افکار کا لباس پہن لیتا ہے۔ اور اُس کے حسن و جمال سے وہ آراستہ و پیراستہ ہو جاتا ہے، تو اس کی وجہ سے اُس کو رحمت الہی ڈھانپ لیتی ہے۔ اور اُس پر اُس کے اوپر سے، اُس کے نیچے سے، اُس کے دائیں سے اور اُس کے بائیں سے، اور وہاں سے جہاں کا کہ اُسے سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ "خائب" کا نزول ہوتا ہے، اور پھر طلاء اعلیٰ کے اکابر راہ سلوک کے اس طفل کی تربیت کرتے ہیں، اور طلاء سافل والے اُس کی خدمت کرتے ہیں۔ اور اس طرح سلوک کے اس طفل کی حیثیت برابر مستقل ہوتی جاتی، اور اُس کی شان بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ساعت آتی ہے کہ اس کے متعلق اللہ کا حکم صادر ہو جاتا ہے۔ الغرض اس طرح سلوک کا طریقہ معرض وجود میں آتا ہے +

سلوک کے طریقہ کی اس مثال پر تم اُن مذاہب کا بھی قیاس کر لو جو دین کے اصول و فروع کے سلسلہ میں بنتے ہیں۔ اب ایک شخص ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ نے اُسے سلوک کا کوئی طریقہ یا فقہ کا کوئی مذہب عطا فرمایا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے، اگر اس طرح طلاء اعلیٰ کی طرف سے اُسے یہ طریقہ سلوک اور مذہب فقہ نہیں دیا گیا تو یقیناً وہ اس معاملے کی جو اصل حقیقت ہے، اُس کو سمجھنے سے عاجز رہے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ہر شخص کو خدا تعالیٰ کی طرف سے سلوک کا طریقہ یا فقہ کا مذہب یوں ہی نہیں مل جایا کرتا۔ اللہ کے

ہاں اندھیر نہیں ، اور نہ اُس کے ہاں کسی چیز میں گڑ بڑ ہوتی ہے۔
 چنانچہ یہ نعمت اُسی کو ملتی ہے ، جو اپنی جبلت سے مبارک اور پاک
 ہو ، اور اُس کو سات آسمانوں سے ، طاعا علی سے اور طاعا سافل سے
 مدد ملے۔ اور نیز وہ تدلی اعظم کی مخصوص رحمت سے بہرہ یاب ہو۔ الغرض
 کتنے ہی عارف ہیں ، جو بڑی معرفت والے اور مقام قنایں بڑے
 پہنچے ہوئے اور مقام بقا کے کامل ہیں ، لیکن چونکہ اُن کی جبلت مبارک
 اور پاک نہ تھی ، اس لئے اُن کو یہ نعمت عطا نہ ہوئی۔ اور پھر ہر شخص
 کا یہ منصب بھی نہیں ہوتا کہ وہ طریقہ سلوک کی حفاظت کر سکے۔ واقعہ
 یہ ہے کہ ہر کام کے لئے ایک آدمی ہوتا ہے ، جو اُس کام کے لئے
 پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس میں اُس کام کو کرنے کی جبلت استعداد ہوتی
 ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ سلوک کے طریقے کے ظہور کی کیا صورت ہوتی
 ہے ، تو اس کے متعلق واضح ہو کہ یہ عام متعارف مظاہر سے الگ کسی
 دوسرے مظہر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور اس کی پہچان یہ ہوتی ہے
 کہ اس کی وجہ سے اشیاء اور افعال میں بڑی برکت پیدا ہو جاتی ہے۔

اُنسوال مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنفی مذہب کے ایک بڑے اچھے طریقے سے مجھے آگاہ فرمایا۔ اور حنفی مذہب کا یہ طریقہ اُن مشہور احادیث سے جو امام بخاری اور اُن کے اصحاب کے زمانے میں جمع کی گئیں، اور اُن کی اُس زمانے میں جانچ پڑتال بھی ہوئی، موافق تریں ہے۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کے اقوال میں سے وہ قول لیا جائے جو مسئلہ زیر بحث میں مشہور احادیث سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ اور پھر اُن فقہائے احناف کے فتاوے کی پیروی کی جائے، جو علمائے حدیث میں شمار ہوتے ہیں، چنانچہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور اُن کے دونوں ساتھی جہاں تک کہ اُن چیزوں کے اصول کا تعلق تھا، وہ

اس معاملے میں خاموش رہے۔ اور انہوں نے اُن کے بارے میں
 ممانعت کا کوئی حکم نہیں دیا۔ لیکن ہمیں ایسی احادیث ملتی ہیں، جن
 میں ان چیزوں کا ذکر ہے۔ اس حالت میں ان چیزوں کا اثبات ظاہر
 ہے لازمی اور ضروری ہوتا ہے۔ اعمال اور احکام میں اس روش
 کو اختیار کرتا بھی مذہب حنفی میں داخل ہے۔

بیسواں مشاہدہ

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اور آپ کے منبر کے بیچ کا قطعہ زمین جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے۔ جہاں تک اس واقعہ کی اصل حقیقت کا تعلق ہے، وہ یہ ہے کہ ہم نے سب انوار سے برتر و فائق نور اس مقام پر دیکھے ہیں۔ اور نیز ہم نے دیکھا ہے کہ جو شخص وہاں نماز پڑھتا ہے، وہ نور کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے، خواہ وہ اُس طرف ملتفت ہی کیوں نہ ہو۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ ہوتا کیسے ہے؟ سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے، یعنی اُس کے جوہر روح میں ترقی اعظم کا وہ مثالی مظہر اور وہ نقطہ تدبیر جس کا کہ ذکر اوپر ہو چکا ہے، داخل ہو جائے، تو وہ شخص ذات حق کا منظور نظر

اور طلاء اعلیٰ کا چاہیتا بن جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ شخص جگہ اُترتا ہے، تو اُس جگہ کے ساتھ طلاء اعلیٰ کی ہمتیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اور اُس طرف فرشتے فوج در فوج اور انوار موج در موج لپکتے ہیں۔ اور خاص طور پر اگر اُس محبوب شخص کی ہمت اُس جگہ سے خصوصی تعلق رکھتی ہو تو پھر اُس مقام کی تاثیر کا کیا کہنا +

اور نیز بات یہ ہے کہ ایک عارف جو معرفت اور حال میں کامل ہوتا ہے، اُس کی ہمت میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ ذات حق کی نظر عنایت کا مرکز بن جاتی ہے۔ چنانچہ اُس کی اس ہمت کا اثر اُس عارف کے اہل و عیال پر، اُس کے مال پر، اُس کے مکان پر، اُس کی نسل پر، اُس کے نسب پر، اور اُس کے قرابت داروں اور ساتھیوں پر پڑتا ہے۔ اور اس ہمت کے ضمن میں مال اور جاہ کی قبیل کی چیزیں بھی آ جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ کامل ان کی بھی اصلاح کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کاملوں کے آثار کمالات دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

کیسواں مشاہدہ



علمائے حریں نے بعض صوفیاء پر اعتراضات کئے تھے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اعتراضات کا جواب لکھنے کی اجازت چاہی۔ لیکن آپؐ نے اس کی اجازت نہ دی۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ یہ علماء جو صوفیاء پر معترض ہیں، اُن کا جتنا بھی مبلغ علم ہے، وہ اُسی کے مطابق مصروفِ عمل ہیں۔ اور اپنی بساط کے مطابق کسی نہ کسی حیثیت سے لوگوں کے دلوں کے تصفیہ میں لگے ہوئے ہیں۔ اور علم اور دین کی اشاعت میں سرگرم کار ہیں۔ اس لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب، اُن کے ہاں زیادہ محترم اور اُن کی نظروں میں زیادہ محبوب ہیں، بہ نسبت اُن صوفیاء کے جو ارباب "فتاویٰ بقا" ہیں، اور "جذب" جو نفسِ ناطقہ کی اصل سے

پھوٹتا ہے ، اور "توحید" اور اسی طرح کے تصوف کے جو اور بلند مقامات ہیں ، اُن پر سرفرازیں ہیں ۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرب الہی کے دو طریقے ہیں ۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں آئے تو قرب الہی کا یہ طریقہ بھی بندوں کی طرف منتقل ہو گیا ۔ قرب الہی کے اس طریقے میں واسطوں کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اور اس کے پیش نظر طاعات و عبادات کے ذریعہ اعتقاد و جمادح کی ، اور ذکر و تزکیہ اور اللہ اور اُس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے ذریعہ قوائے نفس کی تہذیب و اصلاح ہوتی ہے ۔ چنانچہ عام لوگوں کی تہذیب و اصلاح کے لئے علوم کی نشر و اشاعت ، نیک کاموں کا حکم دینا ، برائیوں سے روکنا ، اور ایسے کاموں میں کوشاں ہونا جن سے سب انسانوں کو عام طور پر فائدہ پہنچے ، اور اسی قبیل کے دوسرے کام جو اوپر کے کاموں سے ملتے جلتے ہوں ، یہ سب کے سب قرب الہی کے اسی طریقے میں داخل ہیں ۔

قرب الہی کا دوسرا طریقہ اللہ اور بندے کے براہ راست اتصال کا ہے ۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک بندہ کہیں بھی پیدا ہو ، وہ اس طریقہ کو پالیتا ہے ، اور جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ اُس پر فیضان کرے ، وہ اُس سے مستفید ہوتا ہے ۔ قرب الہی کے اس طریقے میں واسطہ سرے سے ہوتا ہی نہیں ۔ چنانچہ جو شخص اس طریقہ پر چلتا ہے ، اُس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے " انا " کی حقیقت کو بیدار کرتا

ہے۔ اور اپنے "انا" ہی کی بیداری کے ضمن میں اُسکو ذات حق کا تنہا اور شعور حاصل ہوتا ہے اور اس سلسلہ کے یہ "فتاویٰ" اور "جذب" اور "توحید" وغیرہ مقامات تصوف ہیں۔
 قرب الہی کے اس دوسرے طریقے کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ طریقہ نہ تو عالی منزلت تھا اور نہ آپ کو یہ مرغوب ہی تھا۔ آپ کی ذات اقدس تو قرب الہی کے پہلے طریقے کا عنوان تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی اس عنایت کا مرکز بنایا تھا کہ آپ کے ذریعہ قرب الہی کے پہلے طریقے کا فیض عام طور پر پھیلے۔ اور آپ اُس کے ظہور کا باعث بنیں +

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں طریقوں میں تفوق و برتری کس کو حاصل ہے؟ بات دراصل یہ ہے اگر ہم دو چیزوں کو ایک اعتبار سے دیکھیں تو اُن میں تفوق ہوگا، اور انہی چیزوں کو اگر کسی دوسرے اعتبار سے دیکھا جائے، تو اُن میں تفوق نہیں ہوگا۔ اب اگر ہم چیزوں کو اس اعتبار سے دیکھو کہ وہ کس طرح وجود کے اندر ہیں۔ اور اس وجود کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے تمام چیزوں کا ہر جہت سے احاطہ کر لیا ہے، الغرض اگر ہم چیزوں کو اس اعتبار سے دیکھو گے۔ تو بے شک تمہیں ان میں ایک دوسرے پر فائق ہونے کے اسباب اور وجوہ مل جائیں گے۔ اور اس بنا پر تم ایک چیز کو دوسری پر فوقیت بھی دے سکتے ہو۔ اور اس حالت میں ان میں آپس میں ایک دوسرے سے تفوق کے معاملہ میں مقابلہ بھی رہے گا لیکن اگر ہم ان چیزوں کو اس اعتبار سے دیکھو کہ یہ سب ایک ہی سبب سے متعلق ہیں۔ تو پھر ایک اعتبار سے تو اُن میں کوئی وجہ تفوق نہیں ہوگی

البتہ دوسرے اعتبار سے ان میں یہ تفوق ممکن ہوگا۔ اور اس طرح ایک چیز فائق اور افضل ہوگی، اور دوسری بالکل عظیم الفضل +

الغرض جب یہ نور عالم ناسوت کی طرف منتقل ہوا تو سالکوں نے قُرب الہی کے ان دونو طریقوں سے استفادہ کیا۔ جو اہل جذب تھے، اُن کو تو اس نور سے ایک محفل سی باطنی بیداری حاصل ہو گئی، اور اسی سے اُن پر معارف کا انکشاف ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ تم عارفوں کو دیکھتے ہو کہ اُن کے لئے کتاب و سنت سے معارف کی کرنیں پھوٹی ہیں۔ اور جو اہل سلوک ہیں اُن پر اس نور کی طرف پورے سوز و گداز سے رجوع کرنے اُس کے اندر گم ہوتے اور پھر اُس نور میں بقا حاصل کرنے کے ذریعہ یہ معارف منکشف ہوتے ہیں۔ بس اب تم اس میں غور و فکر کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ بڑا دقیق ہے +

بایں سوال مشاہدہ

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کس اعتبار سے افضل ہیں ، باوجود اس کے کہ حضرت علیؑ اس اُمت کے پہلے صوفی ، پہلے مجذوب اور پہلے عارف ہیں۔ اور یہ کمالات سوائے آپ کی ذات میں اور کسی میں نہیں ہیں۔ اور اگر فقوڑے سے کسی میں ہیں بھی تو وہ محض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیلی کی حیثیت سے ہیں۔ نبی نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے یہ سوال پیش کیا تو مجھے بتایا گیا کہ آپ کے نزدیک فضیلت کلی کا مدار امور نبوت پر ہے۔ جیسے کہ عہد کی اشاعت ، لوگوں کو دین کا مطیع و فرمانبردار بنانا ، اور اسی طرح کے اور امور جو نبوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ فضیلت جس کا مرجع ولایت یعنی "جذب" اور "فنا" ہے ، یہ تو ایک جزئی فضیلت ہے۔ اور ایک اعتبار

سے یہ فضیلت کم درجہ کی بھی ہے ۔

اس ضمن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا تو یہ حال تھا کہ وہ سرتاپا امور نبوت کے لئے وقف ہو گئے تھے۔ اور میں نے ان دونوں کو اپنے مشاہدہ باطنی میں یوں دیکھا کہ فوارہ کی طرح اُن سے پانی اُبل رہا ہے۔ الغرض خدا تعالیٰ کی وہ عنایت جس کا مرکز و موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی ، وہ بعینہ ان دونوں بزرگوں کے وجود گرامی میں صورت پذیر ہوئی ، اور یہ دونوں کے دونوں اپنے اس کمال کی وجہ سے بمنزلہ اُس عرص کے ہیں کہ جس کا جوہر کے بغیر قیام ممکن نہیں ہوتا۔ اور جوہر کے لئے اُس کا ہونا وجہ تکمیل ہوتا ہے ، اور گو حضرت علیؓ نسب کے اعتبار سے اور نیز اپنی جبلت اور محبوب فطرت کے لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے زیادہ آپؐ سے قریب تھے۔ اور "جذب" میں بھی قوی تر اور "معرفة" میں بھی بلند تر تھے ، لیکن اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے منصب نبوت کے کمال کے پیش نظر حضرت علیؓ سے زیادہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف مائل تھے۔ اور اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ علماء جو معارف نبوت کے حامل ہیں ، وہ شروع سے حضرت علیؓ پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو فضیلت دیتے چلے آئے ہیں۔ اور جو علماء معارف ولایت کے حامل ہیں ، وہ حضرت علیؓ کو افضل مانتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ دونوں بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں مدفون ہیں ۔

بات دراصل یہ ہے کہ بہت سے روزمرہ کے واقعات بظاہر معمولی ہوتے ہیں، لیکن ان واقعات کا ایک معنوی اساس ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دفن ہونے کا واقعہ ہے۔ اور اسی طرح آپؐ کی قبر کے ارد گرد حجرے کے ہونے کا واقعہ ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ آپؐ کی قبر تک نہیں جاسکتے۔ چنانچہ حجرے کا آپؐ کی قبر کے گرد ہونا سبب بن گیا ہے آپؐ کے اس قول کی صداقت کا کہ ”اے اللہ! میری قبر کو صنم نہ بنانا، تاکہ کہیں لوگ تجھے چھوڑ کر میری قبر کو نہ پوجنے لگیں“۔

تیسواں مشاہدہ

میں نے دیکھا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نظر ہے۔ اور گویا یہی نظر ہے جو حاصل مقصود ہے آپ کے حق میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کا کہ ”اگر تُو نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا ہی نہ کرتا“ یہ معلوم کر کے میرے دل میں اس نظر کے لئے بڑا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور مجھے اس نظر سے محبت ہو گئی۔ چنانچہ اس سے یہ ہوا کہ میں آپ کی ذات اقدس سے متصل ہوا۔ اور آپ کا اس طرح سے طفیلی بن گیا جیسے جوہر کا عرض طفیلی ہوتا ہے۔ غرضیکہ میں اس نظر کی طرف متوجہ ہوا۔ اور میں نے اس کی حقیقت معلوم کرنی چاہی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں خود اس نظر کا محل توجہ اور مرکز بن گیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نظر خاص اس کے ارادہ

ظہور سے عبارت ہے۔ اور اس سلسلہ میں ہوتا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی "شان" کو ظاہر کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس "شان" کو پسند کرتا اور اس پر اپنی نظر ڈالتا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "شان" ایک فرد واحد کی "شان" نہیں۔ بلکہ آپ کی "شان" عبارت ہے ایک عام مبدائے ظہور سے جو تمام بنی نوع انسان کے قوالپ پر پھیلا ہوا ہے۔ اور اسی طرح بنی نوع انسان کی حیثیت ایک اور مبدائے ظہور کی ہے جو تمام موجودات پر حاوی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کل موجودات کی غایت الغایات اور ظہور وجود کے نقاط کا آخری نقطہ ہیں۔ چنانچہ سمندر کی ہر موج کی حرکت اسی لئے ہے کہ آپ تک پہنچے۔ اور ہر سیلاب کو یہی شوق سمایا ہوا ہے کہ آپ تک اس کی رسائی ہو۔ ہمیں چاہئے کہ اس مسئلہ میں خوب غور و تدبر کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ بڑا ہی دقیق ہے۔

۱۔ سورہ الرحمن میں ہے: "کَلَّ يَوْمَ هُوَ فِي شَأْنٍ" بیان "شان" کا اشارہ اسی طرف ہے۔ (مترجم)

چوبیسواں مشاہدہ

میں نے معلوم کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور اُن سے تو متل علمائے حدیث، اور جو لوگ کہ ان کے زمرے میں ہیں، اُن کے لئے ہے۔ اور نیز یہ کہ علم حدیث اور اُس کی حفاظت لوگوں کے لئے ایک مضبوط سہارا اور لمبی رسی ہے، جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ تمہیں چاہئے کہ محدث بنو۔ اور اگر محدث نہیں بن سکتے تو کسی محدث کے طفیلی ہی بن جاؤ۔ میرے نزدیک ان دو کے سوا کسی چیز میں خیر نہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے *

پچیسواں مشاہدہ

عارف جب کمال کو پہنچتا ہے تو اُس کی رُوح ملاءِ اعلیٰ سے
جاملتی ہے۔ ملاءِ اعلیٰ میں ایک بلند اور عالی مرتبہ بارگاہ ہے جہاں
کامل عارفوں کی ہمتیں تو پہنچ جاتی ہیں، لیکن اُس تک اُن کے بدن
نہیں پہنچ پاتے۔ اس ضمن میں ان کاملوں کی تمام کی تمام ہمتیں ایک
آدمی کی ہمت کی طرح صرف ایک ہی تدریج پر منحصر ہوتی ہیں۔ گو تفصیلات
میں ان میں آپس میں اختلافات ہوتے ہیں۔ الغرض ملاءِ اعلیٰ کی اس
بلند اور عالی مرتبہ بارگاہ میں جب ان کاملوں کی ہمتیں پہنچتی ہیں تو
اُس مقام پر اللہ تعالیٰ کی تدریج ہوتی ہے۔ اور یہ تدریج اپنے نور سے
کاملوں کی ان ہمتوں کو پوری طرح سے ڈھانک لیتی ہے۔ چنانچہ
اُن کی ہمتیں ان انوار کی روشنی میں چھپ جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ نہ تو

اُن ہمتوں اور انوار میں وہاں فرق کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اور نہ ان ہمتوں میں باہم ایک دوسرے میں تیزی کی جاسکتی ہے +

اب اگر میں ان کاملوں کی اس حالت کو واضح کرنے کے لئے کوئی مثال دوں تو یہ نہ ہو کہ تم مجھے اس مثال کی تفصیلات میں ہر نشیب و فراز میں کھینچے کھینچے لئے پھرو۔ آخر مثالیں تو چیزوں کی کسی ایک ہی اعتبار سے وضاحت کرتی ہیں۔ الغرض ان کاملوں کی ہمتوں کو اُس "ہیولی" کی طرح سمجھئے جو ہر شے میں پوشیدہ ہے۔ اور جس کا ادراک ہم صرف ان احکام و آثار ہی سے کر سکتے ہیں، جو شے موجود سے "ہیولی" کے مساوات کے ذریعہ جو حقیقت میں اصل بنیاد ہے اُس شے کی استعدادوں اور قابلیتوں کی ظاہر ہوتے ہیں، اور تدریجی الہی کا وہ نور جو ان ہمتوں کو اس طرح ڈھانپ لیتا ہے کہ اُس کے اندر یہ ہمتیں بے نشان ہو جاتی ہیں۔ اس نور کی مثال "ہیولی" کے مقابلے میں "صورت" کی سمجھئے، کہ جب ہم کسی چیز کا ادراک کرتے ہیں تو سب سے پہلی چیز جو ہمارے ادراک میں آتی ہے وہ یہی "صورت" ہوتی ہے۔ اور جس طرح ایک شے کی استعدادوں اور قابلیتوں کی اصل "ہیولی" ہے، اسی طرح یہ "صورت" اُس شے کی فعلیات کی اصل ہے +

الغرض ملائکہ اعلیٰ کا یہ مقام بلند جہاں کہ کاملوں کی ہمتوں کو تدریجی الہی کا نور ڈھانپ لیتا، اور اُن کو اپنے اندر گم کر لیتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے ملائکہ اعلیٰ کے علوم میں سے احکام و آثار کا نزول ہوتا ہے۔

اور جہاں اُن کی تفصیلی ہمتیں اُن کے لئے لطیف ہو جاتی ہیں۔ اور انکی
 جلا اور ترقی کر جاتی ہے۔ اور پھر اُن کی ہمتوں کے مساوات حقیقۃ القدس
 میں ایک کیفیت ظاہر ہوتی ہے، جس پر نور پوش کرتا ہے۔ اور یہ اُس
 کیفیت کو اُس حالت میں نہیں رہنے دیتا، جس میں کہ وہ پہلے تھی۔ بلکہ
 وہ اُس کو اپنے جوہر سے قریب کر دیتا ہے۔ اور اس طرح بارگاہ مقدسہ
 کے حالات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ چنانچہ کبھی وہاں رضا کی حالت
 ہوتی ہے اور کبھی غضب کی، اور کبھی ہنسی اور بشارت کی۔ اور کبھی فیض
 و اعراض کی۔ اور بعض اوقات کسی چیز کے ممکن ہونے کی حالت ہوتی ہے۔
 اور بعض اوقات اُس کے محال ہونے کی۔ اور کبھی کسی چیز کو واجب کیا جاتا
 ہے۔ اور کبھی کوئی چیز حرام قرار پاتی ہے۔ اور کبھی پہلے کے حکم کو منسوخ
 قرار دیا جاتا ہے۔ الغرض یہ اور اسی قبیل کے بعض اور حالات بارگاہ مقدسہ
 میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اب جو شخص اس بارگاہ مقدسہ اور اس کے
 حالات و کوائف، اُس کے انشراح و بسط، اس کی عزیمت، اور ہر روز
 اس کی نئی شان کا مشاہدہ کرے تو اُس کے لئے قرآن مجید کی آیات
 متشابہات محکمت بن جاتی ہیں۔

وَلَمْ يَلْقَ بِشَيْءٍ مِّنْ شَكَلٍ سَرِيَّةٍ

یعنی اُس کے لئے اُن شکلوں میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا۔

اور جو شخص اس بارگاہ مقدسہ کے مشاہدہ سے محروم رہے تو اُس کے

لئے مناسب یہی ہے کہ وہ ان سب امور کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔

اور اجمالی طور پر وہ ان سب پر ایمان لے آئے۔ جب کہ تم نے یہ سب کچھ جان لیا، اب تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بارگاہ مقدسہ قبلہ ہے ملا اعلیٰ کی ہمتوں کا اور مرکز ہے اُن کی توجہ کا۔ اور مسجد ہے اُنکی پشیمانیاں کا۔ پس جو شخص اس مبلغ کمال تک پہنچ گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اپنے علم میں اُس کے لئے یہ مقدر کر رکھا تھا کہ اُسے وہاں مقام فنا و بقا حاصل ہو۔ تو ایسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص اس مقام میں گم ہو جاتا ہے۔ اور یہاں اُس کی رُوح اُس کے جسم کی منتظم نہیں رہتی۔ بلکہ یہی بارگاہ مقدسہ اُس کی منتظم بن جاتی ہے۔ اور یہی اُس کی مُرشد اور اس کو الہام کرنے والی ہوتی ہے *

میں نے اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑا۔ گویا کہ میں اُن کا طفیلی بن گیا۔ چنانچہ مجھے ایک چمکتا ہوا پیالہ عطا ہوا۔ میں تمہیں اس پیالے کی کیفیت کیا بتاؤں۔ وہ جو کچھ تھا، تھا۔ میں اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہوں *

اس بارگاہ کے برابر میں ایک اور مقام بھی ہے جو اس سے کم مرتبہ ہے اور یہ ملا سائل کی ترقی کا منتہا، اُن کے امور کا مرکز، اُن کے الہام کا موضع، اُن کے فیصلوں کی عدالت، اور اُن کی توجہ کا نصب العین ہے۔ یہ مقام اُس بارگاہ مقدسہ سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اور اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی تدلی ہوتی ہے۔ اور اس تدلی ہی کی وجہ سے۔ ذات حق کی طرف ان امور کی نسبت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے بنائین سے محبت کرتا ہے،

اور بعض معاملات میں اپنے بندوں کی رضا مندی پر چلتا ہے ۔ وغیرہ
وغیرہ ۔

افرض بارگاہ مقدسہ اور یہ مقام جو ملاء سافل کا مقصود و منشاء ہے
یہ دونوں کے دونوں ایسی حقیقتیں ہیں کہ ان کی معرفت اس قدر دقیق اور
بلند ہے کہ عام عقول ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں ۔ باقی اللہ تعالیٰ تو
توفیق دینے والا ہے ہی ۔

چھبیسواں مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے مجھ پر معرفتِ الہی کے احوال کاملہ میں سے جن بہت سے علوم کا انکشاف ہوا، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ عارفِ دوسروں سے اس معاملہ میں ممتاز ہوتا ہے کہ اُس میں اجزائے فلکی کا ظہور بڑا قوی اور اُن کا حکم بڑا موثر ہوتا ہے۔ اور بات یہ ہے کہ یہی فلکی اجزاء ہیں جو ذریعہ بنتے ہیں اس عالم میں الہی تقاضوں کے قیام پذیر ہونے کا۔ اور پھر یہی الہی تقاضے ان فلکی اجزاء کے مقاصد و سعائی کو بارگاہِ حق کے لئے مناسب بنا دیتے ہیں *

ان علوم میں سے جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے حاصل ہوئے، ایک علم یہ ہے کہ عارف جو معرفتِ الہی میں کامل ہوتا ہے۔ اُس کے لئے ضروری ہے کہ دنیاوی، جسمانی اور روحانی

علائق اُس سے پوری طرح دُور ہوں۔ اور وہ اپنی کیفیات اور جذبات میں تروتازہ ہو اور اس غور و فکر نے کہ وجود باری موجودات میں کس طرح جاری و ساری ہے، اور مبدائے اول اپنے ارادۂ حیات میں عالم کے مظاہر حیات میں کیسے متوجہ ہوتا ہے، اس شخص کو اس غور و فکر نے فرسودہ نہ کر دیا ہو۔ اس ضمن میں مجھ پر یہ امر بھی آشکارا ہوا کہ یہ حقیقت جزوی معانی میں سے ہے جو فلکِ زحل کے مقابل ہے۔ چنانچہ جب اس شخص پر الہی رنگ کا فیضان ہوتا ہے تو اس کا دنیوی، اُتروی جسمانی اور روحانی علائق سے منقطع ہونا "محبت ذاتی" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور محبت ذاتی "سے مراد وہ محبت ہے جو اشرقائے کے نقطہ ذات کی طرف سرتاپا متوجہ ہوتی ہے۔ اب اگر ایک عارف ہے کہ دنیوی، اُتروی، جسمانی اور روحانی علائق سے اُس کی کنارہ کشی اور ہر چیز سے اُس کے پوری طرح منقطع ہونے میں پوری طرح سدراہ ہیں، مقام بقا اور موجودات میں تصرف حق اور مبدائے اول سے اُس کے ارادۂ حب کا ظہور جو مبدائے اول کے تشخص پذیری کے وزن سے ہوتا ہے، تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عارف، عارفِ کامل نہیں۔ بلکہ عارفِ کامل ہے کہ وہ ان سب علائق سے کلیتہً کنارہ کشی کو اپنے باطن میں اس طرح جگہ دیتا ہے کہ اس عالم کے مظاہر میں سے کسی منظر کی محبت بھی خواہ وہ مظهر اس طرح ذات حق کے ساتھ قائم ہو کہ وہ عنوان ہو "محبت ذاتی" کا اور بدن ہو "محبت ذاتی کی روح" کا۔ اور قالب ہو اُس کی حقیقت کا۔ اس عارف کی کل علائق سے کنارہ کشی اور انقطاعِ کامل

کو کسی طرح ملوث نہیں کرتی۔ چنانچہ یہ عارف ان مظاہر سے اپنی ذات کے لئے محبت نہیں کرتا بلکہ اُس کی ان مظاہر سے محبت ذات حق کے لئے اور نیز خلق کے خیال سے ہوتی ہے۔ اور پھر اُسے ان مظاہر سے بحیثیت مظاہر کے محبت نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کی محبت محض ذات حق کے لئے ہوتی ہے۔ اور یہ مظاہر اُس میں محض ایک واسطہ ہوتے ہیں۔

مزید برآں ان علوم میں سے جو صحیحے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کی طفیل حاصل ہوئے، ایک علم یہ بھی ہے کہ ہر وہ عارف جو معرفت حق میں کامل ہوتا ہے، وہ جو کچھ بھی اخذ کرتا ہے، صرف اپنے ہی نفس سے اخذ کرتا ہے۔ اب رہے وہ ذرائع اور اسباب جو اُس کے اخذ علم کا باعث بنتے ہیں، تو اُن کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اُس عارف کے اندر پہلے سے ایک چیز موجود تھی، اور بعد میں اُسے اس کے پاس سے ملتا گیا۔ اور اس طرح اُس چیز کی حقیقت اُس عارف پر منکشف ہو گئی۔ یعنی یہ چیز اُس کے ہاں پہلے سے موجود تو تھی، لیکن وہ اُس پر ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اسباب وہ اُس پر ظاہر ہو جاتی ہے مگر کوئی عارف اخذ علم کے اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقے سے کسی اور سے علم اخذ کرتا ہے، تو معلوم ہوتا چاہیے کہ یہ کامل معرفت الہی میں کامل نہیں ہے۔ اور ان علوم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر وہ عارف جو معرفت الہی میں کامل ہے، وہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور اُس کے اسماء اور اسکی تعلیقات کے ماسوا جو کچھ بھی ہے، ان میں سے کوئی مستخرج نہیں ہے۔ اور یہ عمل

تسخیر یا تو جبر و قہر سے ہوتا ہے۔ اور یہ چیز اُس عارف کامل کے لئے
اُس کی اپنی کیفیت ظہور کی ایک ادنیٰ حالت اور ناقص قوت ہے۔ اور
عارف کامل کی یہ کیفیت ظہور اُس کی جامعیت کو اپنے لباس میں لئے
ہوئے ہوتی ہے۔ اور یہ اُس کے معانی کے لئے حجاب بن جاتی ہے۔
اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اُس عارف کی یہی قوت اور کلکی قوت
میں آپس میں اختلاط ہوتا ہے۔ اور اس ضمن میں یا تو اُس عارف کی
یہی قوت بھی قوی ہوتی ہے اور اُس کی کلکی قوت بھی قوی۔ یا دونوں
ضعیف ہوتی ہیں۔ یا ان میں سے ایک ضعیف ہوتی ہے اور ایک قوی
چنانچہ جب اُس عارف کی اس نوعیت کی یہی قوت اور اُس کی اس طرح
کی کلکی قوت میں اختلاط عمل میں آتا ہے تو ظاہر ہے اُس سے مختلف قسم
کے احکام و آثار ظاہر ہوں گے۔ اور اس کی وجہ سے عوام جو عام طور
پر لباس کو دیکھتے ہیں، اور لباس کے اندر جو جامع شخصیت ہوتی ہے،
اُس پر ان کی نگاہ نہیں پڑتی اور وہ ظاہری صورتوں کو دیکھتے ہیں، لیکن
صورتوں کے پیچھے جو معانی ہوتے ہیں، ان تک ان کی رسائی نہیں
ہوتی، اس طرح کے عارفوں سے ان عوام میں انکار سا پیدا ہو جاتا ہے۔
اللہ تعالیٰ، اُس کے اسماء اور اس کی تدلیات کے علاوہ جو چیزیں
ہیں، ان کی تسخیر کا دوسرا طریقہ جبر و قہر کی بجائے تناسب اور ہم آہنگی
کا ہے۔ اور یہ طریقہ عارف کا اس کی کیفیت ظہور کی اُس شق سے جسے
"لباسی" اور "جمالی" کہنا چاہئے، قوی تر اور موثر تر پہلو ہے۔ اس صورت

میں ہوتا یہ ہے کہ تناسب اور ہم آہنگی کی حقیقت خود عارف کے ایک جزو سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ جزو قائم مقام بن جاتا ہے اُس چیز کا جس کو مسخر کرنا مقصود ہوتا ہے، چنانچہ اس عارف اور اُس کے اس جزو کے درمیان جو تسخیر طلب چیز کا قائم مقام بن جاتا ہے، رگوں اور خالص طور پر "ماسار یقا" رگ کا جال بچھا ہوا ہے تو وہ اُن پوشیدہ رگوں کے ذریعہ سے جو اُس جزو میں اور جس چیز کو کہ مسخر کرنا ہوتا ہے، پھیلی ہوئی ہیں، اُس چیز میں حرکت پیدا کر دیتا ہے۔

یہ دو طریقے تو اللہ تعالیٰ، اُس کے اسماء اور اس کی تدلیات کے ماسوا جو اور چیزیں ہیں، اُن کو مسخر کرنے کے ہوئے۔ لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اُس کی تدلیات کا تعلق ہے، وہ نور ربوبیت کی روشنی سے مسخر نہیں ہو سکتیں۔ ہاں اس ضمن میں ایک مقام "حُب" ہے، جو کہ محبوبیت کے مقابل ہے۔ چنانچہ جب محبوبیت میں حرکت ہوتی ہے تو اس سے مقام حُب بھی متحرک ہو جاتا ہے۔ اور اس مقام حُب کی حرکت سے اسم اور تدلی دو نو کو حرکت ہوتی ہے۔ اور یہ دو نو مقام حُب سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اب اگر کوئی عارف ہے، جو اس وسیع الاثر تسخیر کی قوت کو نہیں جانتا۔ اور نہ وہ اُسے خود اپنے اندر پاتا ہے تو وہ عارف معرفت الہی میں کامل نہیں۔ اور

یہ یونانی زبان کا لفظ ہے۔ ماسار یقا رگیں جگر سے معدہ اور آنتوں تک گئی ہیں۔ ان کا کام قدما سے یونان کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ معدہ اور آنتوں سے کیلوں کو جگر تک پہنچائیں کہ جگر اسے خون اور اخلاط بنا دے۔

(مترجم)

اسی سلسلہ میں، میرا یہ بھی سمجھا ہوں کہ یہ وسیع الاثر تسخیر کی قوت عارف کامل کے اس تجرّد کے حقائق میں سے ایک حقیقت ہے، جو مقابل ہوتی ہے سورج کے جبکہ وہ الہی رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اور اس طرح تسخیر کی یہ قوت جو پہلے سے اُس عارف کے اندر موجود ہوتی ہے اپنا اثر دکھاتی ہے۔

ان علوم میں سے جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے حاصل ہوئے، ایک علم یہ ہے کہ عارف کامل کی روح اُس کے طریقہ تصوّف، اُس کے مذہب، اُس کے سلسلہ، اُس کی نسبت، اُس کی قرابت، اور پھر وہ چیز جو اُس کے قریب ہے، یا اُس کی طرف مشوب ہے، ان میں سے ہر ایک کے ہر پہلو پر نظر رکھتی ہے۔ اور اُس پر برابر متوجّہ رہتی ہے۔ اور عارف کامل کی روح کی اس توجّہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توجّہ بھی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اُس کی تفصیل یہ ہے کہ جب عارف کامل کا نفس جسم کی کدورتوں سے منزہ ہو کر ملائکہ اعلیٰ سے متصل ہو جاتا ہے تو وہاں اُس پر اللہ تعالیٰ اپنی تجلّی فرماتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ تجلّی اُس عارف کے نفس میں ختمی استعداد ہوتی ہے، اُسی کے مطابق نزول فرماتی ہے۔ ہم اس سلسلہ میں اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے پہلے کہیں "ہیولی" اور "صورت" کی مثال بھی دے چکے ہیں۔ غرضیکہ جب اللہ تعالیٰ کی یہ تجلّی عارف کامل

کے نفس پر نازل ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے عارف کامل اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور اس کے نفس کے اللہ تعالیٰ کے رنگ میں اس طرح رنگے جاتے، اور اس کے ساتھ امتزاج اور اختلاط کی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لئے اُس کی تبدیلیات میں سے ایک تبدیلی بن جاتا ہے چنانچہ اس حالت میں جب عارف کامل کا نفس اُن چیزوں کی طرف متوجہ ہو گا کہ ابھی ذکر ہوا ہے، توجہ کرتا ہے۔ تو اُس کی یہ توجہ خود اُس عارف کی طرف بارگاہ قدس کی توجہ اور التفات کا باعث بن جاتی ہے۔ اور پھر جب یہ ہر اُس عارف کے نفس کے اطراف و اکناف میں اُس کے تمام اجزاء میں، اور اس کی رگوں اور اُس کے پھلوں میں، اور اُس کے تمام پھلوں میں متکثر ہو جاتا ہے تو بعینہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی اس عارف کے نفس کے ہر ہر جزو سے اختلاط پیدا کر لیتی ہے۔ اور اس طرح یہ عارف کامل اکسیر بن جاتا ہے، اور لوگ اس سے شفاعت حاصل کرتے ہیں۔ میں نے جو اوپر نفس کے حصے، اُس کی رگیں اور اُس کے پھٹے گٹے ہیں، تو اس سے میری مراد نفس کا اپنی تمام ہمت کو متکثر کئے بغیر بطور عادت کے یا بلحاظ ایک غیر مستقل ملکہ کے متوجہ ہونا ہے۔ الغرض اس بستر کے اعتبار سے عارف کامل کی ذات کے بہت سے آثار و احکام ہوتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں میں یہ بھی سمجھا ہوں کہ عارف کامل کے اُس جزو کے معانی ہیں سے جو جزو کہ زحل کے مقابل ہے، اور اُس کے ساتھ مشتری بھی ملا ہوا ہے۔ اور نیز جب کہ اُس میں الہی رنگ سرایت

کر جاتا ہے، ایک معنی یہ ہیں :-

اور ان علوم میں سے جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے ملے، ایک علم یہ ہے کہ عارفِ کامل کو ان تمام کی تمام نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے، جو نعمتیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو زمینوں کو، جمادات نباتات، حیوانات اور انسانوں کو اور ان میں سے جو فرشتے، انبیاء، اولیاء اور بادشاہ و غیرہ ہیں، ان سب کو عطا فرمایا ہے۔ اور عارف کی یہ خصوصیت اس وجہ سے ہے کہ اس کا وجود عیارت ہے ایسے اجزاء سے جن میں سے ہر جزء ان موجودات میں سے کسی نہ کسی چیز کے مقابل ہے۔ چنانچہ اس طرح عارفِ کامل ان تمام موجودات کا اجمالی اور جامع نسخہ بن جاتا ہے۔ اب اگر ہم اس عارفِ کامل کے ایک ایک جزو کی تفصیل کرنے لگیں تو وجودِ عمومی کے یہ سب مظاہر سامنے آئیں گے۔ الغرض جب اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت عارفِ کامل کو ملتی ہے تو دراصل اس نعمت کا محل اس کے ان اجزاء میں سے ایک جزو ہوتا ہے اس ضمن میں عارفِ کامل کا فرض ہے کہ وہ ان تمام نعمتوں کا شکر ادا کرے :-

یہ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا، اس میں کسی ردِ رعایت یا رواداری سے کام نہیں لیا گیا۔ بلکہ یہ ایک حقیقتِ نفس الامری ہے جو ہم نے پیش کی۔ اس میں شک نہیں کہ جب کوئی عارف نسبتِ مجرد اور منترہ ہو کر اس وجودِ کلی کا جو تمام موجودات میں جاری و ساری ہے، ہو جاتا ہے تو یہ رستہ اس پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ وجودِ کلی کے بجائے وجودِ جزوی مظاہر کی لپٹ میں گر جاتا ہے تو پھر اس سے یہ رستہ بھی روپوش ہو جاتا ہے :-

ستائیسواں مشاہدہ

میں اس امر کے انتظار میں تھا کہ وہ حدیث جس میں یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ہمارا رب مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا۔ اور آپ نے اُس کے جواب میں فرمایا تھا کہ وہ "عما" میں تھا۔ اُس حدیث کے معنی معلوم کروں کہ مجھ پر اس راز کا فیضان ہوا۔ میں نے دیکھا کہ "بندہ ہیولانی" کی بندہ پر لوگ عظیم الشان نور جلوہ فگن ہے۔ اور اس نور نے اپنی شعاعوں کے ذریعہ جو تمام اطراف میں خطوں کی طرح پھیلتی چلی گئی ہیں، اس بعد کا پورے طرح لحاظ اپنی تدبیر کے احاطہ کر لیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں "اللہ عما" میں تھا۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ "بندہ ہیولانی" "عمار" ہے اور نور

کی شفاعتوں کے ذریعہ اس بعد کا احاطہ کر لینا اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق ہے کہ ”هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ“ جب مجھ پر یہ راز منکشف ہوا تو اس کی وجہ سے میرا دل طمانیت کی ٹھنڈک سے بھر گیا۔ اور میں نے یوں محسوس کیا کہ نہ تو اب میرے اندر کوئی مشبہ باقی رہا اور نہ اس ضمن میں کوئی ایسا سوال رہ گیا ہے، جو میں پوچھوں۔

اس کے بعد جب میں ”مقام تفکر“ میں آیا تو میں نے اس ستر کو اس طرح سمجھا کہ ذات حق خود اس امر کی متقاضی تھی کہ وہ استعدادیں جو اُس کے اندر مضمر ہیں، اُن کا ظور عمل میں آئے۔ چنانچہ سب سے پہلے ذات حق کا جو مرتبہ وجوب ہے، اُس مرتبے میں ذات حق کی ان استعدادوں کا حقیقی ظور ہوا۔ اور اس ظور سے وہاں اشیائے ممکنات کے ”اعیان“ اور ذات واجب کے ظور کی ہر صورت اور اس کی تدقی کے ہر مظهر کے ”شیون“ متحمل ہوئے۔ مرتبہ وجوب میں ذات حق کا تقاضہ یہ ہوا کہ وہ ان طوراً کو عدم، مادہ اور خارج سے متصف کرے۔ چنانچہ اس ضمن میں اُس نے جو کچھ کہ اعیان اور اشیاء کی پہنائیوں میں مضمر تھا، اُسے ظاہر کر دیا۔ اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو چیز ظور پذیر ہوئی، وہ اللہ تعالیٰ کا نور تھا۔ اس نور نے عدم اور مادہ کا پوری طرح سے احاطہ کر لیا، اور اس پر یہ مسلط ہو گیا۔ اور یہ نور قائم مقام بن گیا ذات حق کا۔ اور یہ نور قدیم الزمان ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک زمان، مکان اور مادہ ایک ہی چیز ہے۔ اور یہی وہ استعداد ہے جس کو ہم نے عدم اور خارج کا نام دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وہ ارادے جو ہر زمانے میں بدلتے ہیں وہ اسی مقام و
 موطن سے مخصوص ہیں۔ اور یہی وہ پہلی چیز ہے جس کے متعلق شریعتوں
 کی زبانوں نے گفتگو کی ہے۔

اوپر کی حدیث میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم سے جو سوال کیا تھا اس میں آپ سے صرف یہی پوچھا گیا تھا کہ
 اللہ مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا۔ ظاہر ہے اس "کہاں" کا
 جواب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس وقت جو چیز خارج میں
 موجود تھی وہ بتا دی جاتی۔ چنانچہ آپ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا
 کہ اللہ "عماؤ میں تھا" ۛ

اٹھائیسواں مشاہدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ مقدس سے مجھے اس کیفیت کے علم کا فیضان ہوا کہ بندہ اپنے مقام سے ترقی کر کے کس طرح مقام قدس تک پہنچ جاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس وقت ہر چیز بندے کے سامنے اس طرح متجلی ہو جاتی ہے جس طرح کہ خواب کے دوران میں معراج کے قصے میں چیزوں کو دیکھنے کی خبر دی گئی ہے۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ بندہ چیزوں کو اس طرح متجلی دیکھنے کے بعد اس ضمن میں جو واقعات اُس پر گزرتے ہیں وہ اُن پر نظر واپس ڈالتا ہے چنانچہ اُن میں سے جو واقعات الہام الہی کا نتیجہ ہوتے ہیں وہ اُن کو جان لیتا ہے۔ اور جو کم و بیش اُس کی اپنی طبیعت کا تقاضہ یا شیطان کے دھوسے ہوتے ہیں، اُن کو بھی معلوم کر لیتا ہے۔ اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ

اس مقام قدس میں پہنچ کر اُن امور کو جو ملاءِ اعلیٰ میں زیرِ بحث ہوتے ہیں، واضح ترین صورت میں دیکھ لیتا ہے۔ ملاءِ اعلیٰ کے یہ امور یا تو قوانینِ کلیہ کے بلے میں جو علوم ہیں، اُن کے متعلق ہوتے ہیں، یا جو واقعات کہ دُنیا میں ہونے والے ہوتے ہیں، اُن کے بلے میں لوگوں کو ڈرانے اور آگاہ کرنے کا سوال ہوتا ہے۔ یا کسی امرِ حق کے سلسلہ میں لوگوں میں جو بحث مباحثہ ہونا ہوتا ہے، اُس کا علم ان لوگوں کے ادراکات میں نازل کرنے کا معاملہ ملاءِ اعلیٰ میں درمیش ہوتا ہے۔ یا ایک خاص زمانے میں جو علوم موزوں ہوتے ہیں، اُن کے متعلق جو عقدے ہوں، اُن کو کھولنے کی تدبیر زیرِ غور ہوتی ہے۔ یا ملاءِ اعلیٰ کی ہدایتیں اور صورتیں یا اُن کے مقامات، یا ان امور سے ملتی بچاتی جو اور چیزیں ہیں، وہ ہوتی ہیں۔ الغرض یہ بسندہ مقام قدس میں پہنچ کر ان امور کو جو ملاءِ اعلیٰ میں زیرِ بحث ہوتے ہیں، واضح ترین صورت میں دیکھ لیتا ہے۔ اور ملاءِ اعلیٰ کے یہی امور قرآن مجید کے علوم کا موضوع ہیں۔

میں نے جب اپنے آپ سے طبیعت کا لباس اُتار دیا۔ اور اپنے مالوفات، عادات اور محسوسات سے میں نے تَجَرُّد اختیار کر لیا۔ اور اس مقام قدس کے رنگ میں میں رنگا گیا۔ تو اس کے بعد میں نے ایک عظیم الشان حقیقت کا مشاہدہ کیا۔ اس موقع پر مجھ سے کہا گیا کہ یہ مقام مقامِ رویت و مشاہدہ ہے۔ یہ کلام کا مقام نہیں۔ ہاں بعد میں جب ارادہ حق کا یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی طرف توجہ کرے۔ اور یہ

تدنی کتاب کی صورت میں ہو، جو کہ اُن پر نازل کی جائے۔ تو وہ اس مقامِ رُت و مشاہدہ و اسے کہ ایک نورانی اور رقیق لباس پہنا دیتا ہے۔ چنانچہ اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مقامِ رویت و مشاہدہ اُس شخص کے لئے مقامِ کلام میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بعد ازاں میں نے بندے کی وہ کیفیت بھی ملاحظہ کی جو اُس کی مقامِ قدس سے طبیعت اور عادت کا جو مقامِ اسفل ہے، اُس کی طرف گرنے کی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اُس وقت بندے کی طبیعت کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اور ملاءِ اعلیٰ کی آنکھ اُس کی طرف سے بند ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جو واقعات اُس پر مقامِ قدس میں گزرے ہوتے ہیں، وہ اُن کے مشعلِ محسوس کرتا ہے کہ ایک خیال تھا جو اس کے دماغ میں آیا تھا۔ یا وہ اُن کو اس طرح یاد کرتا ہے جیسے کوئی بھولی بسری چیز کو یاد کرے۔ اور اس سلسلہ میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ لزاماً اور اسباب کی تلاش میں کسی ایسی چیز کو پالیتا ہے، جس سے وہ محروم تھا۔ یا اُس کے لئے وہ چیز ناقابلِ دسترس تھی۔

بندے کا مقامِ قدس کی طرف ترقی کرنا اور پھر وہاں سے اپنی طبیعت کے مقامِ اسفل کی طرف رجوع کرنا۔ یہ جو دو مقامات ہیں، اُن کے درمیان بندے کو بہت سے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں نے ان سب حالات کو اپنے اس مشاہدہ میں دیکھا چنانچہ ان میں سے بعض حالات ملاءِ اعلیٰ سے قریب تر ہوتے ہیں اور بعض ملاءِ اسفل سے، اور ان حالات سے یہ واقعات

ظہور پذیر ہوتے ہیں، جو میں اب بیان کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک تو
 ہفت کی آواز ہے۔ اور اسی طرح دل میں کسی خیال کا آجانا، اور خواب میں کسی
 چیز کو دیکھنا ہے۔ اور جہاں تک خواب کا معاملہ ہے، سچ پوچھے تو خواب دل
 کی باتیں ہیں کہ جب انسان کی قوت ورا کہ نیند کی حالت میں سب طرف کے
 کٹ کر دل کی ان باتوں کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتی ہے، تو یہ باتیں
 خیالات کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اور انسان انہی خیالات کو خواب میں
 اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور اپنے کانوں سے سنتا ہے۔ اور ان خیالات میں سے
 ایک خیال خیال حق بھی ہے۔ جس سے کہ دماغ بھر جاتا ہے۔ اور اسی سلسلہ
 میں سچی فراست اور اسی قبیل کی اور چیزیں بھی ہیں، جو ان حالات میں پیدا
 ہوتی ہیں۔ اور یہ سب چیزیں اُس مقام حجاب سے متعلق ہیں جو درمیان کے
 اُس بارگاہ کے جہاں کوئی حجاب نہیں۔ اور اس مقام کے جہاں ہر اعتبار سے
 حجاب مضبوط ہے۔ میں نے اپنے اس مشاہدہ میں ان میں سے ہر چیز کو
 دیکھا۔ اور نیز میں نے ان میں سے ایک ایک چیز کا اُس کا اپنا اپنا مقام
 اور محل دیکھا، جہاں کہ یہ چیز پائی جاتی ہے۔ لیکن اس مشاہدے میں
 مجھے اتنی مہلت نہ ملی کہ میں ان سب چیزوں کے اندازوں اور ان کے محل
 وقوع کا پوری طرح احاطہ کر لیتا۔ چنانچہ اس ضمن میں میں نے صرف ان
 چیزوں کے اصولوں ہی کے مشاہدہ پر اکتفا کیا۔ اُمید ہے اللہ تعالیٰ ضرور
 اس امر کی توفیق دے گا کہ ہم پھر دوسری بار ان سب چیزوں کا پوری
 طرح احاطہ کر سکیں +

انتی سوال مشاہدہ

عارف جب اُس مقام میں ہوتا ہے جو اس کی طبیعت کے قریب ہے تو اس حالت میں وہ فعل حق کا اس طرح مشاہدہ نہیں کر سکتا جیسے کہ اُسے کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایسے موقعہ پر اکثر عارف کو الہامات میں اور دل کے دھڑکنا میں، اور الہی کیفیت میں اور طبیعت کے اقتضا میں اشتباہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور نیز اس ضمن میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معاملہ ہے اور اس کے متعلق عارف نہیں جانتا کہ اس کے بارے میں اللہ کا کیا حکم ہے۔ چنانچہ وہ اس میں متروک ہوتا ہے۔ اور کچھ دیر تک وہ اسی تردد کی حالت میں رہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ مقام حق کی طرف کھینچ جاتا ہے اور وہ اللہ کا ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اُس کے سامنے ہر ایک چیز متجلی ہو جاتی ہے۔ اب وہ امور جن کے متعلق پہلے اُسے شبہ تھا۔ وہ اُن امور

پر اور نیز اپنے شکوک پر دوسری بار نظر ڈالتا ہے، تو ان کے متعلق اللہ کا جو ارادہ اور فیصلہ ہوتا ہے۔ منکشف ہو جاتا ہے۔ اور اس حالت میں وہ گویا اللہ کے ارادے اور فیصلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اب اگر وہ عارف "مکلم" ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرتا ہے، تو اس حالت میں اس سے کلام کی جاتی ہے۔ اور اگر وہ مشہم اور "لقن" ہو تو اس کو اہدام و تفہیم اور تلقین کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ارادے اور فیصلے کی اطلاع ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے تمہارے لئے سورۃ النحل میں ایک بصیرت ہے۔ اس سورت کی شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے "الفال" یعنی ماں غنیمت کے متعلق پوچھا گیا۔ آپ نے اس بارے میں اللہ کا جو فیصلہ تھا، بتا دیا اس کی کوئی صراحت فرمائی۔ اور نہ یہ بتایا کہ مال غنیمت کیسے تقسیم ہو۔ اس دوران میں معرکہ بدر پیش آ جاتا ہے۔ اور اس معرکہ کی تفصیل یہ ہے کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے واپس مکے آ رہا تھا کہ اس کے بارے میں ان کو یہ خبر ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اس قافلے کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے قریش کی ایک فوج مکے سے نکل پڑتی ہے۔ ادھر اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا یہ تقاضہ تھا کہ قریش کی اس فوج سے مسلمانوں کی بیٹھ بھیر ہو جائے۔ تاکہ قریش کو شکست ہو اور اس طرح کفر کو زک پہنچے۔ اس اثناء میں اہل مکہ کا تجارتی قافلہ اور قریش کی فوج دونوں کی دونوں مسلمانوں کے قریب آ جاتے ہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں میں آپس میں اختلاف رائے ہوتا ہے

جہاں تک الہام حق کا تعلق تھا، اُنہیں کا میدان قریش کی فوج سے دور
 پھٹنے کی طرف تھا۔ لیکن مسلمانوں کے عام طبائع کا رجحان یہ تھا کہ فوج
 سے لڑنے کے بجائے قریش کے تجارتی قافلے پر پیش قدمی کی جائے۔ اب یہاں
 خدا تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو راہ ہدایت کی طرف لے جانے کا سامان پیدا
 ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بدر کے میدان میں جا اترتے ہیں۔ اور وہاں جو وہ ذرا
 سستاتے ہیں تو ان کو آؤنگھ آجاتی ہے، جس کی وجہ سے انہیں سکون مل جاتا
 ہے۔ اور پھر اس موقع پر بارش بھی ہو جاتی ہے جس سے انہیں اُڑا طیمان
 حاصل ہو جاتا ہے۔ اب ان کے دلوں میں قریش کے مقابلے کے لئے جوش پیدا
 ہوتا ہے۔ اور وہ گنہگار کے خلاف رزمِ آزاد ہوتے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا بظاہر اس
 کے متعلق یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء مقصد تھا کہ اسی طرح
 ہو۔ یا پھر قدرتی طور پر حالات و معاملات کا یہی تقاضہ تھا۔ بہر حال معرکہ بدر
 ہو چکا۔ لیکن مالِ غنیمت کے متعلق جو سوال تھا وہ ابھی باقی تھا۔ چنانچہ
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ حق کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں
 اللہ تعالیٰ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں آپ سے کلام کرتا ہے ۛ

اب اگر تم مجھ سے پوچھو کہ آخر یہ کون سا مقام ہے، جسے تم مقامِ حق
 کہتے ہو۔ تو اس کے جواب میں میں کہوں گا کہ بازارِ اعلیٰ اور جلیلِ القدرِ مومنوں
 کی ہمتیں اور ان کے نصیبِ العین اللہ تعالیٰ کی تجلیات میں سے کسی ایک
 تجلی ہیں۔ جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اس تجلی ہی کا نام حقیقۃً القادر ہے۔ اور
 یہی وہ مقام ہے جہاں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث

میں آیا ہے کہ حضرت آدمؑ نے حضرت موسیٰ سے باتیں کی تھیں۔ اور یہی
 حظیرۃ القدس قرآن مجید کی اس آیت - ”قَدْ مِمَّ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ“ کا
 یعنی نیکو کاروں کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس مستقل ٹھکانا ہے، مصداق ہے۔
 اب جو شخص حظیرۃ القدس کو پالیستا ہے وہ قرآن مجید کی اُس بشارت کا جس کا
 ”عَلَىٰ بَيْتِي مِنْ رَبِّي“ اور ”يَتَأَوُّهُ شَاهِدٌ مِنْهُ“ کی آیات میں ذکر ہے
 اہل بن جائب ہے۔ غرضیکہ اس شخص کے نفس میں اُس بارگاہ کی طرف سے ایک
 رنگ آکر گھل مل جاتا ہے اور یہی چیز سوس کے دل میں تقاضہ حق کی صورت
 اختیار کر لیتی ہے۔ نہیں چاہئے کہ اس مسئلہ میں خوب غور و فکر کرو۔ واقعہ
 یہ ہے کہ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے +

تیسواں مشاہدہ

میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف متوجہ تھا کہ ایک نور جو
 بند یوں کی طرف پرواز کر رہا تھا، طلوع ہوا۔ اس نور سے میرا خیال
 سہرتا پا پڑ ہو گیا۔ اور اس کی تابانی اور چمک دیکھ کر میں حیرت
 میں پڑ گیا۔ اس اثنا میں خود مجھے اپنے اندر سے فراست اور
 فطری شوجھ بوجھ کے ذریعہ بتایا گیا کہ یہ نور، نورِ عرش ہے۔ اور
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں اس نور کا بڑا دخل ہے۔
 چنانچہ جب تک اس نور کی معرفت حاصل نہ ہو، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام
 کی نبوت کی حقیقت کا علم کمال طور پر منتشر نہیں آتا۔

اس مقام سے اتر کر جب میں تفکر اور غور و تعمق کے مقام میں
 آیا تو مجھے حزقیل نبی کا وہ قصہ یاد آ گیا جو "الدر المنثور" میں مذکور

ہے۔ اور جس میں بتایا گیا ہے کہ حزقیل نبی نے نورِ عرش کو دیکھا۔ اور
اس نور کی زبان ہی کے ذریعہ اُن کی رسالت معرض و جود میں آئی۔

اکتیسواں مشاہدہ



میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روحانی سوال پوچھا جسے کہ کئی بار آپ سے اس قسم کے سوال میں پوچھ چکا ہوں۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ دنیا کی معاملات میں اسباب کو وسیلہ بنانے یا اسباب کو سرے سے ترک کر دینے میں کون سی چیز میرے لئے بہتر ہے۔ میں جب یہ سوال کر چکا تو میری طرف خوشبو کی ایک لپٹ آئی جس کی وجہ سے میرا دل اسبابِ اولاد اور گھر وغیرہ کی قسم کی چیزوں سے بالکل سرو ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد مجھے جو کشف ہوا تو میں نے اپنی طبیعت کو اسباب کی طرف مائل پایا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ میری طبیعت کو اسباب سے لذت ملتی ہے۔ اور وہ اسباب کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ لیکن میری طبیعت کے خلاف میری روح کا رجحان تو ان کی طرف ہے۔ اور میری روح اسباب

کی بجائے توکل سے لذت حاصل کرتی ہے۔ اور اُسی کی طالب ہے۔ اور نیز میں نے معلوم کر لیا کہ میری طبیعت اور میری رُوح میں باہم کش مکش ہے۔ اور اس سلسلہ میں میں نے یہ بھی جان لیا کہ اس مسئلہ میں میرے لئے پسندیدہ روش یہ ہے کہ میں اپنی رُوح کے کہنے پر چلوں۔ بے شک اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم پہلے سے پردہ خفا میں ہوتا ہے۔ اور پھر وہ خود بخود ظاہر ہوتا جاتا ہے۔

اس کے بعد خوشبو کی ایک اور لپٹ آئی۔ اور اس کے ضمن میں مجھ پر یہ ظاہر کیا گیا کہ تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ تمہارے ذریعہ سے اُمتِ مرحومہ کے منتشر اجزاء کو جمع کر دے۔ اسلئے یہ جو کہا گیا ہے کہ "صدیق اُس وقت تک صدیق نہیں بن سکتا، جب تک کہ ایک ہزار صدیق اُسے زندیق نہ کہیں" تمہیں چاہیے کہ اس چیز سے بچو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمہارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ فروعات میں اپنی قوم کی ہرگز مخالفت نہ کرو۔ کیونکہ ایسا کرتا ارادہ الہی کے خلاف ہے۔ بعد ازاں اس سلسلہ میں مجھ پر ایک ایسا مثالی طریقہ منکشف ہوا۔ جس سے مجھے سنت اور فقہ حنفی میں تطبیق دینے کی کیفیت معلوم ہوئی اور وہ اس طرح کہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد میں سے جس کا قول سنت سے قریب ہو، میں اُس قول کو اختیار کروں۔ اور جن امور کو اُنہوں نے عام رہتے دیا ہے، میں اُن کی تخصیص کر دوں۔ اور مسائل فقہ کو مرتب کرنے میں جو مقاصد ان بزرگوں کے پیش نظر تھے،

اُن سے واقف ہوں۔ اور سنت سے جو عام مفہوم متبادر ہوتا ہے۔
 میں اُس پر اپنا انحصار رکھوں۔ اور اس معاملہ میں نہ تو دور از قیاس
 تاویل سے کام لیا جائے۔ اور نہ یہ ہو کہ ایک حدیث کو دوسری حدیث
 سے بھڑایا جائے۔ اور نہ اُمت کے کسی فرد کے قول کے خیال سے نبی
 صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کو ترک کیا جائے۔ سنت اور فقہ حنفی
 میں باہم مطابقت دینے کا یہ طریقہ ایسا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس طریقے
 کو مکمل کر دے تو یہ دین کے حق میں کبریت احمر اور کسیر اعظم ثابت ہو +
 اس کے بعد خوشبو کی ایک اور پیٹ آئی۔ اور اسی کے ذیل میں
 مجھے اپنے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وصیت ملی کہ میں
 انبیاء کے طریقے کو اختیار کروں، اور اُن کے بارہائے گراں کو اٹھاؤں۔
 اور اُن کی خلافت کے لئے کوشاں ہوں۔ اور میں لوگوں کو تعلیم و ارشاد
 دوں تو نرمی و شفقت سے دوں۔ اور اُن کی یہودی کے لئے دعا کروں۔
 اور خدا سے وہ چیز طلب کروں، جس میں لوگوں کی ظاہری اور باطنی دونوں
 لحاظ سے بھلائی ہو +

خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی
 سنت کو اخذ کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے +

بیتسوال مشاہدہ

بیتس نے ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی قبور کی طرف توجہ کی اور
 تو بیتس نے اُن کا ایک خاص طریقہ دیکھا۔ اور اُن کا یہی طریقہ اولیاء کے
 طریقوں کی اصل بنیاد ہے۔ اب میں تمہارے لئے اُن کا یہ طریقہ بیان
 کرتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتا ہوں کہ اس طریقے کے
 ساتھ اور کون سی چیز منضم ہوئی۔ جس کی وجہ سے بعد میں یہ اولیاء کا
 طریقہ بن گیا *

ائمہ اہل بیت کا طریقہ عبارت ہے نسبت "یادداشت" کی طرف
 التفات سے اور نسبت "یادداشت" سے میری مراد نفس کی وہ اجمالی
 بیداری ہے جو میدائے اول کے لئے ہو، خواہ نفس کی اس بیداری پر
 حجابات ہی پڑے ہوئے ہوں۔ لیکن اس اجمالی بیداری میں یہ ضروری

ہے کہ کم از کم اُس وقت تک تو ذہن سے حجابات کا یہ خیال مٹ جائے۔
 اور نیز اُس وقت یہ خیال بھی نہ ہونا چاہئے کہ نفس کی یہ بیداری خود نفس
 کے جوہر سے پیدا ہوئی ہے، یا یہ کہ یہ حاصل شدہ علم کا نتیجہ ہے الغرض
 نفس میں مبدائے اول کے لئے ایک بسیط بیداری پیدا ہو۔ اور وہ نفس
 کسی نہ کسی طرح اس بیداری کی طرف ملتفت بھی ہو، یہ ہے اولیاء کا
 طریقہ۔ الغرض جب اولیاء کے نفوس کا جوہر اس نقطے میں فنا ہو گیا۔ تو
 اس سے اولیاء کے اندر نسبت یا دواشت کی طرف التفات کے علاوہ ایک
 اور سہولیت پیدا ہو گئی۔ اور اسی ضمن میں اُن کو ایک ایسے راستے کا الہام
 ہوا، جس پر چل کر وہ "منزل فنا" تک پہنچ گئے۔ چنانچہ یہ باعث بنا
 ولایتوں کا اپنے طول و عرض کے ساتھ ظاہر ہونے کا +

تنبیہاں مشاہدہ

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے یہ حقیقت معلوم کی ہے کہ وہ شخص جس سے غیر اللہ سے تعلقاتِ محبت کو بالکل منقطع کرنے صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی سے محبت رکھنے، غیر اللہ سے عداوت کرنے جس طرح کہ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی تھی، جب کہ انہوں نے اپنے خاندان اور اپنے وطن کو چھوڑتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ سب کے سب سوائے ایک رب العالمین کے میرے دشمن ہیں" اور نیز اللہ کے ساتھ محض علم و معرفت کے اعتبار سے نہیں بلکہ عملاً اور واقعہً عشق و محبت رکھنے میں کوتاہی ہو، بے شک وہ شخص غریب زدہ ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس شخص کی ان معاملات میں کوتاہی نتیجہ ہوا اس شخص کے اپنے طبعی حالات کا، یا اس کا سبب یہ ہو کہ وہ کائنات

کی اس کثرت میں ایک ہی وجود کو جاری و ساری دیکھنے میں منہمک ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ اس کائنات کی ہر چیز سے محبت کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک وہی ایک وجود جو کہ اُس کا محبوب ہے اس ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ الغرض غیر اللہ سے بالکل قطع نظر کرنے اور اللہ تعالیٰ سے پوری طرح محبت کرنے میں اوپر کی یہ دو چیزیں مانع ہوں، یا ان کے علاوہ اس کے کوئی اور اسباب ہوں، بہر حال ایسا شخص جو اس کو تاہی کا مترکب ہوتا ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ فریب زدہ ہے۔

میں نے آپ کی بارگاہ سے بعض ایسے امور کا بھی استفادہ کیا، جو بالکل خلاف تھے میری ان باتوں کے جو پہلے سے مجھ میں موجود تھیں۔ اور میری طبیعت کا ان باتوں کی طرف بہت زیادہ رجحان بھی تھا۔ اس ذیل میں یہ تین امور آتے ہیں۔ اور چونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے ان کا استفادہ کیا ہے، اسی لئے یہ تینوں کے تینوں اس میرے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت بن گئے ہیں۔

ان امور میں سے ایک تو یہ ہے کہ مجھے اسباب کی طرف التفات کو ترک کرنے کے لئے کہا گیا۔ لیکن اسباب کے معاملے میں میری اپنی حالت یہ تھی کہ جب کبھی میں خود اپنی طبیعت کی طرف مائل ہوتا تھا تو مجھ پر عقل معاشی غالب آجاتی تھی۔ اور میں اسباب سے محبت کرنے لگتا تھا۔ اور مجھے یہ فکر ہوتی تھی کہ میں اپنے لئے وہ اسباب مہیا کروں، جن سے

اولاد اور اموال کا حصول ہو سکے۔ لیکن جب کبھی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ملائے علی سے ملحق ہوتا تھا، تو یہ سارے کے سارے رذائل مجھ سے چھوٹ جاتے تھے۔ اس ضمن میں مجھ سے جو یہ عہد و پیمان لیا گیا تھا کہ میں اسباب کو وسیلہ بنانا چھوڑ دوں۔ تو اس سے یہ ہوا کہ ایک طرف تو میری طبیعت کا فطری رجحان اسباب کی طرف تھا، اور دوسری طرف مجھ سے ترک اسباب کا عہد لیا گیا تھا۔ اب میرے اندر یہ دو چیزیں پیدا ہو گئیں۔ اور یہ ظاہر و محسوس طور پر ایک دوسرے سے متناقض تھیں، جیسے کہ ظلمت اور نور ہیں اور ٹھنڈی ہوا اور لوہیں تناقض ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر بیشتر چیزیں ایسی ہیں، جن میں کوئی تناقض نہیں۔ اور خدا کے فضل سے یہ سب کی سب چیزیں ٹھیک بھی ہیں۔ اور نیز میری طبیعت الہام قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ لیکن فکر اسباب اور ترک اسباب کا یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اُس کے بارے میں مجھ میں یہ تناقض باقی رہا۔ اور یہ بلا وجہ نہیں، بلکہ اس میں کوئی عجیب بھید ہے۔

اور ان امور میں سے دوسرا امر جس کے لئے مجھے کہا گیا، وہ یہ ہے کہ میں فقہ کے یہ جو چار مذاہب ہیں، اُن کا پابند نہ ہوں۔ اور اُن کے دائرہ سے باہر نہ نکلوں۔ اور جہاں تک ممکن ہو، اُن سے موافقت پیدا کروں۔ لیکن اس معاملے میں خود میری اپنی طبیعت کا یہ حال تھا کہ وہ تقلید سے ابا کرتی تھی، اور اُسے سرے سے تقلید سے انکار تھا۔ لیکن چونکہ یہ چیز خود میری اپنی طبیعت کے خلاف اطاعت و عبادت کی طرح مجھ سے

طلب کی گئی تھی۔ اس لئے مجھے اس سے جانے مغفرت تھی۔ بہر حال اس میں بھی ایک نکتہ ہے، جس کا میں اس وقت ذکر نہیں کرتا۔ لیکن اللہ کے فضل سے میں اس بات کو پا گیا ہوں کہ میری طبیعت کو کیوں مذاہب فقہ کی تقلید سے انکار ہے۔ اور اس کے باوجود مجھے کس لئے مذاہب فقہ کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے ؟

ان امور میں سے جن کا میں نے بارگاہ نبوی سے استفادہ کیا، آخری امر یہ ہے کہ مجھے حضرت علیؑ پر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو فضیلت دینے کا حکم دیا گیا۔ گو اس معاملے میں اگر میری طبیعت اور میرے رجحان کو آزاد چھوڑا جاتا، تو وہ دونوں حضرت علیؑ کو فضیلت دیتے۔ اور آپؐ سے زیادہ محبت کا اظہار کرتے۔ لیکن یہ ایک چیز تھی جو میری طبیعت کی خواہش کے خلاف عبادت کی طرح مجھ پر عائد کی گئی تھی اور مجھ پر اس کی تعمیل لازمی تھی۔ غرضیکہ میرے اندر ان تین متناقض چیزوں کا ہونا ایک عجیب بات ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا لیکن میری ذات میں جامعیت کی جو شدت ہے اسی نے مجھے ان متناقضات میں ڈالا ہے ۔

چوتیسواں مشاہدہ

میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ میں نے خود اپنا نور دیکھا، جو
بڑا عظیم الشان تھا۔ اور جس نے کہ تمام اقلیموں کو ڈھانپ لیا۔ اور اُن
اقلیموں میں رہنے والوں پر اُس کی روشنی غالب آگئی۔ اور اس سے
میں یہ سمجھا کہ یہ قطبیت جو مجھے دی گئی ہے، نور ہے۔ اور قطبیت سے
میری مراد ارشادیت سے ہے۔ اور یہ قطبیت ہی کا نور ہے کہ جس کی
روشنی سب پر غالب آگئی، اور اُس پر کسی کی روشنی غالب نہیں آتی۔ اور
اُس کا نور سب کو زیر کرتا ہے، لیکن وہ خود کسی سے زیر نہیں ہوتا۔ اور
کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جس کو یہ نور اپنے اثر میں نہ لاسکے لیکن خود
اس کی حالت یہ ہے کہ وہ کسی کے اثر میں نہیں آتا۔ تمہیں چاہیے کہ اس
مسئلے میں خوب غور و تدبیر کرو۔

۲۲۰

پنشنیوال مشاہدہ

میں نے خدا کے اس قدیم گھر اور اس عالی منزلت عمارت یعنی خانہ کعبہ کو دیکھا کہ ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کی ہمتیاں اُس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور اُس کے ساتھ یہ اس طرح متعلق ہیں جیسے بدن سے رُوح کا تعلق ہوتا ہے۔ اور نیز میں نے خانہ کعبہ کو ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کی ہمتیوں اور اُن کی رُوحوں سے اس طرح گھرا ہوا پایا جیسے گلاب کے پھول کے اندر عرق اور روئی کے اندر ہوا سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس مقدس گھر کی طرف لوگوں کے دلوں میں جو توجہ اور انتفات پایا جاتا ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہمتوں کا تعلق اُس بارگاہ سے ہوتا ہے، جو مشتمل ہے ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل پر۔ اور چونکہ خانہ کعبہ میں ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کی

ہمیشہ اور اُن کی ارواح بھری ہوئی ہیں۔ اس لئے لوگوں کے دلوں
 میں خانہ کعبہ کے لئے محبت جوش مارتی ہے ۔

چھٹی سوال مشاہدہ

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مجھے مطلع فرمایا کہ وہ میرے ساتھ کیا کیا نوازشیں کرنے والا ہے۔ اور اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں میں سے وہ کون کون سی نعمت مجھے عطا فرمانے والا ہے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مجھے دُنیا اور آخرت دونوں کے مواخذے سے مأمون فرمادیا۔ چنانچہ اب اس زندگی میں مجھے جن مصائب سے سابقہ پڑتا ہے، اُن کو خود میری طبیعت کا تقاضہ سمجھئے نہ کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مواخذہ۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ احسان فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ یہ جو کچھ مجھے عطا کیا گیا ہے، یہ ایسی نعمت ہے کہ اولیاء میں سے کم ہی کو یہ پیشہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے مجھے اطمینان بخش زندگی سے بھی نوازا۔ اور اُس نے ہر سعادت سے مجھے قابل ذکر حصہ عطا فرمایا۔ اور نیز اُس نے

مجھے خلافت باطنی کی خلعت بخشی۔ چنانچہ پہلی دفعہ جب یہ راز یکبارگی
مجھ پر ظاہر ہوا تو میری عقل چکا گئی۔ لیکن اس کے بعد یہ راز واضح شکل
میں میرے سامنے آیا، تو پھر میں اس معاملے کی حقیقت کو سمجھا۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی شامل ہے۔ — کبھی کبھی ایسا
ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عارف کو جو جو نعمتیں ملنے والی ہوتی
ہیں، اُن کا اُس پر انکشاف ہو جاتا ہے۔ اس انکشاف کے ضمن میں
اہل اللہ کے دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ تو کشف الہی والوں کا ہوتا ہے۔
یہ لوگ اُن واقعات کو جو مستقبل میں ہونے والے ہوتے ہیں، "آئینہ
حق" میں دیکھ لیتے ہیں۔ اور اس "آئینہ حق" سے میری مراد یہ ہے کہ
اہل اللہ کا گروہ یہ دیکھ لیتا ہے کہ اب اس بندے پر اللہ کی نظر
عنایت ہو رہی ہے۔ اور وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ ملا علی میں کس کس
چیز کو وجود میں لانے اور کس چیز کو دوسری چیز سے قریب کرنے کا ارادہ
ہو رہا ہے۔ البتہ خاص اُس واقعہ کی طرف جو ہونے والا ہوتا ہے، انکی
نظر میں نہیں جاتیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ہونے والے واقعہ کی
تفصیلات نہیں بتا سکتے جس طرح کہ وہ گروہ جن کو "کشف کوئی" ہوتا
ہے، وہ بتا دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملا علی کے جن خزانوں

اور سرچشموں سے فیوض نازل ہوتے ہیں منکشف الہی والوں پر یہ خزانے
 اور سرچشمے منکشف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی بارے میں قرآن مجید کا ارشاد
 ہے۔ "ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں۔ اور ہم ان سے مقررہ اندازوں
 کے مطابق چیزوں کو نازل کرتے ہیں" الغرض جب کسی شخص پر ملاء اعلیٰ
 کے ان خزانوں اور سرچشموں سے انوار کی شعاعیں پڑتی ہیں۔ تو ان
 شعاعوں سے اُس شخص کے ظاہری اور باطنی حواس۔ جو بعض اوقات
 اُس شخص کی قوتِ بہیمی ہی کے اجزاء ہوتے ہیں، مغلوب ہو جاتے
 ہیں۔ اور وہ نہیں جان سکتا کہ کس مقدار میں کوئی چیز ملاء اعلیٰ کے
 ان خزانوں سے نازل ہونے والی ہے۔ ملاء اعلیٰ کی یہ عجیب بارگاہ ہے
 اور اس کے معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس بارگاہ میں
 سوچ۔ بچار، تفکر اور دل کے دوسوں کو ملاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔
 تاکہ ان کی وجہ سے کہیں پر نہ ہو کہ صاحب کشف چھوٹی چیز کو بڑا دیکھے
 اور بڑی چیز کو وہ چھوٹا دیکھے۔ مثال کے طور پر ملاء اعلیٰ کے خزانوں
 سے کوئی چیز کم مقدار میں نازل ہونے والی تھی۔ لیکن اُس شخص نے
 اُس چیز کو بڑی مقدار میں دیکھا۔ اور لوگوں کو اس کی خبر دے دی۔
 اور بعد میں جب وہ چیز اُس مقدار میں نازل ہوئی تو وہ چھوٹا کھڑا

۱۔ "وَرَأَى مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَ خَشْيَةِ اللَّهِ - وَمَا نَزَّلَهُ إِلَّا بَقَدَرٍ
 مَقْلُومٍ" (سورہ الحجر ۲۱)

چنانچہ قرآن مجید کی اس آیت کے ہم نے تم سے پہلے جو بھی رسول یا نبی بھیجے، اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ یہ ہوا کہ جب اُس نے کوئی آرزو کی، تو شیطان نے اُس کی اس آرزو میں اپنی طرت سے کچھ نہ کچھ ڈال دیا، ایک معنی یہ ہیں *

یہ تو "کشف الہی" والوں کا بیان ہوا۔ اہل اللہ کا دوسرا گروہ کشف کوئی "والوں" کا ہے۔ یہ ہونے والے واقعہ کو خواب یا ہفت کی طرح جان لیتے ہیں۔ اور اس ضمن میں اُن کو ملا اعلیٰ کے خزانوں اور سرچشموں کا علم نہیں ہوتا۔ اُن میں سے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں اُس کی تعبیر کی اُن کو ضرورت نہیں پڑتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو واقعہ اس عالم میں رونما ہونے والا ہوتا ہے، اُس کی عالم مثال میں جو مثالی حقیقت ہوتی ہے۔ اُس کے باسے میں ان لوگوں کے خیالی کی تصویر اُس مثالی حقیقت کی جو طبیعت کلی ہے، اُس کی تصویر کے بالکل مطابق ہوتی ہے۔ اس لئے یہ لوگ جو کچھ دیکھتے ہیں، بحسبہ بغیر کسی فرق کے وہ واقعہ ویسا ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ لیکن "کشف کوئی" والوں میں سے جو ایسے نہیں ہیں، اُن پر ہونے والے واقعات کے ضمن میں جو کچھ بھی منکشف ہوتا ہے، انہیں اُس میں تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے ان کا ہونے والے واقعہ کی اصل حقیقت تک پہنچنا "قتاد" جیسے خاردار درخت کو

لَهُ وَمَا أَسْرَسْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى
اَلْتَقَى الشَّيْطَانُ فِيْ اٰمْنِيَّتِهٖ ۔ (سورہ الحج ۵۱)

رند نے سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے +

تحقیق مزید ————— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اُمت مرحومہ کے لئے اُسوۂ حسنہ یعنی بہت اچھا نمونہ ہے۔ اب اُمت میں سے جو اصحاب خلافت ظاہرہ ہیں، یعنی ■ لوگ جن کا کام شریعت کی حدود کو قائم کرنا، جہاد کے لئے ساز و سامان فراہم کرنا، سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا، وفود بھیجنا، صدقات اور خراج جمع کرنا اور مستحقین پر ان کو تقسیم کرنا، مقدموں کا فیصلہ کرنا، یتیموں، مسلمانوں کے اوقاف، گزرگاہوں، مسجدوں اور اسی طرح کے جو اور امور ہیں، ان کی خبر گیری کرنا، ان لوگوں کے لئے تو رسول اللہ کا اُسوۂ حسنہ آپ کے وہ احکام و اوامر ہیں، جو مذکورہ بالا امور کے متعلق کتب احادیث میں بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ جس شخص پر ان امور کی ذمہ داری ہوتی ہے، ہم اُس کو خلیفہ ظاہر کہتے ہیں +

اصحاب خلافت ظاہرہ کے علاوہ اُمت میں ایک گروہ اصحاب خلافت باطنہ کا ہے۔ یہ لوگ قرآن، سنت اور شریعت کی تعلیم دیتے، نیک کاموں کا حکم کرتے اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں۔ ان کی باتیں دین کے لئے مدد کا باعث بنتی ہیں، خواہ یہ مدد مناظرے اور مجاہدے کی شکل میں ہو۔ جیسے کہ مشکمیں کا گروہ دین کی مدد کرتا ہے۔ یا یہ مدد وعظ و ارشاد کے ذریعے

ہو جیسے کہ خطیب اور واعظ کرتے ہیں۔ یا ان لوگوں کی صحبت سے دین کو تقویت ملے، جیسے کہ مشائخ صوفیاء ہوتے ہیں۔ اور نیز وہ لوگ جو نمازیں پڑھتے اور حج ادا کرتے ہیں۔ اور وہ جو "احسان" کی طرف دوسروں کی رہنمائی کرتے اور عبادت و زہد کی انہیں ترغیب دیتے ہیں، یہ سب کے سب لوگ جو ان امور کو سرانجام دیتے ہیں، ہم یہاں ان کو خلفائے باطنی کا نام دیتے ہیں۔ ان خلفائے باطنی کے لئے بھی خلفائے ظاہری کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ کتب احادیث میں ان قواعد و آداب کی شکل میں بڑی تفصیل سے موجود ہے، جو آپؐ نے مذکورہ بالا امور کے متعلق مقرر فرمائے ہیں *

یہ بات جو ہم نے یہاں بطور ایک مقدمہ کے بیان کی ہے، اس پر کلیتہً سب کا اتفاق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تم فقہاء کو دیکھتے ہو کہ وہ فقہی مسائل کے ضمن میں جو احکام استنباط کرتے ہیں، ان میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی کو مددگار مانتے ہیں۔ اور اُسی کے مشابہ وہ امور تجویز کرتے ہیں۔ اور ان سب میں وہ سنت ہی کی سند لیتے ہیں۔ الفرغ جب ہم نے اس اصل کو تسلیم کیا کہ خلافت ظاہرہ اور خلافت باطنہ ہر دو کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں اُسوہ حسنہ ہے، تو اب ہم اس اصل سے ذیلی اور فرعی مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔ ان مسائل میں سے ایک بیعت کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو ہم تفصیل سے اپنی کتاب "القول الجلیل فی بیان سوانح اہلبیت" میں

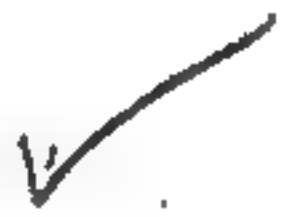
ذکر کر چکے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا مسئلہ خلیفہ باطن کا اپنے داعی اور سفیر بھیجنے کا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطراف ملک میں اور مختلف قبائل کی طرف اپنے نائب بھیجا کرتے تھے، جو لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتے اور ان کو شریعت کے احکام و ادا کی تلقین کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو اشعریوں کی طرف، حضرت ابوذرؓ غفاریؓ کو قبیلہ غفار و اسلم کی طرف، حضرت عمرو بن مرہ کو قبیلہ ہبہ کی طرف، حضرت عامرؓ حضرمیؓ کو بنی عبد القیس کی طرف اور حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اہل مدینہ کی طرف، اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ اور اس ضمن میں جہاں تک ظاہری خلافت کے معاملات کا تعلق تھا، آپ نے کوئی معاملہ بھی ان کے سپرد نہ فرمایا تھا۔ الغرض یہ لوگ آپ کی خلافت باطنی کے داعی اور سفیر تھے۔ اور ان کے ذمے آپ نے صرف یہ کام کیا تھا کہ وہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں۔ اور ان کو قرآن اور سنت کی تعلیم دیں۔

خلیفہ ظاہر اور خلیفہ باطن میں فرق یہ ہے کہ اگر ایک سے زیادہ بھی خلیفہ باطن ہوں تو ان میں باہم نزاع کی نوبت نہیں آتی۔ لیکن خلیفہ ظاہر کا معاملہ اس سے برعکس ہوتا ہے۔ اور خلیفہ باطن اور اس کے داعی اور سفیر میں فرق یہ ہے کہ خلیفہ باطن کے لئے ضروری ہے کہ وہ عالم ہو اور اس کے علم کا دائرہ وسیع ہو۔ اور اسی طرح وہ وسیع الکلام بھی ہو۔ اور جہاں تک داعی کا تعلق ہے، اس کے پاس تو خلیفہ باطن کی طرف سے

ایک لکھا ہوا دستور العمل ہونا چاہئے، جس پر کہ وہ عمل کرے۔ اور اُس سے وہ تجاوز نہ کرے۔ اور اگر دعوت کے سلسلہ میں اُس کو کوئی مشکل پیش آجائے تو اُس کے بارے میں وہ خلیفہ یا طین کی طرف رجوع کرے۔ خلافت باطنی میں جو داعی اور سفیر بھیجے جاتے ہیں اور اُن کے متعلق جو قواعد و احکام ہیں، اُن میں سے بیشتر قواعد و احکام کا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طریق کار ہے، جو ہجرت سے قبل مختلف قبائل کی طرف آپ کا اپنے داعی اور سفیر بھیجنے کا تھا۔ تم اس چیز کو اچھی طرح سے سمجھ لو۔ اور اس میں خوب تدبیر کرو +

۱۰ مؤرخین عموماً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی عہد سے اسلامی ریاست کی ابتدا مانتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ان کے میں مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی کوئی باقاعدہ سیاسی حیثیت نہ تھی۔ شاہ ولی اللہ کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت مکہ ہی میں تشکیل پائی تھی۔ لیکن یہ حکومت عملاً تشدد کے اصول پر مبنی تھی۔ یہ خلافت باطنی ہے تاج کی اصطلاحی زبان میں ہم اسے پارٹی کیس گے + مترجم

سنتی سوال مشاہدہ



مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوئی اور اس حالت میں میں نے اپنی رُوح کو دیکھا کہ وہ دو چند ہو گئی ہے اور بہت بڑھ گئی ہے۔ اور اُس میں وسعت اور فراخی پیدا ہو گئی ہے۔ جب میں نے اپنی اسس وجدانی کیفیت میں غور کیا تو میں سمجھ گیا کہ یہ وہ حالت ہے، جو عارفوں کو ہمیشہ آیا کرتی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ الہی بارگاہوں کے وہ اسرار جو ملائے غلات میں انعقاد پذیر ہوتے ہیں، وہ عارف کی رُوح میں حل ہوتے ہیں۔ اور نیز وہ اسمائے الہیہ جو پہلے تو مدارک انجالی میں واقع ہوتے ہیں۔ اور پھر وہاں سے تلاوت کی جلتے والی آیات کی صورت میں کسی منتخب رسول کے دل میں نزول کرتے ہیں۔ یا وہ مشہور اسماء کہ چونکہ آثار حق کو ان اسماء سے تعبیر کرنا لوگوں میں ایک دستورین سما ہے۔

اور یہ چیز ان کے ہاں طبیعت اور جبلت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔
 غرضیکہ ان اسمائے الہیہ اور ان اسمائے مشہور کی برکتیں اُس عارف کی
 روح پر نازل ہوتی ہیں۔ چنانچہ اُس کی روح میں ان الہی بارگاہوں کے
 اسرار کے حصول اور ان اسماء کی برکتوں کے نزول سے وسعت اور قوت
 پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس عارف
 کو نظر بھر کے دیکھ لے تو وہ اُس سے اتنا مرعوب ہو جاتا ہے کہ اُس کا
 دل اس عارف کی تعظیم کے جذبے سے بھر جاتا ہے۔ اور نیز اس عارف
 کے چہرے کے انوار سے اُس کی بزرگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اُس میں جو
 فراست اور ہمت ہوتی ہے۔ اُس سے برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ الغرض
 میں نے اپنی روح کو جو اس قدر وسیع، اور فراخ پایا تو یہ براہ ہے اُس
 کا۔ اور یہ اُس کی حقیقت ہے۔

ارتیسوال مشاہدہ

میں نے ایک بار گاہ دیکھی، جس کی طبیعت کلیہ سے ایسی ہی نسبت ہے، جیسے کہ افراد انسانی میں سے ایک فرد کی طبیعت کی اُس کے اندر جو ارادہ اور عزم کی قوت ہے، اُس کے ساتھ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے انسان اپنے خیال میں کسی نفع کے حصول اور کسی مضرت کو دفع کرنے کی لذت کو متحمل کرتا ہے، پھر اُس کا یہ خیال اُس نفع یا لذت کی جو صورت ذہن میں بنتی ہے، اُس کا خلاصہ اس شخص میں جو ارادہ و عزم کی قوت ہوتی ہے، اُس کے سپرد کرتا ہے۔ چنانچہ اس سے اس شخص کی قوت ارادہ میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ عزم ہے اور پھر جس چیز کے لئے عزم ہو، اُس کو حاصل کرنے کے لئے بدن کے اعضاء متحرک ہوتے ہیں۔ بعینہ یہی کیفیت ایک قوی نفس کی جب کہ

وہ سب چیزوں سے مجتہد اختیار کر لیتا ہے، ہوتی ہے۔ مثلاً عالم ناسوت میں جو واقعہ رونما ہونے والا ہوتا ہے، سب سے پہلے اُس واقعہ کی ہمت اس نفس میں متشکل ہوتی ہے۔ یہ نفس اس ہمت کی جو صورت کہ اُس کے اندر بنتی ہے، اُس کا خلاصہ نکال کر اُس کو اس بارگاہ تک جس کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے، پہنچاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس نفس کو اپنے رب کی معرفت بھی حاصل ہوتی ہے۔ الغرض ہونے والے واقعہ کی ہمت کی اس صورت کا خلاصہ جب اُس بارگاہ میں پہنچتا ہے تو اس سے طبیعت کلیہ میں قصداً رو بہ حرکت ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہونے والے واقعہ کی صورت عالم مثال میں ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد جب وہ وقت آتا ہے کہ یہ واقعہ عالم ناسوت میں ظاہر ہو تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے عالم مثال میں اس کی مثالی صورت بنائی تھی اُسی طرح وہ عالم اجسام میں اس کی جسمانی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ اس ضمن میں میں نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ نفس کی ہمت کی اس طرح کی تاثیر جس کا ذکر ابھی ہوا ہے، انسانیت کا کمال ہے۔ اور یہی وہ کمال ہے کہ مرنے کے بعد جب یہ نفس عالم برزخ میں پہنچتا ہے تو یہ جو لوح الہی میں سے ایک جگہ بن جاتا ہے۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی ————— ہے کہ

پر منکشف ہوتا ہے کہ قصا کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ فلاں واقعہ اسی طرح ہو۔
 اور یہ کہ ایسا ہونا قصائے مبرم سے مقدر ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے بعد
 عارف اپنی پوری ہمت سے دُعا کرتا ہے۔ اور اس دعا میں وہ بہت عجز و
 الحاح سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ قصا کسی دوسری
 صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اس واقعہ کی بجائے کوئی دوسرا واقعہ
 ظہور پذیر ہو جاتا ہے، جو اُس عارف کی ہمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اسکی
 مثال حماد و عباس کے سامعینوں میں سے ایک تاجر کا وہ قصہ ہے۔ جو
 سید عبد القادر جیلانیؒ سے مروی ہے۔ اور نیز مرزا ہدایت اللہ کے معاملہ
 میں وہ واقعہ جو میرے والد بزرگوار کو پیش آیا۔ اسی سلسلہ میں اس طرح
 کے اور بھی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

اس معاملے میں یہاں ایک بڑا اشکال ہے، جو کسی سے مخفی
 نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اس طرح جو کچھ
 ہوتا ہے، اُس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ
 بعض اسبابِ عالیہ کا یہ تاکیدی اقتضا ہوتا ہے کہ یہ امر اس طرح ہو۔ اور
 جب کسی امر کے متعلق یہ اقتضا ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس امر
 کے متعلق یہ فیصلہ مقدر ہو چکا ہے۔ اور اُس کے خلاف کوئی اور احتمال نہیں
 ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس اقتضا کے ضمن میں ہونے والے واقعہ
 کی پوری صورت اس طرح مرتب ہو جاتی ہے کہ کسی سبب سے اُس میں خلل
 پڑنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اب عارف پر یہ اقتضائے تاکیدی معہ

ہونے والے واقعہ کی صورت اور ہیئت کے منکشف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس اقمینار کے وزن سے قضاے میرم کو دیکھتا ہے۔ لیکن وہ اسکو صاف طور پر پہچان نہیں سکتا۔ اور اس کو یہ گمان ہوتا ہے کہ میں نے قضاے میرم کو واضح طور پر دیکھ لیا۔ پھر اس عارف کی ہمت نزول قضا کے اسباب میں سے ایک سبب بن جاتی ہے۔ اور جب ان اسباب میں باہم تضادم ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت ان اسباب میں سے کسی سبب کی قوتوں میں "قبض" پیدا کر دیتی ہے۔ اور کسی میں "بسط" اور اس طرح جو ہونے والا واقعہ ہوتا ہے، وہ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

اس طرح کے واقعات کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہوتا یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ عالم ناسوت میں ایک واقعہ کو جسمانی اجزاء میں مرکب کرنے سے پہلے وہ روحانی قوتوں کے اجزاء سے اس واقعہ کو عالم مثال میں ترکیب دیتا ہے۔ اور پھر وہ اس مثالی صورت کو اس دنیا میں نازل فرماتا ہے۔ اور اس طرح اس واقعہ کی مثالی صورت اس کی ناسوتی صورت سے

۱۔ "قبض" کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز میں فطری استعداد ہے۔ لیکن کسی مصلحت الہی کی وجہ سے وہ فطری استعداد پوری طرح بروئے کار نہیں آتی۔ اور بسط سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز کی فطری استعداد میں خلاف معمول بہت زیادہ قوت اور اثر پیدا کر دیتا ہے۔

(متزعم)

متحد ہو جاتی ہے۔ اور یہی مراد ہے "انعام" میزان اور حیدر کو نازل کرنے سے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اور نیز یہی مطلب ہے اس کا کہ آسمان سے بلائیں اترتی ہیں۔ اور دعاؤں سے ان کا تدارک ہو جاتا ہے *

✓ عالم مثال میں اللہ تعالیٰ کسی واقعہ کی جو مثالی صورت پیدا کرتا ہے، وہ کبھی کبھی سٹ بھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: "اللہ جس کو چاہتا ہے، اسٹا دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے، باقی رکھتا ہے، اور اللہ کے پاس تو اُم الکتاب ہے۔" کسی چیز کے اس طرح مٹانے کا نام "رد قصا" ہے۔ اور اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ "وَعَاكِهِ سَوَاقِصْنَا" کو کوئی چیز رد نہیں کر سکتی۔ الغرض عارف پر ایک واقعہ کی صورت کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ اس کو قصائے سبرم کا فیصلہ سمجھ لیتا ہے۔ پھر اس عارف کی ہمت اس واقعہ میں مزاحم ہوتی ہے تو وہ اس کا

لَمْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلْ مِنْهَا زُجُجًا وَأَنْزَلَ
لَكُمْ مِنْ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ - سُوْرَةُ الزَّمَرِ

اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ - سُوْرَةُ الشُّوْرَى
لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيُقِوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ - سُوْرَةُ الْحَدِيدِ ۲۵

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ - سُوْرَةُ الْحَدِيدِ ۲۵

رُخ اُس کی طبعی راہ سے دوسری طرف پھیر دیتی ہے +

✓ اس مشاہدہ میں یہ مزید تحقیق بھی ہے — کسی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے اور وہ بات وعدے کے مطابق نہیں ہوتی۔ یا جو اس کے کبھی وعدہ چچے الہام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح وعدے کا پورا نہ ہونا اکثر لوگوں کے لئے ایک اشکال بن گیا ہے اور مشائخ صوفیاء نے اس اشکال کو دور کرنے کے لئے اس ضمن میں گفتگو بھی کی ہے۔ مثلاً ان کا کہنا یہ ہے کہ بسا اوقات ایک بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ایک اچھی بات کا وعدہ کرتا ہے اور وہ اسی وعدہ کی بنا پر اس اچھی چیز کی رغبت کرنے لگتا ہے۔ اور وہ اس کا انتظار کرتا ہے۔ لیکن بعد میں یہ وعدہ پورا نہیں ہوتا۔ مثلاً کا خیال ہے کہ اس وعدے کا پورا نہ ہونا اُس بندے کے حق میں اللہ تعالیٰ کے مزید لطفت و کرم کا باعث بنتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ یہ شخص اُس اچھی چیز کی محبت سے جس کا کہ اُس سے وعدہ کیا گیا تھا، پیغم کی محبت کی طرف اور افعال اعلیٰ کی محبت سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی محبت کی طرف ترقی کرتا ہے۔ یعنی ان مشائخ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سکا پورا نہ کرنا کوئی نقص نہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس طرح کی بات سے بھی مستزہ کرنا ضروری

اور قایدی ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ وعدہ پورا نہ کرنا بسا اوقات بخل
قریب احد و صوحا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ ایک نقص ہے۔ اور خدا تعالیٰ
کی ذات میں طرح کے نقص سے بالکل پاک ہے +

الغرض ان مشائخ کے نزدیک اللہ کا اپنے وعدہ کو پورا نہ کرنا اکثر
اوقات بندے پر اللہ تعالیٰ کے مزید لطف و کرم کا باعث اس کی
ترقی کا سبب اور اس کے قرب کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یعنی وعدہ پورا نہ
کرنا ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ کی صفات کمال میں سے ایک صفت
ہوتی۔ چنانچہ اس بات کو ثابت کرتے کرتے وہ نظریں بھی پیش کرتے
ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ان کی ایک نظیر یہ ہے کہ بعض دفعہ کلام
میں رعایت فاصلہ کے خیال سے کلمہ کو مقدم یا موخر کر دیا جاتا ہے
اور اس طرح جب کہ کسی حقیقت کی صحیح تفسیر کے لئے موزوں کلمہ نہ
ملے تو اس حقیقت کو مجازی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ مشائخ نے
اس اسلوب کلام کو بھی اللہ تعالیٰ کے وعدہ پورا نہ کرنے کے جواز میں
بطور تفسیر کے پیش کیا ہے۔ اور اس ضمن میں اس طرح کی اور مثالیں
بھی دیتے ہیں +

بات یہ ہے کہ اگر ہم کلام میں کلمہ کی تقدیم و تاخیر کو اس نظر سے
دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے مجبور تھا۔ اور وہ اس کے برعکس
کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا، تو یہ ایک نقص نہ تھا۔ اور اگر کلمہ کی تقدیم و
تاخیر کو اس طرح سمجھیں کہ چونکہ قرآن مجید قریش کی زبان میں نازل

ہوا۔ اور ان کے ہاں رعایت فاصلہ یا ترکیب کی ہر ذریت اور اس کی
 عمدگی کے خیال سے کلام میں کسی کلمے کو اپنی جگہ سے مقدم اور موخر کر دیا
 کرتے تھے۔ اس لئے کلام الہی میں کلمہ کو مقدم اور موخر کیا گیا۔ اور یہ
 تقدیم و تاخیر کسی اضطراری وجہ سے نہیں تھی، بلکہ یہ تو قریش پر اللہ تعالیٰ
 کی مہربانی تھی کہ قرآن ان کی زبان میں جس کو وہ جانتے تھے، نازل ہوا۔
 تاکہ وہ اسے سمجھیں اور اس میں خوب غور و تدبر کریں۔ الغرض اگر ہم کلمے
 کی تقدیم و تاخیر کو اس طرح لیں تو پھر تو واقعی کلمے کا مقدم و موخر
 ہونا صفات کمال سے ہے۔ لیکن مشائخ نے اُسے اللہ تعالیٰ کے کسی
 وعدہ کو پورا نہ کرنے کے ثبوت میں بطور نظیر کے جو پیش کیا ہے، اب
 تم خود ہی دیکھ لو کہ یہ کہاں تک صحیح ہے۔ باقی ہم نے تو یہاں اس ضمن
 میں صرف اُن کا قول اور اُس کی توجیہ عرض کی ہے +

✓ اس سلسلہ میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ کسی وعدہ الہی کے متعلق مشائخ کا یہ
 وجدان جس کا کہ اُن پر انکشاف ہوا، بے شک حق تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ
 اس انکشاف کے بعد جب ان مشائخ نے اپنے اس وجدان پر سوچ بچار
 کی تو ظاہر ہے وہ علوم جو پہلے سے اُن کے سینوں میں تھے + وہ اس
 سوچ بچار کی حالت میں اُن کے ذہنوں میں آ موجود ہوئے۔ چنانچہ
 انہوں نے ان علوم ہی کے پیرایہ بیان میں اپنے اس وجدان کی تاویل
 کی۔ اور اس تاویل سے اُن کے دل غیر شعوری طور پر مطمئن بھی ہو گئے۔ اور
 یہ بات قرین قیاس بھی ہے۔ اور ایسا اکثر ہوتا ہے اور یہی چیزیں مسلمین

جو اس وقت زیر بحث ہے، بطور نظیر کے پیش کی جاسکتی ہے۔ یعنی جس طرح اللہ اپنے بندے سے جو وعدہ کرتا ہے وہ حق ہوتا ہے، لیکن اس وعدہ میں خیر چیز کا ذکر ہوتا ہے، کبھی ظاہر ہوتی ہے اور کبھی نہیں، اُسی طرح مشائخ کو جو وعدہ دیا ہوتا ہے، وہ تو حق ہے، لیکن اُس وعدہ کی جو وہ تعبیر و تاویل کرتے ہیں، وہ اُن کی اپنی گھڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اب تم اس میں خوب غور و تدبیر کرو +

الغرض اس مسئلے میں واضح اور صریح حقیقت یہ ہے کہ جب بندے اور صاف طور پر ظاہر ہونے والی تجلی کی کیفیت کے درمیان حجاب حائل ہو اور بندے اور اس تجلی کی درمیانی فضا اتنی تنگ ہو جائے کہ اُن دونوں میں انگوٹھے اور اُس کے ساتھ کی انگلی کے بیچ میں جو جگہ ہے، اُس کے برابر گنجائش رہ جائے تو اُس وقت بندے کو جو الہام ہوتا ہے، تو وہ الہام جس حالت میں کہ بندہ ہوتا ہے، اُسی کے مطابق حقائق کی تجلی کی ایک قسم ہوتی ہے۔ چنانچہ حقائق کی یہ تجلی یا تو خطاب کی صورت اختیار کرتی ہے، یا الہام کی یا دل میں خود بخود کسی خیال کے پیدا ہونے کی، اور یا ہفت کی۔ اور اس بات کا اخصار کہ حقائق کی یہ تجلی کون سی صورت اختیار کرے، قوائے دراکہ کی مختلف استعدادوں پر اور نیز اس وقت کن اسباب کا غلبہ ہوتا ہے، اُن پر ہے۔ الغرض جیسے حالات ہوتے ہیں، اُسی کے مطابق حقائق کی تجلی ظہور پذیر ہوتی ہے +

اب رہے یہ سوال کہ الہام کے ذریعہ بندہ سے جو وعدہ ہوتا ہے
 اُس کے پورا نہ ہونے کا کیا سبب ہے ؟ سو اس کی دو وجہیں ہو سکتی
 ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ مثلاً ملاء اعلیٰ کے اکابر میں سے ایک بڑے
 فرد کا اقتضا ایک شخص پر منکشف ہوتا ہے۔ اب اگر اس اقتضا کی راہ
 میں کوئی چیز حائل نہ ہو، اور اُس کو پوری آزادی ہو تو حکمت الہی میں
 یہ طے تھا کہ اُس فرد کی دعا قبول ہوتی۔ اور جس چیز کا وہ متقاضی تھا
 پوری ہو جاتی۔ لیکن ملاء اعلیٰ کے اس فرد کے علاوہ اور بھی اقتضا
 تھے، جو اس فرد کے اقتضا کی طرح کے اس سے زیادہ ضروری تھے اور
 حکمت الہی میں یہ طے ہے کہ جب دو اقتضا اُس قوت میں جو کہ طبیعت
 کلیہ میں بمنزلہ انسان کی قوت عزم و ارادہ کے ہے، اور یہی قوت انسان
 کے اعضاء کی حرکت کا باعث بنتی ہے، جمع ہوں۔ اور دونوں آپس
 میں کش مکش ہو تو جس جس چیز کا یہ دونوں اقتضا مطالبہ کرتے ہیں، اُن کے
 علاوہ کسی تیسری چیز کے حق میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اور عالم مثال
 میں کوئی دوسری صورت ظہور پذیر ہو جاتی ہے +

اب یہ شخص جس پر یہ واقعہ منکشف ہوتا ہے، وہ بیشتر اُس قوت
 عازمہ کی اصل تک جو طبیعت کلیہ کے قلب میں متمکن ہے، نہیں پہنچ
 پاتا۔ اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ طبیعت کلیہ کی یہ قوت عازمہ عرش
 میں ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے مرکز عرش تمام عناصر اور موالید یعنی
 جمادات، نباتات، اور انسانوں کا مرجع و عاوی بن گیا ہے۔ الغرض

جس شخص پر یہ واقعہ منکشف ہوا تھا، وہ طبیعت کلیہ کی قوت عازمہ کی اصل تک اس طرح نہ پہنچ سکا کہ وہ اُس قوت سے بلا واسطہ متصل ہو جاتا، اور اُس سے بل مشافہ علم حاصل کرتا۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ ملا اعلیٰ کے اُس فرد کا جو اقتضا تھا اُس کے خلاصے اور صرف اُس کی خالص ہمت تک یہ شخص پہنچا۔ اور اسی روزن سے اُس نے طبیعت کلیہ کی قوت عازمہ کو دیکھا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اُس شخص کی نظر میں جو چیز کہ وہ دیکھ رہا تھا، اُس چیز کے ساتھ ساتھ حسن شیشے میں وہ اُس چیز کو دیکھ رہا تھا، اُس کا رنگ بھی مخلوط ہو گیا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے وہ شخص اسباب کے احاطہ سے قاصر رہا۔ اور اصل حقیقت کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ اور اس ضمن میں اُس نے صرف ملا اعلیٰ کے اُس بڑے فرد کے اقتضا، اور محض اُس کے حکم کو جانا۔

بات دراصل یہ ہے کہ ملا مائی کے اُس بڑے فرد کی ہمت جو احکام کہہ داتی ہوں تو جمع کبریائی ہوتی ہے اور جو مخالفت احکام ہوں ان کو وہ روکتی ہے۔ اور موافق احکام کو جمع کرنے اور مخالفت احکام کو رد کرنے کی یہ کشمکش غیر شعوری طور پر اس شخص کے اندر بھی سراپت کر جاتی ہے، جس پر ملا اعلیٰ کے اُس بڑے فرد کے اقتضا کا انکشاف ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس شخص پر اس اقتضا کا انکشاف ہوتا ہے۔ تو ان اسباب کی بنا پر جن میں سے بعض کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اور بعض کا ذکر ہم نے نہیں کیا، اُس شخص کے لئے یہ انکشاف مناسبت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس خطاب میں اس شخص

کو واقعہ کی ایشافہ خبر نہیں دی جاتی کہ اُس خبر میں کسی قسم کا کوئی شک نہ
 ہے، اور وہ یقینی طور پر بھی خبر ہو۔ اس انکشاف کی دوسری صورت یہ ہوتی
 ہے کہ اُس شخص پر اجمالاً ایک بات کا انکشاف ہوتا ہے۔ اور یہ اجمالی انکشاف
 اُس کے لئے اجمالی الہام میں بدل جاتا ہے۔ چنانچہ اُس شخص کے اُس
 الہام پر جو اُسے اجمالی انکشاف کے ضمن میں ہوتا ہے، وہ علوم جو پہلے
 سے اُس کے سینے میں جمع ہوتے ہیں، پوش کر تے ہیں۔ اور غیر شعوری
 طور پر وہ اس شخص کے اُس الہام کی اپنے رنگ میں شرح کرتے ہیں، بالکل
 اسی طرح جس طرح کہ جب کسی شخص کو خواب میں کوئی اجمالی انکشاف ہوتا
 ہے تو وہ علوم جو اس خواب دیکھنے والے کے سینے میں پہلے سے موجود
 ہوتے ہیں، وہ اُس کے اس انکشاف اجمالی کو رویا کی شکل دے دیتے ہیں
 اور اُس کو اس رویا کی تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح اس شخص
 کو اپنے انکشاف اجمالی کے لئے بھی جو بعد میں الہام کی صورت اختیار
 کر لیتا ہے، اور پھر اُس کے سینے میں پہلے سے جو علوم جمع ہوتے ہیں،
 وہ اُس الہام کو اپنے رنگ کی تاویل دے دیتے ہیں۔ الغرض اس انکشاف
 اجمالی کو بھی جو الہام اور اس طرح کی تاویل سے محفوظ ہوتا ہے، تعبیر کی
 ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ جو کنا گیا ہے کہ انکشاف اجمالی کے سلسلہ میں
 اُس شخص کو جو الہام ہوا تھا۔ اور اُس نے اس الہام کی جو شرح کی تھی
 اور یہ شرح جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، اُس شخص کے اندر پہلے سے
 جو علوم جمع تھے، اُن کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اب اگر یہ صحیح ہے

تو اُس شخص کو اس شرح سے طہانیت اور سکون کیوں حاصل ہوا؟ بات یہ ہے اُس شخص کے اس سکون اور طہانیت کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ یہ تو دراصل اُسے اُس انکشاف اجمالی کی وجہ سے حاصل ہوا تھا۔ جو اس شرح میں بطور اساس کے محفوظ تھی۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کو انکشاف اجمالی ہوا پھر اُس شخص کے اپنے نفس کے دوسرے، اُس کی طبیعت کی جلد بازی اور شیطان کے بہلاوے اُس پر پل پڑے۔ اور اُنہوں نے اس شخص کے اندر ایسا اشتباہ پیدا کر دیا کہ اُس شخص کی نظر اصل واقعہ۔ اور بعد کی ملاوٹوں میں تمیز نہ کر سکی۔ چنانچہ اس کی وجہ سے اُس پر اصل حقیقت کا انکشاف نہ ہو سکا۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے واقعہ کو اس مخلوط صورت میں دیکھا۔ اُس نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فلاں چیز کا وعدہ کیا۔ لیکن وعدہ پورا نہ ہوا۔ اب ایک اور شخص ہے جس پر ایک واقعہ کا انکشاف ہوا، اور اس نے اُس کی ایک ایک چیز کو الگ الگ صاف صاف دیکھ لیا۔ اور اس نے کہا کہ یہ وعدہ اجمالی ہے۔ چنانچہ یہ وعدہ پورا ہو گیا۔ اب یہ اُور بات ہے کہ یہ وعدہ کس رنگ میں اور کس قالب میں پورا ہوا ہو۔ باقی رہا وہ انکشاف اجمالی کہ جس شخص کو یہ انکشاف اجمالی ہوا تھا، اُس کے سینے میں پہلے سے جو علوم محفوظ تھے، اُس نے ان علوم کی روشنی میں اس انکشاف اجمالی کی شرح و تفسیر کی، تو واقعہ یہ ہے کہ اس انکشاف اجمالی کی تعبیر کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ صحیح طرح نہیں ہو پاتی

یہاں ایک بہت ہی مشکل سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا ارادے کا تعلق ذات الہی کے سوا جو چیزیں ہیں، اُن کو چھوڑ کر محض اُس ذات کی اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ہے۔ اور نیز استدعا کے لیے صاحب ارادہ ذات کے لئے اس ارادے کا واجب ہونا، اس بات کی طرف نہیں لے جاتا کہ یہ ارادہ خود ذات واجب الوجود کے لئے واجب کا حکم رکھتا ہے۔ یا کیا ذات واجب الوجود کے لئے اس جہت سے ارادے کا واجب ہونا اُسے ذات واجب الوجود کی طرف نہیں لے جاتا۔ جس طرح کہ خود ذات الہی کے لئے ارادے کا وجوب اُسے ذات کی طرف لے جاتا ہے۔ الغرض یہ ایک ایسا راز ہے جو اکثر لوگوں کے لئے مخفی رہا ہے *

اس معاملے میں حق بات یہ ہے کہ جو خود اپنی اصل ذات میں اپنی ذات اور اپنے وجود کے واجب ہونے کے وصف سے خالی ہے، وہ ہر اُس کمال سے جو اُس کے واجب ہونے اور اُس کے وجود میں آنے کے بعد اُس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ جہاں تک کہ خود اُس کی اپنی ذات کا تعلق ہے، وہ اس اعتبار سے اُس کمال سے بھی خالی ہوگا۔ چنانچہ اُس کو اس کمال سے وہی آراستہ کرتا ہے جس ذات نے کہ خود اُس کو اپنی طرف سے وجوب کی خلعت بخشی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ذات واجب الوجود ہے ارادے کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے کہ اُن تاثیر کرنے والی استعدادوں کے بسط و ظهور کا جنہیں "اسرار" کا نام دیا گیا ہے، اور نیز اُن تاثیر کرنے والی استعدادوں

کا جنہیں "اعیان" کہا جاتا ہے، ذات واجبہ تعلق ہے یعنی جس طرح ان اسماء اور اعیان کے "ظہور" کے لئے ذات واجبہ کا اقتضا ہوتا ہے۔ اور ذات واجبہ کے لئے ان اسماء اور "اعیان" کا ہونا لزوم میں ہے ہی طرح ذات واجبہ کے ساتھ ارادے کا تعلق ہے۔ یہ جو دو اثر کریموالی استعدادیں ہیں ان کے ظہور کی ایک حد مقرر ہے جو خود ذات واجبہ کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے کہ اس میں نہ زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی۔ اب ہم اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ایک مثال دیتے ہیں۔

ایک حساب کرنے والا جب حساب کرتا ہے تو اس کے حساب کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ حساب کرنے والے کا ارادہ ایک کے عدد سے متعلق ہوتا تو اس سے ایک کا عدد بتا۔ اور جب ایک کے عدد کو اس کی نظر نے دوبار دیکھا تو دو کا عدد معرض وجود میں آیا۔ اور اسی طرح جب اس نے ایک کے عدد کو تین بار دیکھا تو تین کا عدد بن گیا۔ غرضیکہ جب حساب کرنے والا کا ارادہ ایک سے دو، دو سے تین، اور اسی طرح تین سے جو اگلا عدد اس کو اس سے، اور پھر اس سے جو اگلا عدد ہے، اس کو اس سے نکالتا چلا جائے گا تو جہاں تک کہ حساب کرنے والے کے علم کی حد ہوتی ہے اس حد تک اس ایک عدد سے اکائیاں، دہائیاں، سینکڑے اور ہزارے نکلتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ جہاں تک کہ حساب کرنے والے کی عقل فرض کر سکتی ہے۔ وہ ان اعداد کو ایک دوسرے کے ساتھ برابر جمع کرتا ہوا چلا جائے گا، یہاں تک کہ یہ اعداد اپنی اس شکل میں لا نہایت حد تک پہنچ جائیں۔ اب اگر ان تمام اعداد کو اس کی اصل کی نسبت سے جو ایک کا عدد ہے، اور جس سے

کہ یہ سب اعداد نکلے ہیں، دیکھتے تو یہ سب اعداد ایک کے عدد میں محصور نظر آئیں گے۔ اور ان اعداد میں آپس میں جو فرق مراتب ہے تو وہ اس ایک عدد کے اعتبار سے نہیں ہوگا، بلکہ جس طرح یہ اعداد درجہ بدرجہ اس ایک کے عدد سے نکلے ہیں ان میں فرق مراتب اس لحاظ سے ہوگا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اعداد کی ان بے شمار صورتوں کے ظہور کی علت صرف اتنی تھی کہ محاسب کے اندر حساب کرنے کا ایک کمال موجود تھا۔ چنانچہ محاسب نے اپنے اس کمال کو ظہور میں لانے کا ارادہ کیا۔ اور اس طرح یہ اعداد معرض وجود میں آتے چلے گئے۔ باقی رہ خود ان اعداد میں جو ترتیب انحصار اور انضباط ہے کہ اس میں نہ کوئی کمی ہو سکتی ہے اور نہ بیشی، تو یہ چیز تو محاسب کے ارادے کی فعلیت پہلے ہی ان اعداد کی خود اپنی طبیعت میں موجود تھی اور محاسب کا ارادہ جب ان اعداد کو اس ترتیب و انضباط سے وجود میں لاتا ہے تو وہ گویا ان اعداد کی جو اپنی طبیعت ہوتی ہے اور ان کے ظہور کے جو احکام سمجھتے ہیں وہ صرف ان کو پیش کر دیتا ہے۔

اب جو ہم چیزوں کے بنانے اور ان کے ایجاد کرنے کو ان چیزوں کی "ماہیات" کی طرف منسوب کرتے ہیں تو "ماہیات" کی طرف ہمارا ان چیزوں سے کوئی شے عیدم سے وجود میں نہیں آتی۔ عدم سے تو عدم ہی برآمد ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اشیائے عالم کس طرح وجود میں آئیں۔ بات یہ ہے کہ ہر شے قبل تخلیق حق تعالیٰ کے علم میں موجود تھی پھر اس نے ان اشیاء کی قایم میں تخلیق کی۔ یعنی ہر شے خارج مخلوق ہے۔ حق تعالیٰ کے قائل ہیں۔ اور اشیاء کی ذوات قبل تخلیق علم الہی میں ثابت ہیں۔ وہ معلومات حق ہیں۔ صورت علم حق ہیں۔ بنو نیاز کی اصطلاح میں ان ذوات اشیاء کو "اعیان ثانیہ" کہتے ہیں۔ اور ان کے دوسرے نام ماہیات، اشیاء اور حقائق اشیاء ہیں۔ (مستزعم)

کو منسوب کرنا ایسا ہی ہے، جیسے ہم اوپر کی صورت میں اعداد کے درجہ سے
وجود میں آنے کو محاسب کی تاثیر کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ اور "ماہیات" سے ان
چیزوں کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے، ان چیزوں کی ان "ماہیات" اور ان
کے لوازم کو اُس ذات حق سے جس سے کہ ان "ماہیات" کا فیضان ہوتا ہے
ایسی ہی نسبت ہے جیسی کہ ان اعداد کے ترتیب و درجہ کو اُس ایک کے
عدد سے ہے، جس سے کہ یہ اعداد نکلے ہیں، اور ایک عدد کا دوسرے عدد
پر تقدم اور ان میں جو فرق مراتب ہے، یہ چیز خود ان اعداد کی اصل طبیعت
میں داخل ہے۔ الغرض جب یہ بات واضح ہو گئی تو اس سے لوگ، جو یہ
کہتے ہیں کہ "ماہیات غیر معمول ہیں، یعنی یہ بنائی (جعل) نہیں گئیں۔ بلکہ
ان کے بنانے اور ایجاد کرنے کا مطلب صرف ان کا ظہور اور فیضان مقدس
ہے، تمہیں اس بات کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اب اگر ان "ماہیات"
کا ربط و تعلق اُس ذات حق سے جو ان کی فیضان کرنے والی ہے، تو وہ
تعلق ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک کے عدد سے بعد میں اُس ایک سے جو
اعداد نکلتے ہیں، اُن کا ہوتا ہے۔ اور ان "ماہیات" کے اندر ان "ماہیات"
کے جو خواص ہیں، اُن کے تعین کو یوں سمجھئے۔ جیسے کہ اعداد میں ان کی
درجہ بدرجہ مراتب کی خصوصیات ہیں کہ فعلاً وجود میں آنے سے پہلے اُن کا
وجود مفروض ہوتا ہے۔ اور "ماہیات" کے ان خواص کا وجود مفروض سے
وجود فعلی میں آنا عبارت ہوتا ہے اُن کے ظہور اور فیضان اقدس سے۔
الغرض جس طرح اعداد کا سلسلہ ایک کے عدد سے لے کر لامتناہی

تک علی الترتیب چلا گیا ہے۔ اور افراد کا یہ سلسلے کا سارا لانتنا ہی سلسلہ اسی ایک کے اندر
 فرضاً اور تقدیراً موجود ہے نہ کہ فعلاً۔ اسی طرح طبیعت کلیہ کے اندر جو بھی اُس کے ارکان، اول
 نیز جو بھی جمادات، نباتات اور حیوانات ہیں اُن سب کا ایک مرتب سلسلہ جس کے خواص اور
 مراتب معلوم ہیں موجود ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں طبیعت کلیہ کے انہی حقائق
 کی زبان سے یہ کہلایا ہے "وَمَا يَذَّكَّرُ لَهُ إِلَّا لِمَا مَقَامٌ مَّعْلُومٌ" یعنی ہم میں سے ہر چیز کا ایک
 مقام ہے۔ اس طبیعت کلیہ سے انواع کا ظہور ہوا اور انواع کا ظہور جس جہاں تقسیم
 حصری کا طریقہ ہے اُس کے مطابق ہوا، یعنی ان میں نہ مزید کوئی زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی
 اور ابتداء تک کمی اور بیشی کا کوئی امکان نہیں۔ ان انواع سے پھر افراد ظاہر ہوئے اور افراد کے
 ظاہر ہونے کی صورت یہ ہے کہ فلکی اور ارضی اتصالات انواع پر اثر انداز ہوئے اور اُن کی
 ایک وضع سبب اور باعث بنی دوسری وضع کے مجہود میں آنے کی۔ اور اس طرح ان کے
 افراد کا سلسلہ غیر متناہی حد تک پھیلتا چلا گیا۔ قصہ مختصر "ماہیت الماہیات"
 اور حقیقتہ الحقائق سے انواع و افراد کا یہ جو سلسلہ لا متناہی حد تک پھیلتا
 چلا گیا ہے، یہ سبب کا سبب سلسلہ حقیقتہ الحقائق اور اشیاء کے اصل بسبب میں
 باعتبار فرض اور امکان کے نہ کہ بلحاظ تعین بالفعل کے موجود تھا،

وَمَا مَنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ وَإِنَّا لَنُحْشِرُ الْمُصَافُونَ ۝

سورۃ الصافات ۱۶۱

یہ تقسیم حصری سے مراد ایسی تقسیم ہے، جس سے آگے کوئی اور تقسیم نہ ہو سکے۔ مترجم
 کہ افلاک و کواکب کے اثرات کا عقیدہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ نفوس انسانی کی افراد کا
 خصوصیات کا سبب فلسفہ قدیم میں ان اثرات کو مانا گیا ہے۔ مترجم

ہیں۔ بعد حقیقت الحقائق کا خارج سے ربط قائم ہوا۔ چنانچہ خارج میں
 اس کی صورت آگئی۔ اس خارج کے ساتھ حقیقت الحقائق کا ربط ایسا ہے
 جیسے کہ ماہیات کی خصوصیات اور اُس کے لہذا کم کا اپنی ماہیات سے ہوتا
 ہے۔ اب حقیقت الحقائق نے خارج میں جو اپنے ارادے اور اختیار کی شئی
 فرمائی تو اس سے طبیعت کلیہ کا صدور عمل میں آیا۔ اور یہ طبیعت کلیہ شخص
 واحد کی طرح ایک وجود ہے کہ اس سے خود اُس کے ذریعہ اُس کے ارکان
 و عناصر ظاہر ہوئے۔ اور پھر ارکان و عناصر کے امتزاج سے موالید یعنی جمادات
 نباتات اور حیوانات کا ظہور ہوا اس طبیعت کلیہ نے جو شخص واحد کی طرح ایک ہے،
 اپنے رب کا جو یکتا و بے نیاز ہے، خود اپنے خیال میں ادراک کیا۔ تو اُس کے
 اس طرح ادراک کرنے سے طبیعت کلیہ کے اندر اللہ تعالیٰ کی ایک علمی
 صورت پیدا ہو گئی۔ یہ علمی صورت ایک اعتبار سے محض ایک علمی کیفیت ہے
 اور ایک اعتبار سے یہ علمی صورت بذات خود شے معلوم ہے۔ اور ایک
 اعتبار سے یہ فقط علم ہے۔ طبیعت کلیہ کے اندر اس طرح علمی صورت کا قیام
 یہ اُس کی پہلی تجلی ہے۔ اس کے بعد طبیعت کلیہ کی یہ تجلی مقید و محدود مدارک
 میں نازل ہوئی۔ اور ان مقید و محدود مدارک نے اُن بارگاہوں کی صورت
 اختیار کی، جن میں سے ایک بارگاہ "حظیرۃ القدس" ہے +

یہ حقیقت الحقائق وجود باطن ہے۔ جب اس وجود باطن کا ظہور ہوتا ہے تو وہ خارج

اُنٹالیسواں مشاہدہ

انسان کے اخلاق میں سے ایک خلق "سمت صالح" کے نام سے موسوم ہے۔ اور اس کی حقیقت عبارت ہے ایک شخص کے نفس ناطقہ میں اپنے اُن اعمال اور اخلاق کے متعلق بیداری سے جو نفس ناطقہ اور اللہ کے یا اُس کے دوسرے لوگوں کے درمیان ہیں۔ اور نیز یہ خلق عبارت ہے نفس ناطقہ کے نظام صالح کی طرف ہدایت پانے سے کہ اللہ تعالیٰ اُس کے اس طرح ہدایت پانے سے راضی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کا بھلا چاہتا ہے تو وہ اس کو اُن اعمال اور اخلاق کی جو اُس بندے کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں، صحیح معرفت عطا فرماتا ہے۔ اور اُسے نظام صالح کا راستہ دکھاتا ہے۔ اُس بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معرفت اور ہدایت کا فیضان اُس بندے کی کسی کاوش اور تردد کا صلہ نہیں ہوتا

بلکہ بارگاہِ رحمت کے اس فیضان کو ایک برکت سمجھئے جو خلقِ سمست صالح کو عطا ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی مطلب ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کہ ہم نے اُن لوگوں کی طرف اچھے کام کرنے اور نماز قائم کرنے کی وحی کی۔ اور بندے کے اندر ایجادِ فعل کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، تو اُس کی بھلی صورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد انسان کے اندر ان اعمال و اخلاق اور صالح نظام کا علم ایجاد کیا جاتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ بھی جب تک کہ اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان اعمال و اخلاق اور نظام صالح کی ہدایت نہ ملے، مکمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس ضمن میں اکثر لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ بارگاہِ رحمت سے بالمشافہ طور پر بغیر کسی واسطے کے اس ایجادِ فعل اور ایجادِ علم سے مستفید نہیں ہوتے۔ اس لئے اس سلسلہ میں بہتر یہی ہوتا ہے کہ یہ رحمت انسانوں میں سے کسی ایسے کامل کی طرف متوجہ ہو جو اپنی جبلت کے تقاضے سے اس امر کا مستحق ہو کہ ایک انسان پر طبیعت کے جو احکام عائد ہوتے ہیں، وہ ان سے بالاتر ہو جائے۔ اور پھر وہ کامل انسانوں کی جماعت میں ہو، اُس کے مزاج سے اور اُس جماعت کے مناسب جو اعمال و اخلاق ہیں، اُن سے اور نیز اُسکی جماعت کے لوگ اپنی حیوانی طبیعتوں سے ترقی کر کے کس طرح قربِ الہی کے اُس درجے تک جو اُن کے لئے مقدر ہو چکا ہے، پہنچ سکتے ہیں۔ اُس طریقے سے، اس طرح ہم نوا ہو جائے کہ اُس کامل کا انفرادی وجود

اُس کی جماعت کے اجتماعی وجود میں فنا ہو کر بقا حاصل کرے۔ اور پھر اس کامل میں فطرتاً یہ صلاحیت بھی ہو کہ وہ اپنی طبیعت کے مقام پست سے رُوح کے مقام قدس کی بلندیوں کی طرف جذب ہو سکے، تاکہ وہاں اُس کا نفس جن اعمال و اخلاق کا ذکر شروع میں ہو چکا ہے اُن کے اور نظام صالح کے رنگ میں رنگا جائے۔ اور وہ ان دونوں چیزوں پر اُن کی خوب تحقیق کرنے اور اُن کو اچھی طرح جاننے کے بعد اچھی طرح سے حادی بھی ہو جائے، الغرض وہ کامل جس کے اوصاف یہ ہوں، جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کامل کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو وہ اُسے اپنے ساتھ منضم کر لیتی اور اُس کو اپنے دامن میں ڈھانپ لیتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ستر الہی جو مطلوب مقصود ہوتا ہے، وہ اس کامل کے اندر نقش ہو جاتا ہے۔ اور وہاں پر اس ستر اجمالی کا یہ نقش جس جماعت میں کہ یہ کامل ہوتا ہے، اُس جماعت کے لئے احکام و قوانین کے قالب میں بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کامل سے یہ ستر اجمالی تو الگ ہو جاتا ہے، لیکن اُس نے اس ستر اجمالی کا علم اپنے ہاں محفوظ کر لیا ہوتا ہے۔ اب اس مقام سے گزرنے کے بعد جب یہ کامل سوچ بچار اور عزم و تفکر کے مقام میں وارد ہوتا ہے تو جو کچھ پہلے اُس کے علم میں محفوظ ہو چکا ہوتا ہے، وہ اب اس کامل کی زبان پر آ جاتا ہے۔ چنانچہ انبیاء کرام پر وحی کے ذریعے جو شریعتیں نازل ہوتی ہیں۔ اور اولیاء پر کشف و الہام کے ذریعہ جن طرق تصوف

کا نزول ہوتا ہے، اُن سب کی حقیقت دراصل یہ ہے *

الغرض وہ شخص جو بالمشافہ بارگاہِ رحمت سے مستفیہ نہیں ہو سکتا اور وہ اس سلسلہ میں واسطے کا محتاج ہوتا ہے، تو یہ کامل جس کے کہ اوصاف اوپر گزر چکے ہیں، اس شخص کے لئے بارگاہِ رحمت سے استفادہ کرنے کا واسطہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہ شخص اُس کامل کی بات سنتا ہے۔ اور اُس کے لئے اس کامل کے ارشادات دلیلِ راہ بنتے ہیں نظامِ صالح تک پہنچنے کے۔ اور اس ضمن میں یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی فطرت اُس کامل کی طرف پڑھتی ہے۔ اور وہ جہاں تک کہ اُسے توفیقِ الہی میسر ہوتی ہے۔ اور جس حد تک کہ اُس کی فطری استعداد اُس کی سازگاری کرتی ہے، وہ "سمتِ صالح" کے خلق اور حکمت اور دانائی کے خلق کو اخذ کر لیتا ہے۔ اور عوام کے اطوار و اعمال سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اور اس سے اُس شخص میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ صالح نظام جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اس نظام کو شخص مذکور اپنی آنکھوں کے سامنے متحمل پاتا ہے۔ اور یہ نظام اُس کے لئے بطور ایک کسوٹی کے بن جاتا ہے کہ وہ شخص اپنے تمام حالات کو اس پر پرکھتا ہے قصہ مختصر اس طرح وہ شخص یہ سعادت حاصل کر لیتا ہے۔ اور اُن لوگوں میں سے ہو جاتا ہے جن کو کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا کی گئی *

مثال کے طور پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان کاملوں میں سے تھے۔

چنانچہ آپ کی عقل میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ اپنی ذاتی استعداد

کے مطابق جو کچھ بھی حاصل کر سکتی تھی، اُس کو حاصل کرنے کے بعد
 اُمت کے احوال اور معاملات کو بھی جاننے اور پہچانے۔ اور رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمرؓ کی اسی عقلی صلاحیت کی طرف
 اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔ "تم سے پہلے جو اُمتیں تھیں،
 اُن میں محدثین ہوتے تھے۔ اس اُمت میں اگر کوئی محدث ہے تو وہ
 عمرؓ ہیں۔" اور اسی سلسلہ میں آپؐ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ "اگر میرے
 بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔"

اب واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اس علم کا ایک حصہ
 عطا کیا۔ اور لوگوں کے لئے قرب الہی کے جو مشرب اور طریقے ہیں،
 اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اُن کی حقیقت سنبھالی۔ چنانچہ اس بارگاہ سے
 مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ انسان جب تک "نور طہارت" کو نہ پہچانے۔ اور
 وہ یہ نہ جان لے کہ آدمی سے یہ نور کس طرح زائل ہو جاتا ہے۔ اور نیز
 جب تک اُسے اس بات کا علم نہ ہو، کہ اس نور کے اور اُس شخص کی
 جو اپنی طبیعت ہے، اُس کے درمیان کون سے حجاب حائل ہوتے ہیں
 اور حسب الشان پر اُس کی طبیعت کا غلبہ ہوتا ہے، تو اُس غلبے کی کیا
 صورت ہوتی ہے۔ اور طبیعت کے اس غلبے کے تدارک کی کیا صورتیں
 ہو سکتی ہیں۔ یعنی جب تک وہ ان سے باخبر نہ ہو۔ اور پھر حسب تک
 وہ نفس کی اُن ہمتوں کو نہ معلوم کر لے جن کے ذریعے طہارت کے نور کو
 زائل ہونے کے بعد دوبارہ نفس میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ الغرض جب تک

وہ "نور طہارت" کے ضمن میں ان چیزوں سے واقف نہ ہو بلکہ اُس نے ان میں سے ایک ایک چیز کا خود تجربہ نہ کیا ہو۔ اور اس اعتبار سے اُس نے اپنے آپ کا اور اپنے نفس کے ان نشیب و فراز کا پورا علم حاصل نہ کر لیا ہو۔ اور اس کے بعد جب تک وہ یہ نہ جانتا ہو کہ سجدے میں مناجات کرنے سے کیا لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور جب تک اُسے اس بات کا علم نہ ہو کہ اس حالت میں روح میں کتنی رقت اور جلا پیدا ہو جاتی ہے کہ اُنہیں کی وجہ سے اُس کی روح کے اور اللہ کے درمیان جو حجاب ہوتے ہیں وہ اٹھ جاتے ہیں۔ اور وہ مناجات میں اللہ تعالیٰ کے اس طرح روبرو ہو جاتا ہے جیسے کہ اُسے سامنے دیکھ رہا ہے۔ اور نیز جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ دل سے اس طرح پردے اٹھنے کے بعد پھر دوبارہ کیسے اُس پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اور خشوع و خضوع کے وہ کون سے کلمات ہیں اور بدن اور نفس کی وہ کون سی ہستیتیں ہیں جنکی مدد سے پھر اُن پر دلوں کو دل سے ہٹایا جاسکتا اور گئی ہوئی کیفیتِ حضور کو واپس لایا جاسکتا ہے۔ اور جب تک وہ "یقین" کی نعمت سے بہرہ یاب نہ ہو جائے۔ اور "یقین" سے میری مراد اللہ کے متعلق پوری جمعیتِ خاطر اور اُس پر اعتماد کے ہیں۔ اور نیز جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ "یقین" کی اس نعمت سے ہی دُنیا اور آخرت کی بھلائی کے لئے بجز و الحاح و دعا کرنا، اور اس حقیقت کی معرفت میں کہ خود اُس کے اپنے اعمال و اخلاق، اور نیز زمانے کے حوادث و مصائب اُس کے ہاتھ میں نہیں بلکہ

یہ سب کی سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اور وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ یعنی اس حقیقت کی معرفت میں اُس کے دل میں جو دوسرے پیدا ہوتے ہیں، اُن سے خدا کی پناہ مانگنا، اور دُنیا اور آخرت کی بھلائی کے لئے جیسے کہ شروع میں ذکر کیا گیا ہے، بجز والحق دُعا کرنا، یہ دونوں کی دونوں باتیں اسی "یقین" کی وجہ سے ہی ظہور میں آتی ہیں۔ یعنی جب تک وہ اس کو نہ جان لے کہ یہ "یقین" ہی ہے جو ہر کام میں جو اُسے پیش آتا ہے۔ اُس کو استخارہ کرنے کی راہ دکھاتا ہے اور گھبراہٹ میں دُعا کو پناہ کا وسیلہ بنانا سچھاتا ہے، اور یہ "یقین" ہی ہے جو علم و معرفت کی لغزشوں میں اضطرابی طور پر اُس سے توبہ و استغفار کراتا ہے۔ اور پھر جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے لئے دُنیا اور آخرت میں جو جو نعمت تیار کر رکھی ہے، اور جس کا کہ مالِ قُرب الہی اور جنت ہے، یہ جسم کی سب فانی اور عارضی لذتوں سے بہتر ہے۔ اور اس طرح جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ "طبیعت" کا حجاب کیا ہوتا ہے اور وہ حجاب انسان پر کس طرح غالب آجاتا ہے۔ اور نورِ طہارت اور اُس سے دل میں جو طہانیت پیدا ہوتی ہے، "طبیعت" کا یہ حجاب اس میں ملے عرفانِ نفس کو عرفانِ حق کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ایک شخص کے لئے اس عرفانِ نفس کی راہ میں یہ تین حجاب حائل ہوتے ہیں۔ حجابِ طبیعت، حجابِ رسوم اور حجابِ مَواعظ و معرفت، طبیعت کے غلط اور فاسد تقاضے حجابِ طبیعت میں شمار ہوتے ہیں اور حجابِ رسوم سے مراد جماعت اور قوم کی بُری رسمیں ہیں۔ اور حجابِ سوءِ معرفت و علم کی لغزشیں ہیں۔ سترجم

کس طرح گڑبڑ پیدا کرتا ہے۔ اور پھر کس طرح طبیعت کو زیر کر کے اس حجاب کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ اور آخر میں جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ "رسوم" کا حجاب کیا ہے۔ اور "معرفت" کا حجاب کیا ہے۔ اور ان کو کس طرح دور کرتے ہیں +

الغرض جو شخص اوپر کی ان چیزوں کو بنفس خود جان لیتا ہے، خواہ اس کا ان چیزوں کو یہ جاننا اپنی ذاتی استعداد ہی کے مطابق ہو، وہ شخص اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور یہی وہ شخص ہے جس کے دل میں ایمان کی بشارت سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے۔ تمہیں چاہیے کہ تم اپنے نفس کے خود ہی طبیب بنو۔ اس لئے تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم ان علوم کو جن کا ذکر اوپر ہوا ہے پس پشت ڈالنے میں احتراز کرو +

چالیسواں مشاہدہ

اللہ تعالیٰ نے مجھے رُوح کی حقیقت سے مطلع فرمایا۔ اور بے شک رُوح عبارت ہے اُس شے سے کہ جب وہ بدن سے جدا ہوتی ہے تو انسان مرجاتا ہے۔ اور نیز رُوح ہی سے انسان میں احساس، حرکت اور زندگی ہے۔ اب رُوح کے کئی طبقے اور کئی لطیفے ہیں۔ اور رُوح کے ان طبقوں اور لطیفوں میں جو چیز بدن سے سب سے زیادہ قریب ہے، وہ جسم ہوائی ہے۔ یہ "جسم ہوائی" قلب میں ترکیب پاتا ہے، اور وہاں سے یہ سارے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ اور یہی "جسم ہوائی" انسان کی اور اکی اور طبعی قوتوں کا حامل ہے۔

"جسم ہوائی" کے بعد رُوح کا دوسرا طبقہ "حقیقتِ مثالی" ہے اور اس سے مراد رُوح کی وہ حقیقت ہے جو عالمِ ناموس میں آنے سے پہلے

عالم مثال میں تشکل پذیر تھی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ذریت آدم سے جو
 عہد و پیمان لینے کا ذکر ہے..... تو یہ عہد و
 پیمان بنی آدم کی ارواح کی ان مثالی حقیقتوں سے ہی لیا گیا تھا۔ اس
 کے بعد روح کا تیسرا طبقہ "حقیقت روحیہ" ہے۔ اور یہ صورتِ انسانیہ
 کا ایک حصہ ہے۔ اور قوائے افلاک و عناصر کے جو شخص عوارض ہیں، وہ
 اُس کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ اور اس کے۔۔۔ اپنے خاص احکام
 ہیں۔ اس کے بعد روح کا "صورتِ انسانیہ" کا طبقہ ہے۔ اور روح کا یہ
 طبقہ افراد اور اشخاص سے جن میں کہ یہ "صورتِ انسانیہ" مشخص ہوتی
 ہے، ایک الگ چیز ہے۔ اس کے بعد "صورتِ حیوانیہ"، پھر "صورتِ نامویہ"
 اور اس کے بعد "صورتِ جسمیہ" ہے۔ اور پھر طبیعت کلیہ کا ایک حصہ پھر
 باطن الوجود کا خارج کی لوح پر منبسط ہونا ہے۔ اب جو شخص روح کے ان
 طبقات اور لطائف کے پیش نظر یہ کہتا ہے کہ روح عبارت ہے ایک جسم
 لطیف سے، جو بدن میں اس طرح حلول کئے ہوئے ہے جیسے کہ کوئلے
 میں آگ ہوتی ہے۔ تو بے شک یہ شخص اپنے قول میں سچا ہے۔ اور اسی
 طرح جو شخص اس کا قائل ہے کہ روح ایک مجرد حقیقت ہے، تو وہ بھی
 سچا ہے۔ اور جو کہتا ہے کہ روح قدیم ہے تو وہ بھی سچا ہے۔ اور اسی
 طرح جو شخص کہتا ہے کہ روح حادث ہے، تو وہ بھی سچا ہے۔ الغرض
 ارشادِ خداوندی کے مطابق "بَکُلِّ وَجْهٍ هُوَ مُوَلِّئُهَا" ہر گروہ
 کی اپنی ایک سمت ہے، جس کی طرف وہ۔۔۔۔۔ رخ کرتے ہیں۔

لیکن اس ضمن میں یہ بات مخفی نہ رہے کہ ایک ہی تعبیر پر اختصار کر لینا
 قصور بہت کی دلیل ہے *

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی شامل ہے ————— رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”ہر نبی کو ایک دعا ایسی مرحمت ہوتی ہے،
 جو ضرور مقبول ہوتی ہے۔“ چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں کہ ”ہر نبی نے اپنی اپنی
 دعائیں مانگی۔ لیکن میں نے اپنی دعا محفوظ رکھی ہے۔ اور وہ میں قیامت
 کے دن اپنی امت کی شفاعت کے لئے مانگوں گا۔“ اب اگر تم یہ کہو کہ ہر
 نبی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سے زیادہ مقبول ہونے والی دعائیں
 عطا ہوتی تھیں۔ اور اسی طرح ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی بہت
 سی مقبول ہونے والی دعاؤں سے بہرہ یاب ہوئے تھے۔ مثلاً آپؐ نے بارش
 کے لئے دعا کی اور وہ مقبول ہوئی۔ اور اسی طرح اور بہت سے مواقع پر
 آپؐ نے دعائیں کیں، اور وہ مقبول ہوئیں۔ اب اس حدیث میں رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دعائیہ طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور آپؐ کے اس
 ارشاد کے سیاق و سباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی صرف ایک
 ہی دعا ہر نبی کو مرحمت ہوتی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ
 کون سی دعا ہے۔ اس کے جواب میں میرا کہنا یہ ہے کہ یہ دعا جس کا ذکر
 اس حدیث میں آیا ہے، اُن دعاؤں میں سے نہیں جو عام اغراض میں

سے کسی خاص غرض سے خصوصی تعلق رکھنے کی بنا پر اُس کے لئے کی جاتی ہے بلکہ اس دعا کی نوعیت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے لطف و کرم اور اُن کے ساتھ اپنی رحمت کے پیش نظر کسی رسول کو بھیجتا ہے، تو اس ضمن میں بندوں کی ان دو حالتوں میں سے ایک حالت ضرور ہوتی ہے۔ یا تو • اُس نبی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور یہ اطاعت اُن کے حق میں اللہ تعالیٰ کی برکتوں کے فیضان کا باعث بنتی ہے۔ اور یا وہ اُس نبی کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا اُن پر جو لطف و کرم ہوتا ہے، وہ ناراضگی اور غضب میں بدل جاتا ہے۔ الغرض بندے نبی کی اطاعت کریں یا اُس کی نافرمانی، ہر حال ان دو حالتوں میں سے کوئی بھی حالت ہو، نبی کو اس سلسلہ میں الہام ہوتا ہے۔ اور اس الہام کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اُس کے دل میں یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ وہ اُن بندوں کے لئے دعا کرے یا اُن کے لئے بد دعا کرے، اور جس کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ دعا اللہ تعالیٰ کے اُس لطف و کرم کا انتخاب ہوتی ہے جو باعث بنائے بندوں کی طرف اُس کے رسول بھیجنے کا۔

اب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ میں نے اپنی اس ایک دعا کو قیامت کے لئے باقی رہنے دیا ہے + اور وہ میں اپنی رحمت کی شفاعت کے لئے مانگوں گا۔ اُس کی صورت یہ ہے کہ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جان لیا تھا کہ آپ کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کے پیش نظر صرف یہ نہیں کہ فقط اس دنیا ہی میں بندوں پر اللہ تعالیٰ

کا لطف و کرم عام ہو۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ بھی تھا کہ آپ حشر کے دن بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی عام رحمت کا سبب بنیں۔ چنانچہ ہم اس سے پہلے اس کتاب میں ذکر کر آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے لئے قیامت کے دن شہید یعنی شہادت دینے والے ہوں گے۔ اور تمام انسانوں کے لئے اس طرح شہادت دینا آپ کی خصوصیات میں سے ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات ڈالی گئی کہ وہ دعا جو ہر نبی کی طرح آپ کو بھی عطا ہوئی تھی۔ اور یہ دعا جیسا کہ ہم ابھی بیان کر آئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس لطف و کرم کا منظر تھی، جس کا دنیا میں نبوت کی شکل میں ظہور ہوتا ہے۔ آپ اس دعا کو قیامت کے لئے رہتے ہیں۔

الغرض یہ ایک راز ہے جس میں ہمیں خوب تدبیر کرنا چاہئے +

اکتالیسواں مشاہدہ

اس مشاہدہ میں یہ تحقیقات بھی شامل ہیں — میرے دل میں تخلیق و ایجاد کے علوم کا بالعموم اور عالم خیال میں جو تخلیق ہوتی ہے، اُس کے علوم کا بالخصوص فیضان ہوا۔ اور نیز اس علم کا فیضان ہوا کہ دو متناقض چیزوں اور دو ضدوں کا اجتماع فی نفس الامر ممکن ہے۔ اور اس اجتماع کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ان دو متناقض چیزوں میں سے ایک چیز ایک مقام میں ہو۔ اور دہاں اُس کے متعلق پورے جزم سے یہ بات طے ہو کہ یہ چیز ایسے ایسے ہے۔ اور اسی طرح دوسری چیز دوسرے مقام میں ہو، اور دہاں اس کے بارے میں پورے جزم سے یہ طے ہو کہ یہ چیز ایسی نہیں ہے۔ الغرض میرے دل پر ان علوم کا فیضان ہوا۔ چنانچہ ان علوم میں سے جن کا بیان کرنا ممکن ہے، ہم بیان تمنا سے لئے اُن کو

بیان کرتے ہیں *

تخلیق عبارت ہے مختلف اجزاء کو جمع کرنے اور ان جمع شدہ اجزاء کے لئے جو صورت مناسب ہو، اُن پر اس صورت کے فیضان کرنے سے، تاکہ ان اجزاء کے لئے اور اُن پر اس صورت کے واقعہ ہونے سے ایک چیز وجود میں آجائے۔ تخلیق کسی عناصر یعنی ہوا، پانی، آگ اور مٹی سے ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ان عناصر کے اجزاء کا اجتماع ہوتا ہے۔ اور پھر اُن پر وہ صورت جو کینیات، کمیات اور دوسرے اعراض کے اعتبار سے اُن جمع شدہ عناصر کی عنصری صورت کے مناسب ہوتی ہے، نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طرح تخلیق کا یہ عمل کبھی انسان کی صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی گھوڑے کی اور کبھی کسی اور چیز کی، یہ تخلیق تو عناصر میں ہوتی ہے۔ اور بعض دفعہ یہ تخلیق خیالی صورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ دماغ میں ادھر ادھر کے جو پراگندہ خیالات تھتے، وہ جمع ہو گئے۔ اور اس کے بعد جب خارج سے دماغ میں کچھ واقعی صورتیں آئیں تو اس صحن میں یہ خیالات ایک مرکز پر مجتمع ہو گئے۔ اور ان پر ایک صورت کا فیضان ہوا جو ان خیالی صورتوں سے ایک اعتبار سے بلحاظ تجربہ کے، اور ایک اعتبار سے بلحاظ مادے کے ساتھ ملوث ہونے کے، مناسب اور موزوں تھی *

اس سلسلہ میں اس بات کا بھی خیال رہے کہ کسی محل میں کوئی تخلیق ہو اس میں ایسا نہیں ہوتا کہ اس محل سے خارج کی کوئی چیز اس میں داخل ہو جائے۔ ایسا ہوتا محالات میں سے ہے۔ اور عقل کبھی اس کو تسلیم نہیں کرتی۔

ہاں اس ضمن میں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ سلسلہ تخلیق میں نشو و ظہور کا ایک محل سبب بنتا ہے نشو و ظہور کے دوسرے محل کا۔ اور ایک محل ظہور میں ایک چیز جو موجود ہوتی ہے، وہ سبب بنتی ہے دوسرے محل میں اس چیز کے ظہور کا۔ اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں طبیعت کلیہ کے اندر ایک نظم سے موجود ہیں۔ اور نیز نشو و ظہور کے یہ جو تمام منازل اور مقامات ہیں، ان سب میں طبیعت کلیہ ایک ہی طرح جاری و ساری ہے۔ جب یہ بات واضح ہو گئی تو تمہیں چاہئے کہ اپنی نظر کو ہر چیز سے ہٹا کر تخلیق خیالی کا جو عالم ہے، اُس کی طرف ملتفت کرو۔ کیونکہ تعمیر تخریب زندہ کرتا، مارنا، اور قربت کے ذرائع فراہم کرنا یہ سب کی سب چیزیں ہی تخلیق خیالی کے عالم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور یہی وہ عالم ہے جہاں ”اللہ“ کی ہر روز ایک نئی شان ہوتی ہے۔“

اس ضمن میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ارادۃ الہی اس امر کا متقاضی ہوگا کہ وہ اس عالم خیال میں ایک شخص کو پیدا کرے۔ چنانچہ اس تخلیق کیلئے وجہ تقرب بہم کی گئی۔ اور اس طرح اس شخص کے خیالی اجزاء جمع ہوئے۔ اور اس سلسلہ میں جو عجیب اسرار ہیں، اُن میں سے ایک بزرگی نسب کو وجود میں لانا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ایک آدمی میں بزرگی نسب کی قبیل کی پہلے کوئی چیز نہ تھی۔ اور بعد میں وہ آدمی اصلاً شریف النسب ہو گیا لیکن

۱۰ اشارہ سے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف مائل ہو کر ہونی شان۔

اس حالت میں یہ شخص ایک ہی وقت میں شریف النسب بھی ہوگا ، اور شریف النسب نہیں بھی۔ لیکن آخر یہ تضاد کیا ؟ بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ آدمی اصل میں شریف نہ ہو۔ لیکن اتفاق سے وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوا کہ اُس وقت فلک کی جو حرکات تھیں ، اور ستاروں کے آپس میں جو اتصالات تھے ، اُن کا تقاضہ یہ تھا کہ اس شخص میں شرافت نسب ہو۔ اور میرے خیال میں یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب زُحل کا آفتاب اور مشتری سے ایک لحاظ سے امتزاج ہو۔ اور اس امتزاج کی صورت یہ ہوتی ہے کہ زُحل کی حیثیت تو آئینے کی ہو۔ اور آفتاب اور مشتری کا نور اُس میں منعکس ہو رہا ہو ، چنانچہ ایسے وقت میں جو آدمی پیدا ہوتا ہے ، وہ ان ستاروں کے اس امتزاج کی وجہ سے نسب کی بزرگی اور شرافت کا حامل بن جاتا ہے۔ باقی ان امور کو تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

غرضیکہ اس پیدا ہونے والے شخص میں زُحل ، آفتاب اور مشتری کے اس طرح اتصال ہونے کا اثر ایک صورت کے طور پر اُس کے اندر آجاتا ہے بالکل اُسی طرح جس طرح بچے میں اُس کے والدین کے نقوش اور اُن کے خط وخال آجاتے ہیں۔ اب یہ جو مولود ہوتا ہے ، اُس کو ورثے میں بزرگی نسب نہیں ملتی ، بلکہ اس ضمن میں یہ ہوتا ہے کہ پہلے تو ملازمت میں یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس مولود کو شریف النسب بتایا جائے۔ اور اس کے بعد جیسے جیسے بچے کی تربیت ہوتی ہے ، اُسی طرح اس مولود کے شریف النسب بننے کی حقیقت بھی ملازمت میں نشوونما پاتی ہے۔ اور جب یہ حقیقت ملازمت

میں نشوونما پا چکی ہے تو وہاں سے الہامات کے ذریعے حقیقت ملا سافل میں نازل ہوتی ہے۔ اور ملا سافل وہ مقام ہے جہاں سے غیر کامل افراد میں جو قوی ہوتے ہیں، اُن کی ہمتیں صادر ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب یہ آدمی اپنی بھرپور جوانی کو پہنچتا ہے اور ستاروں کے اتصال کا وقت آتا ہے جو اس شخص کے لئے بزرگی نسب کے ظہور اور اُس کی عزت شان کا متقاضی ہوا تھا تو اُسی وقت یہ ستر جو ملا را علی میں نشوونما پا چکا تھا، ملا سافل سے اس دنیا میں نازل ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس جو کچھ محفوظ تھا، اُس میں سے یا کتابوں میں سے کوئی ایسی بات ظاہر ہو جاتی ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ شخص شریف النسب ہے۔ خواہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس معاملہ میں دراصل ہوتا یہ ہے کہ اس شخص کے نسب کے متعلق کوئی ایسی بات مشہور ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور اُن کا اس امر پر اجتماع ہو جاتا ہے کہ وہ اس شخص کو شریف النسب مانیں اور اُس کی عزت و تعظیم کریں *

اب اگر یہ آدمی اہل صلاح و تقویٰ میں سے ہے تو بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ وہ خواب میں اپنے آپ کو شریف النسب دیکھتا ہے۔ اور اس سے اُس کو اطمینان ہو جاتا ہے۔ اب اگر کوئی ایسا شخص ہے جو اس آدمی کے متعلق کوئی پہلے کی بات یاد رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ شریف النسب نہیں تو اُس شخص کی بات کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اور ملا سافل کی طرف سے بھی

اور یہ بات ملاو سافل میں بھی لکھ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو کہے کہ یہ شخص شریف النسب ہے، اُس کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اور اُس کی اس بات کا اس طرح انکار کر دیا جاتا ہے گویا کہ اُس نے کسی غیر شریف کو شریف کہہ دیا۔

ہم نے اوپر یہ جو کہا تھا کہ ایک ہی آدمی ایک لحاظ سے شریف النسب ہوتا ہے، اور دوسرے لحاظ سے غیر شریف النسب، تو ہمارا یہ کہنا اجتماع نقیضین کی قبیل سے نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شخص کا ایسا ہونا حقیقت میں وجہ تناقض نہیں ہے۔ کیونکہ اس معاملے میں دو اعتبارات ہوتے ہیں، چنانچہ ایک اعتبار سے یہی شخص غیر شریف ہوتا ہے۔ اب اگر اس معاملہ کو جملہ اعتبارات سے دیکھا جائے تو اس شخص کے پاس سے یہ جو دو بیان ہیں، ان میں پوری مطابقت ہوگی اور تناقض باقی نہیں رہے گا۔ اس ضمن میں ایک ظالم خلیفہ کی خلافت کی مثال لیجئے۔ اس کی خلافت کو ایک اعتبار سے دیکھتے تو وہ صحیح ہوگی اور دوسرے اعتبار سے دیکھتے تو صحیح نہیں ہوگی۔ اور اسی سلسلہ میں قیامت کے قرب میں زمانے کی مدت کا مختصر ہونا بھی ہے، یعنی اُس وقت سال چھیننے کے برابر ہو جائے گا اور مہینہ ہفتے کے برابر اور ہفتہ ایک دن کے برابر۔ اور وہ اس طرح کہ فنا و عدم کی صورت جو ملاو علی میں انعقاد پائے ہوئے ہے وہاں سے اُس کے ایک رنگ کا اس عالم ناسوت میں فیضان ہوگا۔ اور اُس کی وجہ سے لوگوں کو یوں خیال پڑے گا کہ زمانے میں وسعت ہے، حالانکہ وہاں وسعت

نہیں ہوگی۔ اور وقت کو جانچنے کے جو معیار ہونگے اُن میں خلل واقع ہو جائیگا۔
 چنانچہ حالت یہ ہوگی کہ انسان پہلے ایک دن میں جو کام کر سکتا تھا، وہ اب
 اُس کام کو ایک دن میں نہیں کر سکے گا۔ اور اس تبدیلی کا باعث فنا و عدم کی
 اُس صورت کی تاثیر ہوگی جو ملاء اعلیٰ میں قائم ہے۔ اور وہاں سے اُس کا
 فیضانِ عالمِ ناسوت میں ہوتا ہے۔ ملاء اعلیٰ کی اس صورت کی تاثیر کو یوں
 سمجھئے کہ دو دیواریں ہیں۔ اور اُن کے اوپر ایک تختہ رکھا ہوا ہے، اور ایک
 آدمی اُس پر سے گزرنا چاہتا ہے۔ اب اُس آدمی کی وہی قوت اُس پر
 اپنا اثر ڈالتی ہے۔ چنانچہ اس تختے پر گزرتے ہوئے اُس کے پاؤں پھسل
 جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہی تختہ زمین پر پڑا ہوتا تو یہ آدمی بغیر کسی خیال کے
 اُس پر سے اطمینان کے ساتھ گزر جاتا۔ یعنی اُس آدمی کا یہ وہم کہ وہ ایک
 ایسے تختے پر سے گزر رہا ہے جو خلا میں ہے اور وہ دیواروں پر پڑا ہوا ہے،
 یہ وہم اُس پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ چنانچہ اُس کے پاؤں اس تختے سے
 پھسل جاتے ہیں۔ الغرض ملاء اعلیٰ میں فنا و عدم کی جو صورت ہے،
 عالمِ ناسوت میں اُس کے فیضان کی تاثیر انسان کی اس قوت وہمی کی
 تاثیر کی طرح ہوتی ہے۔ اجتماعِ نقیضین کی اور بھی ہر سی صورتیں
 ہیں۔ لیکن اس وقت ہم اُن پر گفتگو نہیں کرتے۔ باقی اللہ تعالیٰ اِن
 امور کو بہتر جانتا ہے۔

بیابانی سوال مشاہدہ

مجھ پر مبدائے حیات اور اُس کے معاد کے اسرار کھولے گئے۔ معاد کے اسرار میں سے ایک ستر دوزخیوں کو گندھک کے کڑتے اور اہل جنت کو ریشم و حریر اور دوسرے لباس ہائے فاخرہ پہنانے کے متعلق تھا۔ اور اسی طرح کا ایک ستر دوزخ والوں کے چہروں کے سیاہ ہونے اور اہل جنت کے چہروں کی بشاشت و تازگی، اور اس سے ملتی جلتی جو اور چیزیں ہیں۔ اُن کے بارے میں تھا۔ اس ستر کی وضاحت موقوف ہے دو مقدموں پر۔ ان میں سے پہلا مقدمہ یہ ہے کہ انسان کے نفس اور اُس کے بدن کے درمیان ایک گہرا ربط ہوتا ہے۔ اور نفس سے یہاں مراد وہ چیز ہے جو انسان میں احساس اور حرکت کا باعث بنتی ہے اور اُس کے خارج ہونے سے انسان مرجاتا ہے۔ نفس اور بدن کا یہ گہرا ربط

اُن افرادِ انسانی میں خاص طور پر نمایاں ہوتا ہے، جن کی عقل و فہم اس بات کو آسانی سے سمجھ جاتی ہے کہ روح بدن ہی کا ایک وصف ہے، اور زندگی عبارت ہے اس روح سے۔ اور یہ روح بدن میں اس طرح سرایت کئے ہوئی ہے جیسے کہ کوئلے میں آگ ہو۔ روح اور بدن کے آپس کے اس گہرے ربط کا نتیجہ ہے کہ انسان خواب میں اپنے نفس کے اوصاف کو جو غیر مادی ہوتے ہیں، مادی صورت میں متشکل دیکھتا ہے *

اس سلسلہ کا دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک معنوی حقیقت عالمِ ناسوت میں ایک چیز کی صورت میں متشکل ہو جاتی ہے اور اس معنوی حقیقت کا عالمِ ناسوت میں متشکل ہونا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کہ یہ عالمِ خیال میں صورت پذیر ہو جائے۔ اور اس کی مثال سیدنا داؤد علیہ السلام کا وہ واقعہ ہے کہ آپ نے ایک شخص کے ساتھ اُس کی بیوی کے معاملہ میں زیادتی کی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اس واقعہ کی معنوی حقیقت عالمِ ناسوت میں دو فرشتوں کی صورت میں متشکل ہوئی۔ اور دو بکریوں کا جھگڑا لے کر حضرت داؤد کے پاس آئے۔ اور اس سے حضرت داؤد کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا *

یہ مقدمے بطور تمہید کے بیان ہو چکے۔ اب ہم اصل بحث پر آتے ہیں، دوزخیوں کے جہنم میں گندھک کے کپڑے پہننے اور وہاں اُن کے چہروں کے سیاہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ دنیا میں ان لوگوں نے کفر کیا۔ اور اس کفر کا رنگ اُن کے چہروں پر چڑھ گیا۔ اور اس کی وجہ سے

وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستوجب ہوئے۔ چنانچہ اُن کا دُنیا میں ہی کفر اُن کے لئے دوزخ میں گندھک کے کپڑوں اور چہروں کی سیاہی میں بدل جائے گا۔ اسی طرح جنت میں اہل جنت کا ریشم و حریر کے لباسوں میں ملبوس ہونے اور اُن کے چہروں پر بشاشت و تازگی چھا جانے کا باعث یہ ہے کہ یہ لوگ دُنیا میں ایمان لائے اور اُن کے ایمان کا رنگ اُن کے نفوس پر چڑھ گیا۔ اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عنایت کے اہل بنے۔ چنانچہ مرنے کے بعد اُن کے ایمان کا یہی رنگ جنت میں اُن کے لئے ریشم کے کپڑوں اور چہروں کی تروتازگی اور بشاشت میں بدل جائے گا۔ یاد ہے کہ یہ جو کچھ میں یہاں بیان کر رہا ہوں، اس کا مشاہدہ خود میں نے ایک روحانی خواب میں کیا ہے *

یہ تو موت کے بعد یعنی معاد کے اسرار کا ذکر ہوا۔ اب ابتدا سے حیات یعنی مباد کے اسرار کا بیان سنئے۔ میں نے اس پھیلے ہوئے وجود کو دو جہت سے ذات حق میں گم پایا۔ ذات حق میں اس کے گم ہونے کی ایک جہت تو یہ ہے کہ یہ وجود چونکہ خود ذات الہی سے برابر صادر ہو رہا ہے، اس لئے میں نے اسے ذات حق میں گم ہوتے ہوئے پایا۔ اور ذات حق میں اس کے گم ہونے کی دوسری جہت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی اس وجود میں ظاہر ہوئی۔ اور اس لئے ہر طرف سے اس وجود کو اپنے اندر لے لیا۔ چنانچہ اس طرح یہ وجود ذات حق میں گم ہوتا ہوا نظر آیا۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ وجود منسلک خود ذات حق سے ہے، ظاہر ہے

یہ اس کی فریب زدگی ہے۔ لیکن جو شخص کہ باریک میں نظر رکھتا ہے، وہ تو یقینی طور پر اس معاملہ میں اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ذات واجب شیون الہی کا صدور ہوا جو کہ مبدائے اول میں تھیں۔ اور ان سے اس وجود منبسط کا ظہور ہوا۔ اور یہی وجود منبسط "فعلیت" اور "خارج" ہے۔ اس کے بعد اسی "خارج" میں اللہ تعالیٰ کی ایک "شان" کے بعد دوسری "شان" ایک مقدر شدہ ترتیب کے مطابق جو مبدائے اول میں پہلے سے محفوظ ہو چکی تھی، ظاہر ہوتی گئی۔

۱۔ ذات واجب کا گنہ پانا تو انسانی عقل کے بس کی چیز نہیں۔ لیکن چونکہ ذات واجب لا تعداد اسماء و صفات کی مرکز ہے، اس لئے ہم ان کے متعلق اپنی عقلیں لڑا سکتے ہیں۔ یہ اسماء و صفات ذات واجب کے اعتبارات ہیں۔ اور ان سب کا ایک ہی ذات سے صدور ہو رہا ہے۔ اور وہ ذات اپنی جگہ جوں کی توں قائم ہے۔ ذات واجب کے اسماء و صفات کا ایک نام شیون ہے جس کی واحد شان ہے۔

تینتا لیسواں مشاہدہ

اولیاء اللہ سے کرامات کس طرح ظاہر ہوتی ہیں، اس بارے میں مجھ پر عجیب عجیب اسرار کا فیضان ہوا ہے۔ کرامات کے متعلق تمہیں جاننا چاہئے کہ یہ نتیجہ ہوتی ہیں انسان کی اُس قوت کا جو نفسِ ناطقہ میں ہے۔ چنانچہ جب انسان کے نفسِ ناطقہ کا ملازما اعلیٰ سے اتصال ہوتا ہے۔ اور اُس کی ہمت شخصِ اکبر کی قوتِ عزم سے ملحق ہو جاتی ہے تو اُس کے نفسِ ناطقہ کی یہ ہمت شخصِ اکبر کی قوتِ عزم کے لئے بمنزلہ اُس کی رہنمندی اور پسندیدگی کے بن جاتی ہے۔ اور اس طرح جو بات ہونے والی ہوتی ہے، وہ اولیاء کے لئے ایک حتمی عزم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اس معاملہ میں دو حدیں ہوتی ہیں۔ ایک حد شخصِ اکبر کی قوت

عزم کے اونے اُتے استحسان اور خفیف سے الفاٹے خیال سے متصل ہوتی ہے۔ اور دوسری حد وہ ہے جس میں نفس ناطقہ کی ہمت قوی خود نفس ناطقہ کی اصل جڑ سے ابھرتی ہے۔ اور وہ نفس کے اوپر اس طرح حاوی ہو جاتی ہے کہ اکثر اوقات نفس کا اس ہمت سے برابر اتصال رہتا ہے۔ الغرض یہ دو حدیں ہیں اور ان کے درمیان بہت سے مدارج ہیں۔ اور نیز اس سلسلہ میں مختلف اوقات، احوال اور اسباب کی بھی اپنی اپنی خصوصیتیں ہوتی ہیں +

اس کے علاوہ خود اولیاء کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ اولیاء ہیں کہ اُن کے نفس ناطقہ کی ہمت اُن کے سامنے متشل ہوتی ہے۔ اور اُن سے جو بھی آثار و کرامات ظاہر ہوتے ہیں وہ ان کو خود اپنی اس ہمت سے صادر ہوتے دیکھتے ہیں۔ اور ان اولیاء کی دوسری قسم وہ ہے۔ جن کی ہمت اُن کے سامنے متشل نہیں ہوتی بلکہ یہ خاطر میں یا خیال میں یا لفظ میں سما جاتی ہے۔ اور اس طرح اُن کے لئے اپنے نفس ناطقہ کی یہ ہمت قابل توجہ نہیں رہتی۔ اور اس وجہ سے اُن کو اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اُس تدبیر کی طرف جو اس عالم میں برسرِ کار ہے اور اس کی اُس رحمت کی جانب جس کا یہاں فیضان ہو رہا ہے متوجہ ہو سکیں۔ چنانچہ اُن کی اس توجہ سے آثار و کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ ان اولیاء کی پہلی قسم یعنی جن کی کہ ہمت اُن کے سامنے متشل ہوتی ہے وہ زیادہ تر ہندوستان، خراسان اور اُن کے پڑوسی ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔

ہیں۔ اور دوسری قسم کے اولیاء یعنی جن کی ہمت اُن کے سامنے متمثل نہیں ہوتی، وہ حجاز، یمن اور اُن کے قرب و جوار کے ملکوں میں ملتے ہیں۔ مزید برآں اولیاء کے اپنے اوقات ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض دفعہ اُن پر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ اُس وقت وہ جس مقصد کے حصول کے لئے خاص ارادہ کر لیں وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس ارادہ میں خود اُن کے اپنے دل کا یہ خیال مزاحم نہ ہو کہ یہ چیز بعید از قیاس ہے یا یہ اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ بات یہ ہے کہ جب دل میں یہ خیال آگیا کہ یہ چیز بعید از قیاس اور اللہ کی سنت کے خلاف ہے تو لازمی طور پر اس سے ارادہ میں تذبذب پیدا ہو جائے گا، بالکل ایسے ہی جیسے کہ حیا اور ندامت کے وقت آدمی خود بخود کام سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ حدیث میں آئی ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو رافعؓ صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بکری کے دو بازو پیش کئے۔ آپؐ نے اُن سے تیسری بار ایک اور بازو طلب فرمایا۔ تو حضرت ابو رافعؓ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! بکری کے تو دو ہی بازو ہوتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم خاموش رہتے، اور یہ بات نہ کہتے تو ہمیں ایک اور بازو بھی مل جاتا، بلکہ جب تک تم خاموش رہتے، اور ہم تم سے بازو کا مطالبہ کرتے جاتے تو اسی بکری سے ایک بازو کے بعد دوسرا بازو برابر ملتا جاتا۔ اس حدیث میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے +

میز اولیاء کے اوقات میں سے ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ اُس وقت

جو ارادہ کر لیں۔ اور اگر اُس ارادے کی مخالفت ہو، یا اُسے دُور کی چیز سمجھا جائے یا لوگ اُس کا انکار کریں تو اس سے اُن کے اس ارادے میں اُتار دینا قوت پیدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ تم دیکھتے ہو کہ ایک دوسرے بازی لے جاتے یا بہادروں میں نبرد آزمائی کرنے یا حریفوں میں مقابلے کے موقع پر ارادے میں مزید قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں دلی رجحان اور باطنی تقاضوں کے اعتبار سے بھی اولیاء کے دو طبقے ہیں۔ ان میں سے ایک طبقہ تو وہ ہے، جس کے دل میں جو ارادے اور رجحانات اُٹھتے ہیں وہ نتیجہ ہوتے ہیں اُس الہام کا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے دل میں کیا جاتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دُنیا میں نظام خیر کو قائم کرنے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا جو ارادہ ہوتا ہے، اس ضمن میں اس طبقے کے اولیاء کی ہمتوں میں دلوں سے اور حوصلے پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔ اب یہ بات کسی ایسے وقتی حادثے کے متعلق ہوتی ہے کہ اُس حادثے کے اسباب معین ہوتے ہیں۔ جیسے کہ قرآن مجید میں حضرت خضر کا قصہ ہے کہ اُنہوں نے ایک کشتی میں سوارِ رخ کر دیا۔ ایک گرنے والی دیوار کو نئے سرے سے بنو دیا، اور ایک لڑکے کو جان سے مار ڈالا۔ یا اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ کسی واقعہ کے متعلق ہوتا ہے جس کا کہ اثر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہتا ہے، جیسے کہ ایک گمراہ اور بے بصیرت قوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کے ذریعہ راہِ راست پر لانے کا ارادہ تھا۔ اب چونکہ یہ ارادہ ایک استمراری حیثیت رکھتا تھا، اس لئے اس ارادہ کا کوئی نہ کوئی سلسلہ برابر قائم رہا۔

کے قلب مقدس سے متصل رہا۔ اس لئے یہ ارادہ ایک فوری حادثے کے ظہور کا سبب بن کر ختم نہیں ہو گیا، بلکہ جیسا جیسا وقت اور جیسا جیسا موقع ہوتا۔ اسی کے مطابق خاص خاص کام اور جزوی اور تفصیلی اطوار و اوضاع ظاہر ہوتے رہے۔ یہ خصوصیت اولیاء کے اعلیٰ طبقے کی ہے جو کمال مطلق کا حامل ہوتا ہے۔ ان اولیاء کے ہاں کرامات، اشراف یعنی لوگوں کے دلی خیالات پر مطلع ہونا، دعا کی قبولیت، کھانے یا پانی کی مقدار کو زیادہ کر دینا یا جیسے جیسے کہ حالات اور اسباب ہوں، انہیں کے مطابق شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ *

الغرض لوگوں کو راہِ راست پر لانے کا ارادہ جس طرح استمراری طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب سے متصل ہے، اسی پر آپ کے سرچشمہ علم کو بھی قیاس کر لو۔ بات دراصل یہ ہے کہ ملائکہ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ کے قانون اور نوامیس کا ایک نمونہ قائم ہے۔ جب اہل زمین کے لئے خیر و فلاح کے ارادے کو حرکت ہوئی تو ملائکہ اعلیٰ کے اس نمونے سے علم کا سرچشمہ چھوٹا۔ اور یہ مستقل طور پر آپ کے قلب مقدس سے متصل ہو گیا۔ لیکن جیسے جیسے اوقات، مواقع اور نفسی کیفیات ہوتی ہیں، انہیں کے مطابق یہ علم مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو اس ضمن میں دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے۔ اور کبھی علم کا یہ فیضان فرشتے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور بعض دفعہ خواب میں برکت کا نزول ہوتا نظر آتا ہے اور کبھی اس کی حد محض خواب تک رہ جاتی ہے۔ *

بیشک اولیائے میں سے ایک طبقہ ایسا بھی ہے کہ ان کی کرامات کا باعث
 ملازمت کا یہ فیضان نہیں ہوتا بلکہ ملازمت سافل کی طرف سے ان کو یہ چیز حاصل
 ہوتی ہے۔ بیشک یہ مقام کاملین کا نہیں، ہاں یہ اوریات ہے کہ ایک کامل میں
 جامعیت ہو۔ اور اس کی وجہ سے ملازمت علی کے اس فیضان کے ساتھ ساتھ اس کے اندر
 ملازمت سافل کے تقاضوں کا بھی عمل دخل ہو چنانچہ صوفیائے اس مشہور قول میں کہ
 "عارف کی اپنی کوئی ہمت نہیں ہوتی۔" اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ الغرض
 جب کوئی ولی اپنی قوت عزم میں اس منزل پر پہنچ جاتا ہے تو شخص اکبر
 کی طرف سے اس کے سویدائے قلب کو خلعت قطبیت سے سرفراز کیا جاتا
 ہے اور یہ شخص لوگوں کے لئے ملجا و ماویٰ اور ان کے بکھرے ہوؤں کو سمیٹنے والا
 بن جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ ان اوصاف کا حامل ایک
 وقت میں صرف ایک فرد ہی ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس منزل کمال تک دو
 تین یا اس سے زیادہ بھی پہنچ جائیں۔ لیکن ہر شخص جو اس بارگاہ کمال تک
 پہنچتا ہے، وہ اس مقام پر اپنے رب کو یوں دیکھتا ہے جیسے کہ وہ یہاں
 اکیلا ہی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ افراد انسانی میں سے ایک
 فرد ہوتا ہے۔ اور جہاں تک خود اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے، وہ اپنے
 آپ کو بلا مزاحمت غیر سے اکیلا اور شن تہتا سمجھتا ہے۔ خواہ ہزاروں اس
 جیسے اور بھی موجود ہوں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس
 کمال کا جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے، صرف ایک ہی کامل حاصل ہو سکتا

ہمارا موضوع بحث نہیں یا وہ اس شخص میں راہ راست سے مٹ گیا ہو، اور اُس نے ہمارے اس بیان کو اس کے سوا کسی اور محل پر حمل کر دیا ہو۔ الغرض میں اللہ تعالیٰ کے اخبانات کا تناخواں ہوں کہ اُس نے مجھے ان سب مقامات کمال کی شراب معرفت کے جن کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، چھلکے ہوئے جام پلائے +

چوالیسواں مشاہدہ

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں "قائم الزماں" ہوں۔ قائم الزماں سے میری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس دنیا میں نظام خیر کو قائم کرنے کا ارادہ فرمایا تو اُس نے اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لئے مجھے بطور ایک ذریعہ کار کے مقرر کیا۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ کفار کا بادشاہ مسلمانوں کے شہر پر قابض ہو گیا اور اُس نے اُن کے مال و متاع لوٹ لئے۔ اور اُن کی اولاد کو اپنا غلام بنا لیا۔ اور اجمیر کے شہر میں کفر کے شعار اور رسوم کو بلند کیا، اور خدا کی پناہ، اُس نے دہاں سے اسلام کے شعار و رسوم کو مٹا دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کو زمین والوں پر غضب آیا۔ اور میں نے اللہ کے اس غضب کو ملاز علیٰ میں ایک مثالی صورت میں تمثیل دیکھا۔ غضب الہی کی اس مثالی صورت سے میرے اندر بھی غضب کا اثر مترشح ہو گیا۔ چنانچہ

میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ غصے سے بھرا ہوا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا
اُس وقت غصے میں آنا نتیجہ تھا اُس تاثیر کا جو طائر اعلیٰ کی مثالی صورت
سے مجھ میں آئی تھی نہ کہ میرے اس غصے کا باعث دُنیا کے اسباب میں
سے کوئی سبب ہوا۔ اسی دوران میں میں نے دیکھا کہ میں لوگوں کی ایک
بڑی بھیر میں ہوں، جس میں کہ رومی بھی ہیں، اُنیک بھی، اور عرب
بھی، ان میں سے بعض تو اونٹوں پر سوار ہیں اور بعض گھوڑوں پر، اور
بعض پیادل ہیں۔ اس بھیر کی مناسب ترین مثال اگر کوئی ہو سکتی ہے
تو وہ حج کے موقع پر میدان عرفات میں حاجیوں کے جمع ہونے کی ہے۔
میں نے دیکھا کہ یہ سب کے سب میرے غضب ناک ہونے کی وجہ سے
غصے میں بھرے ہوئے ہیں اور مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ اس وقت
اللہ کا کیا حکم ہے؟ میں نے اُن سے کہا کہ ہر نظام کو توڑنا۔ وہ کہنے
لگے کہ یہ کب تک؟ میں نے جواب دیا کہ جب تک تم یہ نہ دیکھ لو کہ میرا
غصہ فرو ہو گیا ہے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ آپس میں لڑنے لگے۔ اور انہوں
نے اونٹوں کے مونہوں پر دار کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ اُن میں سے
بہت سے تو وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اور اُن کے اونٹوں کے بھی سر ٹوٹے اور
ہوٹ ٹوٹے۔ پھر میں اُس شہر کی طرف بڑھا جو خراب کیا گیا تھا۔ اور اُس
کے رہنے والوں کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے چلے۔ اور
ہم نے بھی اُسی طرح ایک شہر کے بعد دوسرے شہر کو تباہ کیا، جیسے کہ کفار
نے کیا تھا۔ یہاں تک کہ ہم نے کفار کو قتل کر دیا۔

اور اُن سے اس شہر کو آزاد کرایا۔ اور کفار کے بادشاہ کو قید کر لیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی جمعیت میں کافروں کا بادشاہ، بادشاہِ اسلام کے ساتھ ساتھ جا رہا ہے۔ اسی اثنا میں بادشاہِ اسلام نے کفار کے بادشاہ کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ لوگوں نے اُسے پکڑا اور نیچے گرا کر اُسے چھری سے ذبح کر دیا۔ جب میں نے اُس کی رگوں سے خون کو خوب زور سے بہتے دیکھا تو میں پکار اُٹھا کہ اب رحمت نازل ہوئی ہے میں نے اُس وقت دیکھا کہ رحمت اور سکینت نے اُن سب مسلمانوں کو جو اس لڑائی میں شریک ہوئے، اپنے دامن میں لے لیا۔ اور اُن پر رحمت کا فیضان ہوا ہے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک شخص اُٹھا۔ اُس نے مجھ سے اُن مسلمانوں کے متعلق پوچھا جو باہم ایک دوسرے سے لڑے تھے۔ میں نے اس شخص کو جواب دینے میں توقف کیا۔ اور اس بارے میں کوئی واضح بات نہ کہی ۔

یہ خواب میں نے ذی قعدہ کی اکیسویں رات کو ۱۲۷۲ھ میں دیکھا۔

پیشانیہ سوال مشاہدہ

اس امر میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں کہ حقیقت الحقائق ایک وحدت ہے جس میں کہ کثرت کا گزر نہیں۔ اس وحدت کے لئے تنزلات ضروری ہیں تاکہ یہ تنزلات واسطہ بنیں اس وحدت سے کثرت کے ظہور کا۔ اور اس طرح وجود کے مراتب کے احکام اور ان کی خصوصیات کا تعین ہو سکے حقیقت الحقائق کی اپنی وحدت خالص سے تنزلات کی طرف اور تنزلات سے وجود کے مراتب کی طرف حرکت تدریجی ہوتی ہے۔ اور اس حرکت سے سوائے اس سے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ اس وحدت خالص کا جو ذاتی کمال ہے، اس کا ظہور ہو سکے۔ وحدت کی یہ حرکت جو وجود کی کثرت میں نتیجہ ہوتی ہے، اس کا باعث پاک اور مقدس محبت ہے۔ اور یہ پاک اور مقدس محبت وحدت کے اس "ارادہ اختیاری" سے جس کو بعض

لوگ اس حرکت کا سبب قرار دیتے ہیں، اعلیٰ اور برتر چیز ہے۔ اور اسی طرح یہ پاک اور مقدس محبت وحدت کی "ایجاب طبعی" کی صفت سے بھی جو بعض دوسروں کے نزدیک وحدت کی اس حرکت کا باعث ہے، برتر و اعلیٰ ہے۔ "ایجاب طبعی" سے مراد یہ ہے کہ خود اس وحدت کی طبیعت میں بطور ایک امر واجب کے یہ بات داخل ہے کہ وہ کثرت میں ظاہر ہو +

یہ محبت ابتدا میں بالکل بسیط ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں جیسے جیسے کثرت کا ظہور ہوتا ہے، اس محبت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مراتب وجود میں سے ہر مرتبہ کی اپنی اپنی مخصوص محبت ہوتی ہے۔ اور ہر مرتبے کی یہی مخصوص محبت ہی سبب بنتی ہے اس مرتبہ وجود کے ظہور کا۔ یعنی یہ محبت ابتدا میں بسیط ہوتی ہے۔ اور پھر وجود کی کثرت کے ساتھ ساتھ اس سے بہت سی محبتیں ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں یاد رہے کہ گو یہ محبت ابتدائے امر میں بسیط ہوتی ہے۔ اور بعد میں اس سے بہت سی محبتیں ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن یہ محبت اس بسیط ہونے کی حالت میں بھی ان تمام محبتوں سے جو بعد میں اس سے ظاہر ہوتی ہیں، عالی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ تمام محبتیں اس بسیط محبت میں جو ابتدائے امر میں تھی، داخل ہوتی ہیں۔ اور بعد میں مراتب وجود کے ساتھ ساتھ ان کا ظہور ہوتا ہے۔ وحدت سے مراتب وجود کا اس طرح صادر ہونا۔ اور پھر وجود کے ہر مرتبہ کی اپنی مخصوص محبت اور ان مخصوص محبتوں کا ایک بسیط محبت

سے ظاہر ہوتا، یہ ایسے اصول ہیں کہ جن شخص کو ذرا سی بھی سمجھ ہو، وہ ان میں شک نہیں کرے گا۔

اس ضمن میں ہمارا اور بھی مشاہدہ ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بسیط محبت کے اندر ان جزوی محبتوں کے تمام کے تمام مراتب کا مندرج ہونا ایک طرح پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان جزوی محبتوں میں سے ایک خاص محبت ظاہر واضح اور موجود بالفعل کے درجہ کی ہوتی ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک جزوی محبت اور ہے، جو بسیط محبت میں اس طرح موجود ہوتی ہے جیسے کوئی چیز کسی دوسری چیز میں بالقوة موجود ہو۔ خواہ اس کا اس چیز میں بالقوة ہوتا قریبی ہو یا دور کا معاملہ ہو۔ اس ظاہر واضح محبت میں سے ایک محبت وہ ہے جس کا تعلق اولاً تو منظر کلی کے ظہور سے ہے اور پھر ذات سے۔ وجود کلی سے آگے چل کر جو افراد نکلتے ہیں یہاں ان افراد کا ذکر نہیں۔ البتہ بعد میں جب وجود کلی سے افراد کے ظاہر ہونے کا وقت آتا ہے تو پھر ان افراد کے ظہور سے متعلق جو جزوی محبتیں ہوتی ہیں، وہ بیشک ظاہر ہو جاتی ہیں۔

الغرض ایک محبت تو یہ ہوتی جس کا تعلق وجود کلی کے ظہور سے ہے۔ اور دوسری محبت وہ ہے جو وجود کلی سے فرد کے ظہور سے متعلق ہوتی ہے۔ اب ایک فرد تو وہ ہے جس کی شبیہ عالم مثال میں قائم ہے۔ اور ایک فرد وہ ہے جو اس عالم میں پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ عالم ناسوت کے بہت سے افراد پر اس فرد کا علی سبیل البذل مصداق ہوتا ہے۔ اور وہ اس طرح

کہ ایک مرکز ہے جس میں کہ ایک شخص کا وجود قائم ہے۔ اب وہ شخص نہیں رہتا، تو اُس کی جگہ دوسرا شخص لے لیتا ہے۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔

یہ محبت جو ان معنوں میں فرد کے ظہور سے متعلق ہوتی ہے، اُس کا مقصد اولاً یا تو اُس تدبیر الہی کا ظہور ہے، جس تدبیر کا تعلق کلی وجود کے ظاہر ہونے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس محبت کا تعلق کلی وجود کے ظہور سے ہوا تو پھر جس وقت اس کلی وجود سے افراد اور اشخاص ظاہر ہوئے تو ان کے ظہور کے ساتھ ساتھ ان افراد کے متعلق جو محبتیں تھیں، وہ بھی اُس محبت سے ظاہر ہوئیں۔ یا اُس محبت کا مقصد جو ان معنوں میں فرد کے ظہور سے متعلق ہوتی ہے شخص تدبیر الہی کا ظہور ہے۔ یا اس سے مقصود صرف اُس نوع کے کمال کا اثبات ہے۔ الغرض ہم نے ان امور کا خود مشاہدہ کیا ہے۔ اور نیز اس ضمن میں ہمیں اس کا بھی مشاہدہ ہوا ہے کہ انسانیت کے ظہور کا جو اسان اصلی ہے وہ محض حیوانیت کے تابع نہیں بلکہ حیوانیت سے زائد انسانیت میں وہ محبت بھی ہے جو ذات واحد سے ابتدا میں ظاہر ہوئی تھی۔ اور اسی طرح حیوانیت کے ظہور کا جو اساس ہے، وہ بھی تمام تر نامویت یعنی نباتیت کے تابع نہیں ہے۔

ہم نے اس امر کا بھی مشاہدہ کیا ہے کہ وہ محبت جو فرد کے ظہور سے متعلق ہوتی ہے، جب اس محبت کے پیش نظر ایسا فرد ہوتا ہے جو کہ جامع ہو الہیات اور کونیات کے دونوں عالموں کا، اور نیز اگر اس فرد

سے مقصود کل عوالم کے ظہور کی تدبیر ہو، تو ایسا فرد نبی ہوتا ہے۔ اس فرد نبی سے مراد حقیقت نبوت ہے جو کہ عالم مثال میں اپنی مثالی صورت کے ساتھ قائم ہے۔ یہی فرد جس کا کہ اوپر ذکر ہوا، اصدالتہ نبی ہوتا ہے۔ عالم مثال میں اس فرد نبی کے اس طرح ظہور پذیر ہونے کے بعد یہ ہوا کہ اس کی اس مثالی صورت سے عالم ناسوت میں بھی ایک نمونہ وجود میں آیا۔ پھر ایک اور نمونہ ظاہر ہوا۔ اور یہ سلسلہ برابر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں آئے۔ اور ان کی ذات اقدس سے مرتبہ نبوت کے احکام مکمل ہو گئے۔ بہر حال اوپر کی یہ کیفیت اُس وقت ہوتی ہے، جب اس فرد کے کل عوالم کے ظہور کی تدبیر ہو، لیکن اگر یہ نہ ہو تو ایسا فرد نبی نہیں ہوتا۔

اب اگر محبت وہ ہے جو وجود کلی کے ظہور سے متعلق ہے۔ اور اس ضمن میں وجود کلی سے افراد کے ظہور کا وقت آتا ہے تو یہ محبت دوسری بار فرد کے ظہور سے متعلق ہو جاتی ہے۔ اب اگر اس فرد کے ظہور سے مقصود وجود کلی کے ظہور کی تدبیر ہے تو یہ فرد انبیاء میں سے ایک نبی تو ہوگا، لیکن وہ فرد جامع نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اُس فرد کے ظہور سے مقصود صرف ایسے کمالات کا اثبات ہے کہ ان کی وجہ سے الہی قوتیں کو نیاتی قوتوں پر غالب آجائیں تو یہ فرد ولی ہوگا۔ ایسا ولی جو "قنا و بقاء کے مقامات کا حامل ہو۔ ایسا اوقات نہ تو شروع میں اور نہ جب کہ نشاۃ کلیہ یا وجود کلی سے افراد ظاہر ہوتے ہیں، فرد کے ظہور سے محبت متعلق ہوتی ہے۔ بلکہ

عالم ناسوت میں افراد کے ظہور کے وقت فرد سے محبت کا تعلق ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس فرد سے ملت کی تدبیر مقصود ہو تو یہ فرد انبیاء کا وارث ہوگا۔ اور اگر یہ مقصود نہیں تو وہ فرد ملائحے کا وارث ہوگا۔ اور اگر اس فرد سے مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ صرف راشد یعنی ہدایت خود ہدایت یافتہ ہو تو یہ اولیاء کا وارث ہوگا۔ یہ باتیں جو میں نے یہاں بیان کی ہیں، بڑی معرفت کی ہیں، تمہیں چاہئے کہ ان کو خوب مضبوط پکڑو +

اس کے بعد تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ فرد کے لئے ایسے احکام ہیں کہ فرد کے سوا اور کسی کے یہ احکام نہیں ہوتے، اور ان احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ فرد کا کہیں مستقر نہیں ہوتا۔ جب تک کہ نقطہ عبیہ جہاں سے کہ اُس نے اپنا سفر شروع کیا تھا وہاں واپس نہیں پہنچ جاتا۔ ہاں اس ضمن میں فرد کے لئے ہر مظهر اور نشاۃ ایک مستقر ضرور بن جاتا ہے۔ لیکن اس مستقر میں فرد کی رفتار تیر سے بھی جب کہ وہ کمان سے نکلتا ہے، زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اور اُس کی یہ رفتار اُس وقت تک رہتی ہے، جب تک کہ وہ اپنے آخری مقام تک نہ پہنچ جائے۔ فرد کو اپنے اس سفر میں جن جن نشاۃوں اور مظاہر سے گزرنا پڑتا ہے، ان نشاۃوں کی آلائش میں سے کوئی چیز بھی اُس کے دامن کو بلوث نہیں کرتی، جیسے کہ فرد کے علاوہ جو اور لوگ ہوتے تھے، اُن کو یہ آلائش بلوث کرتی ہے۔ البتہ اللہ کی حکمت میں یہ بات مفقود ہو چکی ہے کہ اس سلسلہ میں فرد کو جن نشاۃوں میں سے سفر کرتا پڑتا ہے، اُن میں سے ایک نشاۃ اُس نشاۃ سے جو اُس سے پہلے تھی، ضرور استفادہ کرے +

اس فرد کے احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ فرد کو "محبت ذاتی" محبت ذاتی عبارت ہے نقطہ حبیب سے جو اپنے علم، حال اور نشاۃ میں اُس مقام کی طرف لوٹتا ہے، جہاں سے کہ اُس کی حرکت کی ابتدا ہوئی تھی۔ باقی رہے فرد کے علاوہ اور لوگ، تو اُن کو یہ نعمت نصیب نہیں ہوتی۔ اور فرد کے ان احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ فرد کا ایک نشاۃ سے دوسری نشاۃ میں منتقل ہونے کا حقیقی سبب صرف محبت ذاتی ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فرد کا جب ایک نشاۃ کے مستقر میں ورود ہوتا ہے، تو اس حالت میں اُس کے لئے ضروری ہے کہ اُس خاص نشاۃ کے جو احکام ہیں، اُن کی طرف یہ کچھ ذرا التفات کرے۔ اور اس نشاۃ کی جو آخری بلند ہے، اُس سے فرد کا اتصال ہو۔ اور اس پر وہ پوری طرح قابو پائے۔ چنانچہ اس مقام پر فرد سے وہ وہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں، جو فرد کے سوا دوسرے سے ظاہر نہیں ہوتی۔ الغرض جب فرد اس نشاۃ کی آخری حد تک کو طے کرے تو اُس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس نشاۃ سے اس طرح نکال لے جیسے ایک بچہ ماں کے پیٹ سے نکل آتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو بطنِ مادر کی حالت یعنی "نشآۃ جنینہ" سے الگ کر لیتا ہے۔ اس ضمن میں فرد کی ایک نشاۃ سے باہر آنے کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ وقت آتا ہے کہ فرد ایک نشاۃ کی منزل کو ختم کر کے باہر نکلے تو وہ نقطہ حبیب جو اس کے اندر ہوتا ہے، وہ اپنے اصلی مقام شرف اور اپنی پہلی بسیط حالت کو یاد کرتا ہے۔ اور اُس کی طرف اس نقطہ حبیب کا

اشتقاق بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ اس نقطہ حبیبہ کا خود اپنے اصلی مقام اور
اپنی پہلی حالت کے لئے سرگشتہ و شیفہ ہونا محبت ذاتی ہے۔ اور اس
محبت ذاتی کی خصوصیت یہ ہے کہ جب فرد سے اُس نشاۃ کے علائق کٹ
جاتے ہیں۔ جس میں کہ وہ ہو۔ اور وہ مہر جاتا ہے اور اس کا نسہ اُس کے
کشیف ارضی جسم سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد جب وہ وقت آتا
ہے کہ اُس کے نسے سے اُس کی رُوح بھی الگ ہو تو پھر نقطہ حبیبہ کی محبت
و شیفگی اور اُس کی نشاۃ سے بے تعلقی واپس آ جاتی ہے۔ اور اسی طرح
جب رُوح کے الگ ہونے کا وقت قریب ہوتا ہے تو پھر نقطہ حبیبہ کی یہ
محبت و شیفگی اور نشاۃ سے اُس کی بے تعلقی اُس کی طرف لوٹی ہے۔ اور
یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ یہ نقطہ حبیبہ اپنے اصلی مقام طرف
سے جہاں کہ وہ پہلے بسیط حالت میں تھا، جا کر مل جاتا ہے۔

باقی رہا نقطہ حبیبہ کا بدن کے نشاۃ پر سواری کرنا، یعنی اُس پر
پوری طرح قابو پالینا، تو یہ چیز انبیاء میں تو بالکل ظاہر ہے۔ البتہ انبیاء
کے علاوہ جو اور لوگ ہیں، وہ انبیاء کی وراثت کے جو مناصب ہیں جیسے
کہ محدودیت اور قطبیت اور اُن کے آثار و احکام کا ظہور۔ یہ ان کے حامل
ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر علم اور ہر حال کی حقیقت تک پہنچنا، اور
ہر مقام کی اچھائیوں کو جمع کرنا، یہ چیزیں جبکہ خلقت پیدا ہوئی ہے،
اور نیز جب سے کہ ہر انسان میں رقائے یعنی لطافتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اور
ہر رقیقہ کے مناسب جو احکام میں اُن کا تعین ہوتا ہے۔ اور ہر رقیقہ کے

آثار فراوانی سے ظاہر ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود ایک حالت دوسری حالت میں خارج نہیں ہوتی، یہ چیزیں حاصل ہیں *

اب رہا نقطہ حبیہ کا نشاۃِ نسہ کی پیٹھ پر سواری کرنا، یعنی اُس پر قابو پانا، تو کبھی یہ چیز نسے کے اُن علوم کے لئے جو اپنے ابدان میں مقید ہیں، اُس تبدلیِ اعظم تک جس سے کہ طبیعت کلیہ بھری ہوئی ہے، پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے اور کبھی یہ خارج سے آنی والی صورتوں اور کون و مکان میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے فیضان کا واسطہ ہوتی ہے۔ اس بارے میں اگر تم مجھ سے اصل حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ فرد کا جو بھی حال، یا مقام یا منصب ہوتا ہے، وہ اُسی کے اندر جو رقیقہ ہے، اُس کے اور اُس کی تبدلی کے حال کے مطابق ہوتا ہے۔ اب چونکہ ہر فرد یہ ہے کہ فرد کا حال اور منصب تو تمام کے تمام عالم کو ڈھانپ سکتا ہے۔ اس لئے یہ احوال اور متاعِ صیب خود اُس کے اندر ہی ہوتے ہیں، جب یہ بات واضح ہو گئی تو تمہیں چاہیے کہ فرد سے جو اس طرح کی باتیں صادر ہوتی ہیں، جن میں اُس کی بڑی بڑی مہموں کے سر کرنے اور بلند مرتبہ منصب پر فائز ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، تم اُس کی ان باتوں کو ان مہموں پر محمول کرو۔ اور اگر تم سمجھ دار ہو تو جان لو کہ اس مسئلہ کا جو خلاصہ مطلب ہے اور اُس کی جو حقیقت ہے، وہ ہم پہلے ہی بیان کر آئے ہیں *

انسان میں دس ظاہر و نمایاں رقیقے ہیں۔ اور ان میں سے ہر رقیقہ کا اپنا خاص حکم اور اثر ہوتا ہے۔ اور اُس رقیقہ سے اُس کے مخصوص آثار کا

ظاہر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ چنانچہ ممکن نہیں کہ ایک شخص جس میں کوئی رقیقہ ہو، اور وہ چاہے کہ اُس رقیقے سے اُس کے مخصوص آثار ظاہر نہ ہوں، کیونکہ یہ رقیقہ پیدائش ہی سے اُس شخص کی اصل جبلت میں داخل ہوتا ہے۔ ان رقائق میں سے ایک رقیقہ قمریہ ہے اور وہ مقابل ہے ایسے اکتسابی علوم سے جیسے کہ علم حدیث ہے اور نیز یہ رقیقہ مقابل ہے ان طرائق تصوف کی برکات کے جو طرائق کہ مشائخ صوفیاء کی طرف منسوب ہیں۔ اور ایک رقیقہ عطاردیہ ہے جو تصنیف و تالیف جیسے اکتسابی علوم کے مقابل ہوتا ہے۔ اور اس رقیقے والے کی ہر علم میں جس پر کہ اُس کی نظر ہو، اپنی خاص رائے ہوتی ہے۔ خواہ وہ علم از قسم معقولات ہو، یا از قسم منقولات، اور انسان کے اندر ایک رقیقہ زہریہ ہے جو کہ جمال اور محبت کا رقیقہ ہے۔ اس رقیقے والا ہر ایک سے محبت کرتا ہے۔ اور ہر ایک اُس سے اس طرح محبت کرتا ہے کہ طرفین کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور ان میں سے ایک رقیقہ شمسیہ ہے، جو تمام پر غالب آنے کے مقابل۔ اور اس رقیقے والے کا یہ غلبہ معنایاً استحقاقاً اور حفظاً ہوتا ہے تاکہ اس کی وجہ سے اللہ کی ساری مخلوق ایک حکم کے تحت آجائے۔ اور انسان کے اندر ایک رقیقہ برنجیہ ہے جو ہر کمال کے اثبات، اُس کی مضبوطی اور اس کے راسخ ہونے کے مقابل ہوتا ہے۔ اگر یہ رقیقہ نہ ہوتا تو ہر چیز بزدلی اور بے بنیاد ہوتی۔ اور ایک رقیقہ مشتریہ ہے۔ اور یہ قطبیت، امامت اور ہدایت کا رقیقہ ہے۔ اور اس رقیقہ والا لوگوں کے لئے مرکز بنتا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ اپنے

رت کا قُرب حاصل کریں۔ اور ایک رقیقہ زُحلیہ ہے۔ اور یہ مقابل ہوتا ہے ہر رقیقہ کے بقاء، اُس کے اثبات اور ایک زمانہ دراز تک اُس کے اثر انداز ہونے کے۔ اور نیز سب سے مجرّد ہو کر طبعیت کلیہ تک پہنچنے کے۔ اور انسان کے اندر ایک رقیقہ ملاءِ اعلیٰ کا ہے جو اُس ہمت کے مقابل ہوتا ہے، جو ہر اُس چیز کو جس سے وہ ملحق ہوتی ہے، پوری طرح گھیر لیتی ہے۔ اور یہ رقیقہ اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت اور اُس کی حفاظت کی شجیع یعنی اُس کے لئے بطور ایک قالب کے بن جاتا ہے۔ اور ایک رقیقہ ملاءِ سافل کا ہے اور یہ اُس نور کے مقابل ہوتا ہے جو اُس رقیقے والے کے ہاتھوں، پیروں، اُس کی آنکھوں اور اُس کے سارے اعضاء میں داخل ہوتا ہے اور ایک رقیقہ اُس تدلی الہی کا ہوتا ہے جو بزرگانِ خدا کے لئے نازل ہوتی ہے۔ اس تدلی کے دو شعبے ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو نورِ نبوت کا شعبہ ہوتا ہے اور دوسرا ولایت کا +

ان سب رقائق کے بعد اس شخص کا نفس جبلی طور پر قدسی بن جاتا ہے۔ اور اُس کی ایک حالت دوسری حالت کے لئے مانع نہیں ہوتی۔ اور نیز جب وہ سب چیزوں سے تجرّد اختیار کر کے نقطہ کلیہ سے متصل ہو جاتا ہے۔ اور اس حالت میں نقطہ کلیہ کے احوال میں سے کوئی حال اُس پر وارد ہوتا ہے تو وہ فوراً اُس حال سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ بیشک اس احوال کی تفصیل بھی آئے گی اور اس نقطہ کی شرح بھی ہوگی +

مزید برآں اس فرد سے جو کرامات صادر ہوتی ہیں، اُن کا صادر ہونا فرد کے علاوہ دوسرے سے جو کرامات صادر ہوتی ہیں، اُن کی طرح نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں بات دراصل یہ ہے کہ دوسرے سے جو کرامات و خوارق ظاہر ہوتی ہیں، اُن کی نوعیت یہ ہے کہ ایک کیفیت اُس شخص پر غالب آئی اور اُس نے اُس کے وجود کے تمام حصوں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح وہ کیفیت اُس پر پوری طرح سے مسلط ہو گئی چنانچہ آثار و کرامات کے سلسلہ میں جو کچھ اُس سے صادر ہوتا ہے، اُس کا دار و مدار صرف اسی کیفیت پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس فرد کا یہ حال ہے کہ اُس کے وجود کا ایک ایک جزو اپنی اپنی جگہ مستقل ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ جیسے کہ تم ابھی جان چکے ہو۔ یہ ہے کہ فرد میں ایک تو وہ کلی اور اجمالی رقائق ہوتے ہیں جو افلاک کے نفوس اور اُن کی طبیعتوں سے آتے ہیں۔ اور نیز وہ رقائق جو عناصر سے آتے ہیں اور اسی طرح وہ رقائق بھی ہیں جو اُن مختلف اصناف کے کمالات سے آتے ہیں، جو خود اُسے حاصل ہوتے ہیں الغرض ان چیزوں کی وجہ سے فرد کے وجود کا ایک جزو اُس کے وجود کے دوسرے جزو پر مستقل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب اُس پر اُس کی ملکی قوت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ اُس کی بیہمی قوت اپنے تقاضہ عمل سے معزول ہو جائے اور اسی طرح جب اُس پر بیہمی قوت کا غلبہ ہو تو اس سے یہ نہیں ہوتا کہ اُس کی ملکی قوت اپنے اقتضا سے دستبردار ہو جائے۔ اور نہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب چیزوں سے بجز

اختیار کر کے کسی کمال کا اسی طرح سے ہو جائے کہ اس کمال میں اُس کے قنا ہونے کی وجہ سے اُس کے دوسرے کمال کا اثر محو ہو جاتے۔ مختصراً فرد میں ہر چیز اپنے انداز سے ہوتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی اُس سے کوئی خارقِ عادت واقعہ ظاہر ہوتا ہے تو نیچے کی ان دو جہوں میں سے اُسکی کوئی ایک وجہ ضرور ہوتی ہے۔ یا تو ذاتِ حق جو کہ سب کی مدبر ہے، اُس کا یہ ارادہ ہوا کہ وہ اپنے بندوں کو کوئی دُنیوی یا اُخروی نفع پہنچائے یا اُن سے کسی مصیبت کو دور کرے۔ یا یہ کہ اُس نے بندوں کے اعمال پر اُن کو عذاب دینے کا ارادہ کیا۔ اور ذاتِ حق کا یہ ارادہ اس فرد کے ہتھوں عمل میں آیا۔ اور اس ضمن میں جو خرقِ عادت واقعہ رونما ہوا وہ اس فرد کی طرف منسوب ہو گیا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں اس فرد کی اصل حیثیت ایسی ہوتی ہے، جیسے کوئی میت غسل دیئے والے کے ہاتھ میں ہو۔ یعنی اس معاملہ میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

اس ضمن میں فرد سے جو خارقِ عادت واقعہ ظاہر ہوتا ہے، اُسکی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سلسلہ میں جب فرد نے اپنی عقلِ حکمت اور فراست کی طرف رجوع کیا۔ اور اُس نے دیکھا کہ ایک چیز میں خود اُس کے لئے یا دوسروں کے لئے نفع ہے۔ تو اُس کے اندر جو رقائق تھے، اور جن کا کہ ذکر اوپر ہو چکا ہے، اُن میں سے ایک رقیقہ اُس چیز کے منافع جو امور ہوتے ہیں، اُن کی طرف بسط کرتا ہے۔ اور اس طرح لوگوں کے لئے ایک خارقِ عادت واقعہ ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور

پہر اس فرد نے جب اپنی عقل، حکمت اور فراست کی طرف رجوع کیا تو اُس نے سوچا کہ وہ واقعات جو بعد میں رونما ہونے والے ہیں، ان سے لوگوں کو آگاہ کرے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اُس کے اندر جو رقیقہ قریب مکتا، اُس میں بسط ہوا۔ اور اس سے اُس فرد نے ہونے والے واقعات کا علم حاصل کر لیا۔ اور اس علم کو اُس نے لوگوں تک پہنچا دیا۔ یا مثلاً اُس فرد نے ایک جماعت کو مسخر کرنے کا ارادہ کیا، تو اس سے اُس کے رقائق میں سے جو رقیقہ شمسیہ مکتا، اُس کے اندر بسط پیدا ہوا۔ اور اس کی وجہ سے اُس فرد نے جماعت کو مسخر کر لیا۔ الغرض یہ ہے دوسری وجہ فرد سے ظہور کرامات و خوارق کی *

علاوہ ازیں اس دنیا کی زندگی میں فرد کے خواص میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ اُس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے رب کی اپنے پورے اخلاق اور اپنی پوری طبائع کے ساتھ عبادت کرے۔ اس میں بات دراصل یہ ہے کہ انسان کی یہ عادت میں داخل ہے کہ جب اُس کے اندر کسی دنیوی نفع کے حصول یا دنیوی مصرت کو دور کرنے کی خواہش پیدا ہوئی ہے تو وہ اُس کے لئے شجاعت کے کام کرتا ہے۔ اب اگر یہ انسان "فرد" ہو، یعنی جس "فرد" کے کہ اوصاف اوپر گزر چکے ہیں، تو اُس کے لئے احکام حق میں سے ایک حکم طاء اعلیٰ میں متشکل ہوتا ہے۔ اور پھر اس حکم سے جو طاء اعلیٰ میں وجود پذیر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس فرد کے نفس میں ایک اثر مترشح ہوتا ہے۔ جس سے اُس فرد کے اندر ایک خواہش

پیدا ہوتی ہے اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے اُس کے اخلاق میں سے کوئی خلق پیش قدمی کرتا ہے چنانچہ اس طرح اس فرد سے اعمال و افعال رونما ہوتے ہیں۔ اس حالت میں فرد کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جہاں تک اُس کی اپنی خواہش اور مرضی کا تعلق ہوتا ہے ■ اس معاملہ میں مقام فتا میں ہوتا ہے۔ یعنی ■ اپنی ہر خواہش اور مرضی سے درگزر کرتا ہے۔ اور اس کی اپنی کوئی خواہش اور مرضی باقی نہیں رہتی۔ اور جہاں تک ذات حق کے ساتھ اُس کے تعلق کا معاملہ ہے، وہ مقام بقا میں ہوتا ہے، یعنی اگر اُس کا کوئی مقصد ہوتا ہے ■ اور اُس کے دل میں کوئی خواہش ہوتی ہے تو صرف ذات حق کی۔ الغرض یہ مطلب ہے۔ فرد کا اپنے تمام اخلاق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا۔ اخلاق کی طرح انسان کی اپنی طبائع بھی ہوتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر طبیعت کے لئے فنا و بقا کا مقام اور کمال ہے، جو اس ضمن میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انسان کے طبائع میں سے کوئی طبیعت ذات حق میں فنا ہو جاتی ہے تو اس طبیعت سے افعال و اعمال کا ظہور ہوتا ہے۔ اور فنا ■ بقا کے علاوہ جو دو سر کمال خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کی طبائع میں رکھا گیا ہے، جب یہ کمال انسان کی کسی طبیعت سے مرکب ہوتا ہے تو جس ستارے کا یہ کمال ہوتا ہے، اُسی کے مطابق اس طبیعت سے معنوی تجلیات کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر اس کے شمع میں زہرہ ستارہ کا اثر ہے۔ تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اُس کی ہر حس اس جال

سے لذت اندوز ہو، جو اللہ نے اپنی کسی چیز میں رکھا ہے۔ اور نیز وہ جمال سے اپنی اس لذت اندوزی ہی کو اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اُس کی بازگاہ میں اپنی نیازمندی سمجھے۔ چنانچہ اُس کی یہ ساری چیزیں اپنی ان جمالی لذت اندوزیوں کے ساتھ، اور وہ تمام حسین چیزیں جن کے جمال سے وہ لذت اندوز ہوتا ہے گویا یہ زبانیں ہو جائیں گی جو اللہ کا ذکر کر رہی ہیں۔ اور اس سے اُس شخص پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جائے گی، جس میں وہ مستغرق ہو جائے گا۔ اور ایک مدت تک وہ اپنی اس کیفیت کے نشہ میں مست رہے گا۔ یہ تو انسانوں پر زہر ستارہ کی طبیعت کا اثر ہوا۔ اسی پر تم دوسرے ستاروں کی طبیعتوں کے جو اثرات انسانوں پر مترتب ہوتے ہیں اُن کا بھی قیاس کر لو۔

اس مسئلہ میں اگر تم مجھ سے حق بات پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے کہ "فرد" کے حق میں جو اُن کمالات کا حامل ہوتا ہے، جن کا ذکر اوپر ہو چکا، اپنے رب کی عبادت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ اپنی طبیعت کے کسی فطری تقاضے کو بجا لارہا ہو۔ چنانچہ اس تقاضے کو بجا لانے میں اللہ تعالیٰ خود اُس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس ضمن میں اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے کسی فعل پر تنبیہ ہوتی ہے تو اُس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مثلاً اللہ تعالیٰ نے اُس کو اپنی محضوں نعمت کا ایک لباس پہنایا تھا، لیکن اُس نے اس لباس کے جو حقوق تھے، اُن کو ادا کرنے میں کوتاہی کی۔ یہ تو

اس دُنیا کی زندگی میں فرد کے جو خواص ہیں، اُن کا بیان ہوتا۔ اور عالم
 برزخ میں فرد کے خواص یہ ہیں کہ جب وہ موت کے بعد بدن کی قید سے
 نکل جاتا ہے تو اُس کے اندر اُس "طبیعت عامہ" کا اشتیاق پیدا ہوتا
 ہے جو ہر موجود چیز میں پائی جاتی ہے۔ فرد کا اس "طبیعت عامہ" کی
 طرف یہ اشتیاق ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کہ انسان کے نفس ناطقہ کا
 بدن کی طرف اشتیاق ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نفس
 ناطقہ کا اشتیاق بدن کی طرف بسلسلہ تدبیر ہوتا ہے اور طبیعت عامہ کی
 طرف فرد کا اشتیاق عشق و محبت کا ہوتا ہے۔ الغرض مرنے کے بعد جب
 اُس فرد میں "طبیعت عامہ" کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کا نتیجہ یہ
 ہوتا ہے کہ فرد خود اپنی بہت سے تمام اجزائے عالم میں سرایت کر جاتا
 چنانچہ وہ پتھر میں پتھر، درخت میں درخت، فلک میں فلک اور فرشتے میں
 فرشتہ ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں ایک حالت سے دوسری حالت میں
 بدلنے سے کوئی چیز اُس کو نہیں روک سکتی۔ جیسے کہ خود "طبیعت مطلقہ"
 کی اپنی کیفیت ہے کہ وہ ہر شے میں موجود اور ہر چیز میں جاری و ساری
 ہو گئی ہے۔ اس حالت میں فرد شے بہت عجیب و غریب آثار و احکام صادر ہوتے ہیں چنانچہ
 اُن آثار و احکام میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو بطور علم حضوری کے
 جان جاتا ہے کہ اُس کا مقام "طبیعت اولیٰ" کے ساتھ ہے۔ اور فرد کا
 اس حقیقت کو جاننا ایسا ہوتا ہے جیسے کہ انسان کا نفس یہ جانے کہ وہ
 کھڑا ہے۔ حالانکہ اصل میں اُس کا بدن کھڑا ہوتا ہے۔ انسان کا ایک

حقیقت کو اس طرح جانتا یہ علم حسرتی ہے۔ لیکن انسان کا یہ جاننا کہ فلاں شخص فلاں کا بیٹا ہے۔ یہ جانتا علم حسرتی نہیں بلکہ اسے علم حصولی کہتے ہیں *

وہ عجیب و غریب آثار و احکام جو فرد سے موت کے بعد جب کہ وہ عالم برزخ میں ہوتا ہے، اور اُس کے اندر "طبیعت عامہ" کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اُس کی ہمت عالم کے تمام اجزاء میں سرایت کر جاتی ہے اظہار ہوتے ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فرد کی یہ حالت بعض دفعہ سبب بن جاتی ہے کسی تدریس کی فیضان کا۔ چنانچہ یہ تدریس کسی موطن اور مقام میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور اس طرح یہ ذریعہ بنتی ہے برکتوں کے نزول کا۔

وَمِنْ بَعْدِ هَذَا مَا تَدْرُقُ صِفَاتُهُ
وَمَا كَتَمَهُ أَحْطَى كَلَامِي وَأَجْمَلُ

اس مقام سے اوپر جو مقام ہے اُس کی صفات بڑی دقیق اور نازک ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک مناسب اور موزوں یہی ہے کہ ان پر پردہ ہی پڑا رہے۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی شامل ہے۔ اس تحقیق

میں سید عبدالسلام بن بشیش نے صوفیاء کے مشرب کے مطابق جو ارشاد

فرمایا ہے۔ اُس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف فرماتے ہیں۔ "اے رب! حجابِ اعظم کو میری روح کی زندگی بنا۔ اور یہی وہ حجابِ اعظم ہے جس کی رُوح میری حقیقت کا راز ہے۔ اور اس حجابِ اعظم کی حقیقت حق اول کے تحقق ہونے کے ذریعہ سے میرے تمام عالموں کو جامع ہے۔" موصوف کے اس قول میں حجابِ اعظم سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس ہے۔ جیسے کہ سید عبدالسلام کے اس قول سے جو انہوں نے پہلے فرمایا تھا، واضح ہے۔ اور وہ قول یہ ہے۔ "اے رب! تیرا وہ عجبِ اعظم جو تیرے لئے تیرے سامنے قائم ہے۔" سید عبدالسلام نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس کو اس قول میں "عجبِ اعظم" سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ حقیقتِ محمدی مُبدعات میں، یعنی وہ چیزیں جن کا ذاتِ حق نے ابداع فرمایا ہے، سب سے پہلے وجود میں آئی۔ اور اس لئے یہ سب سے عظیم ترین ہے۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں صوفیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔ "سب سے پہلی چیز جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، وہ میرا نور تھا۔" الغرض ذاتِ حق نے سب سے پہلے حقیقتِ محمدیؐ کا ابداع فرمایا۔ اور پھر اس حقیقتِ محمدی سے

یہ وجود باری تباری سے یہ کائنات کس طرح ظاہر ہوئی، اس ظہور کو ابداع کہتے ہیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کو مُبدع اور کائنات کی کثرت کو مُبدع کہتے ہیں۔ مترجم

لے حقیقتِ محمدی اور ہے اور وجودِ محمدی اور۔ ان دونوں میں فرق کرنا بہت ضروری ہے (مترجم)

اور حقائق نکلے۔ اور اس طرح یہ حقیقت محمدی ذات حق اور دوسرے جو
حقائق بعد میں پیدا ہوئے، اُن کے درمیان بطور ایک واسطے کے
بن گئی۔

مزید برآں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو روح ہے، وہ
باقی سب انبیاء کے لئے بمنزلہ ایک نبی کے ہے۔ کیونکہ سب انبیاء کی
ارواح نے آپ ہی کی روح کے واسطے سے علوم و معارف اخذ کئے
چنانچہ جس طرح ایک نبی اپنی قوم میں ذات حق کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور وہ
لوگوں کے اور ذات حق کے درمیان واسطہ بن جاتا ہے، اسی طرح نبی
علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح اقدس انبیاء کی ارواح کے لئے ترجمان
بنی۔ اور وہ اُن کے اور ذات حق ہے درمیان واسطہ ہو گئی۔ چنانچہ
قرآن مجید کی آیت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے: "حشر کے دن"
اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت میں سے اُس کے باپے میں
ایک گواہی دینے والا حاضر کریں گے۔ اور دے مجھ ہم تمہیں ان سب حوالہ
پر بطور گواہی دینے والے کے لائیں گے۔ اگر ہم اس آیت میں لفظ "حوالہ"
جو ہے، اُس کے معنی گواہی دینے والوں یعنی انبیاء کے ہیں۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صورت جس میں آپ اس عالم
ناسوت میں ظاہر ہوئے اور جس صورت سے کہ معجزات کا صدور عمل میں آیا
اور جس صورت کی زبان سے معارف و احکام بیان کئے گئے۔ آپ کی
یہی وہ صورت ہے جو ذات حق اور خلقت کے درمیان واسطہ بنی۔ اور

لوگوں نے اُس کو ذاتِ حق سے قُرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔
 علاوہ انہیں ہم اس سے پہلے بتا آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم کی تین کلی نشائیں (ظہور) تھیں۔ اور ان تین نشاتوں کے مطابق
 آپ کے توسط یعنی لوگوں کے لئے واسطہ بننے کی بھی تین قسمیں ہیں۔
 پہلی ان نشاتوں میں سے پہلی نشاء عبارت ہے۔ اُس مرتبہ سے
 جس کو صوفیاء نے ”حقیقتِ محمدیہ“ کا نام دیا ہے۔ اور ”حقیقتِ محمدیہ“ سے
 مراد اللہ تعالیٰ کے اُسمائے کلیہ کے احکام کا خارج ہیں کلی لحاظ سے متعین
 ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کلی نشاتوں میں سے دوسری
 نشاء عبارت ہے اُس مرتبہ سے جس کا نام صوفیاء کے ہاں ”روحِ محمدی“
 ہے۔ اور اس سے مراد انساں کلی کا اُس کے مظاہر اور تقیدات کے ظہور
 کے وقت ”حقیقتِ محمدیہ“ کے مقابل خود اُس کے اپنے آپ کا تعین ہے
 اور آپ کی نشاتوں میں آخری نشاء وہ ہے جو عبارت ہے آپ کے اُس
 مرتبے سے جس میں آپ اس عالمِ ناسوت میں ظاہر ہوئے۔ اسی نشاء سے
 آپ کے اُن ظاہری کمالات کا تعلق ہے جو گم کردہ راہِ اُمت کو راہِ راست
 پر لانے کے لئے آپ سے اُس وقت ظاہر ہوئے جب کہ چالیس سال کی
 عمر میں آپ کو لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا۔ چنانچہ آپ نے اندھی
 آنکھوں کو روشنی دی، مہرے کالوں کو قوتِ سماعت بخشی۔ اور نہ بہتہ پرورد
 میں جو پیٹے ہوئے تھے، اُن کو بیدار کیا۔ اور اس طرح وہ لوگ اس قابل
 ہو گئے کہ انہوں نے اللہ کے ایک ہونے کی شہادت دی۔ اور وہ تہذیب

کی نعمت سے فیض یاب ہوئے۔ اور انہوں نے اُن احکام الہی کو جن کا کہ
لوگوں کو پابند بنایا گیا ہے، اور نیز ان احکام کے علاوہ دوسرے اعلیٰ معارف
کو جان لیا۔

اولیاء میں سے کامل ترین ولی وہ ہوتا ہے، جو ان تین نشأتوں میں
جن کا کہ ذکر ابھی ہوا ہے، خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونے پر
ہو۔ لیکن اس ضمن میں یہ بات یاد رہے کہ وہ جزوی حقائق جو محبت،
محبوبیت اور اُن سے ملتے جلتے دوسرے جو کمالات ہیں، اُن کی اپنے
انداز استعداد رکھتے ہیں، ان کا تعین اُسی وقت ہی ہوتا ہے جب انسان
کلی اپنے چیز و مقام میں مستقل طور پر ظہور پذیر ہو چلتا ہے۔ چنانچہ ان
جزوی حقائق کا خارج میں پہلا تعین حقائق کلیہ کے تعین روحی کے مشابہ
اور اُس کے مقابل ہوتا ہے۔ اور اسی بنا پر جب تک جزوی حقائق کا اس
مرتبہ میں تعین نہیں ہو جاتا، اُس وقت تک حقیقت محمدیہ سے ان
جزوی حقائق تک مدد نہیں پہنچتی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ولی میں جو جامعیت
ہوتی ہے، وہ اسی حقیقت محمدیہ کی دراشت ہے۔ اور اُس دلی میں جو
جو استعدادیں ہوتی ہیں۔ اُسے روح محمدی سے درشت میں ملتی ہیں۔
اعترض عطایات کا مرتبہ تو ایک ہے لیکن ان عطایات کے وجود میں آنے
کے اسرار متعدد ہیں۔

قصہ مختصر یہ بات تو بطور تمہید کے طے ہو گئی۔ اب ہم سید عبد السلام بنیش
کے اُس قول کی طرف پھر رجوع کرتے ہیں۔ موصوف دراصل اللہ تبارک و تعالیٰ

سے اپنی فطری استعداد کی زبان سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان تین نشاۃوں میں بالا جمال، اور نیز ان میں سے ہر ہر نشاۃ کے مخصوص کمالات میں بالتفصیل آپ کا وارث بنائے۔ چنانچہ شیخ موصوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم ناموت میں جو کمالات تھے، ان کا وارث بننے کے سوال کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے: "اے رب! تو حجاب اعظم کو میری روح کی زندگی بنا۔ اس روح سے اُن کی مراد وہ روح ہے جو اس مادی بدن میں پھونکی جاتی ہے۔ اور پھر وہ زندگی میں اس بدن کی مدد دے اور منظم ہوتی ہے اور اسی سے بدن میں حیات اور حرکت پائی جاتی ہے۔ اور یہی وہ روح ہے جو جزوی فراد کو جزوی کمالات کا اہل بناتی ہے۔ اور نیز وہ کلی افراد جو مجموعی کمالات کی استعداد کے مالک ہوتے ہیں ان کلی افراد کے اندر جو صورت ناموثبہ ہے، اُس کو کہیں بیان کرتے ہوئے ہم اس روح ہی کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ الغرض شیخ موصوف کا یہ کہنا کہ "اے رب! تو حجاب اعظم کو میری روح کی زندگی بنا۔" اس میں شیخ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض کو اپنی روح کے لئے زندگی کی تشبیہ دی ہے۔ اور ظاہر ہے زندگی ہی روح کا سب سے پہلا کمال ہے چنانچہ شیخ نے آپ کے فیض کو زندگی سے جو تشبیہ دی ہے، اس تشبیہ میں جو حُسن ہے وہ تم سے مخفی نہ رہنا چاہئے۔

آگے چل کر شیخ نے اپنی دعا میں اس سوال کی خود ہی تشریح کر دی ہے چنانچہ "اے رب! تو حجاب اعظم کو میری روح کی زندگی بنا۔" کہنے کے بعد

وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "یہی وہ حجابِ اعظم ہے جس کی روح میری زندگی کا راز ہے۔" اور یہ اس لئے کہ جہاں ارواح کلی کا تعین ہوتا ہے، وہاں سے ہی حقائق جزوی کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ یعنی حجابِ اعظم کا تعلق ارواح کلی سے ہے۔ اور انفرادی زندگی حقائق جزوی سے متعلق ہوتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں تم سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہے کہ شیخ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض کو جس کا کہ فیضانِ موصوف اپنی حقیقت پر چاہتے ہیں، لفظ "مستر" یعنی راز سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس لفظ "مستر" سے اس کا آثار و کمالات کا منبع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور اسی طرح اس "مستر" سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ اس میں حسن و خوبی کے ایک ہی معیار پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے استعدادوں کا تعین ہو گیا ہے۔

اس کے بعد شیخ اپنی اس دعا میں فرماتے ہیں: "حجابِ اعظم کی حقیقت میرے تمام عالموں پر جامع ہے" اور یہ تعبیر ہے شیخ کے اس سوال کی کہ وہ کمالات جن کی وارث "حقیقت محمدیہ" ہے۔ اور اگرچہ یہ "حقیقت محمدیہ" اپنے سے کم مرتبے میں ظاہر ہوئی ہے۔ "لے رت" تو مجھے ان کمالات کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث بنائے اس ضمن میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اس حجت سے کسی ولی کے کامل ترین ہونے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ خلیفہ میں جو نشانی ہیں ان کے مقابل اس خلیفہ کے اندر رقائے ہوں اور دراصل واقعہ یہ ہے کہ ان رقائے میں ہر رقبہ ایک شریکِ نفاۃ کی اجمالی صورت اور اسکے احوال کی معرفت سے عبارت ہوتا ہے چنانچہ اس مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا قدرہ کرنا اس کی حقیقت پر آپ کی طرف

سے جو فیضان بھی ہوگا، وہ تمام عالموں کو جمع کرنے والا ہوگا اور اسی لئے شیخ اس کے بعد ہی اسی دُعائیں فرماتے ہیں کہ "اے رب حق اول کو متحقق کر کے اس کو واسطہ بنا کہ حجابِ اعظم میری رُوح کی زندگی ہو جائے۔" متحقق کر کے "کے معنی "قادر" میں کسی چیز کو متحقق کرنا ہے۔ اور یہاں اس سے مراد "فیض مقدس" سے ہے۔ اور اس عین میں تم سے یہ بھی مخفی نہ ہے کہ یہاں مضمہر کی جگہ منظر کا ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حق اول جب متحقق ہوگا تو اس کا تحقق اس لحاظ سے ہوگا کہ وہ "حق ہے" "حق" ان معنوں میں کہ وہ بذاتِ خود بھی متحقق ہوتا ہے۔ اور اپنے سوا دوسروں کے تحقق کا باعث بھی بنتا ہے۔ اور نیز وہ مُبداء ہے تمام اشیاء کا۔ اور اس لئے وہ سب سے اول ہے۔ اور وہی سبب و جودوں کا جود اول اور ماہیات کی پہلی ماہیت ہے۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی شامل ہے ————— معلوم ہوتا چاہئے کہ عارف کے لئے خود ذاتِ حق کا اتصال اور ذاتِ حق کے اسماء و تجلیات کا اتصال برابر ہوتا ہے۔ بے شک ہم کہتے ہیں کہ عارف کو خود ذاتِ حق کا اتصال ہوتا ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ عارف اس ذات کا علم اور ادراک رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ اس عین میں جو کچھ ہم نے یہاں کہا ہے، محققین کے کلام سے ہماری اس بات کے خلاف جو دہم

”محبوبہ کو میرے پالنے سے جو انکار کرتا ہے اُسکو چھوڑو

اُس کو چھوڑو۔ اُس کا دل شق ہوا کرے۔ اور سچی بات تو یہ ہے

ایسے دل اس قابل ہی ہیں کہ وہ شق ہو کر اکیس۔ اگر ایک

شخص اپنی محبوبہ کے رخسار کا خال بن جائے تو اُسے اس کی

کیا پروا ہوتی ہے کہ اس بنا پر محبوبہ کے باپ کی غیرت مشتعل

ہو گئی۔ یا اُس محبوبہ کے ہمسایہ کو اس کی خیر لگ گئی۔“

الغرض جو کالمیں ہیں، اُن کو تو ذاتِ حق کا بالفعل وصال ہوتا ہے

اور اسی طرح انہیں ذاتِ حق کے اسماء و تجلیات کے اصول میں بھی فنا و

بقا اور تحقق حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں ایسا ہو کہ یہ کالمیں اس

کے متعلق حالتِ انتظار میں رہیں، تو یہ بات جائز نہیں ہے۔ بے شک

اس کے بعد یہ ضرور ہوتا ہے کہ وجود کی نشأتوں میں سے ہر نشاۃ

کے جو خصوصی احکام ہوتے ہیں عارف کو یکے بعد دیگرے ان میں سے

گزرنا پڑے۔ گویا کہ جیسے عارف نے ذاتِ حق اور اس کے اسماء و تجلیات

کے وصال کے وقت ان تمام نشأتوں کے خصوصی احکام کا بھی احاطہ

کر لیا ہو۔ لیکن عارف کا ان تمام نشأتوں کا یہ احاطہ اجمالی ہوتا ہے۔

اور اُس کی تفصیل باقی رہتی ہے۔ چنانچہ اب جو وصال کے بعد اُسے

ہر نشاۃ کے احکام خصوصی سے گزرنا پڑا تو یہ تفصیل ہوئی اُس اجمالی

علم کی بجائے ذاتِ حق اور اُس کے اسماء و تجلیات کے وصال کے

وقت تمام نشأتوں کے احاطہ کے متعلق حاصل ہوا تھا۔ الغرض ان

معنوں میں کالین کی ترقیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی ہے ——— ذاتِ اول یعنی خدا
تعالیٰ کو اشیاء کا جہت سے علم ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک اُس
کے علم کی اجمالی جہت ہے۔ اور اس کی تفصیل ہے کہ جب ذاتِ اول
کو اپنی ذات کا علم ہوا تو اس ضمن میں اُس نے وجود کے نظام کے سلسلہ
میں اُس کا اپنا جو اقتضائے ذاتی تھا، اُس کو بھی جان لیا۔ بات یہ ہے
کہ علتِ تامہ کالین وہ علت جس کا لازمی نتیجہ اُس سے معلول کا صدور
ہو اعلیٰ اس امر کی کفایت کرتا ہے کہ علتِ تامہ کے ساتھ ساتھ معلول
کا بھی علم حاصل ہو گیا۔ اب جہاں تک کہ اشیاء کے عالم کا تعلق ہے وہ
سب وجودِ الہی میں موجود تھیں۔ اور ان کا وجود اُن بمنزلہ امکان کے
میں تھا۔ کیونکہ ایک چیز جب محقق ہوئی تو اُس کا تحقق ہونا اس بنا
پر تھا کہ ذاتِ واجب نے اُسے متحقق کیا۔ اور اسی طرح ایک چیز وجود میں
آئی، تو اُس کا وجود میں آنا اسی وجہ سے تھا کہ ذاتِ واجب نے اُسے
ایجاد کیا۔ غرضیکہ ہر چیز کے مقابل ذاتِ واجب کا ایک کمال اور اُس کا
اقتضائے ذاتی ہے۔ اور ذاتِ واجب کے یہی وہ حالات ہیں جو اشیاء
کے ظہور کا منبع اور اُن کے حقائق کی اصل کتبہ ہیں۔ چنانچہ جس طرح ذاتِ
واجب کا ہر کمال خود اپنی خصوصیت کے اعتبارات ایک نہ ایک چیز کو

وجود میں لانے کا متقاضی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز بھی وجود میں آنے کے لئے ذات واجب کے ایک نہ ایک کمال کی محتاج ہوتی ہے۔ گو کہ ذات واجب کے یہ کمالات اور یہ اشیاء امر واحد ہیں۔ لیکن یہ کمالات ذات واجب کے لوازم اور اس کے ذاتی اعتبارات میں بمنزلہ اس کے علم، اس کی قدرت اور اس کی حیات کے ہیں۔ یعنی یہ سب کے سب معلولات ہیں اس ذات واجب کی علت تامہ کے۔ اور اسی سے ان سب کا صدور بھی ہوتا ہے +

ذات اول کو اشیاء کا علم جس طرح ہوتا ہے اس کی پہلی جہت یعنی جہت اجمالی تو یہ ہوتی۔ ذات اول کے علم کی دوسری جہت جہت تفصیلی ہے۔ اور اس کی شرح یہ ہے کہ ہر چیز جو موجود ہے۔ وہ معلول سے ذات واجب کی۔ یعنی اس کے وجود میں آنے کے لئے ذات واجب علت بنی۔ اور جو چیز معادیں ہیں یعنی اس کی کوئی علت نہیں تو اس چیز کا متحقق ہونا بھی ممکن نہیں۔ اور اس سلسلہ میں یہ بات بھی ضرور ملحوظ ہے کہ یہ معادوات ذات حق کی اس طرح محتاج نہیں ہیں جیسے کہ ایک عمارت کا بننا معمار کا محتاج ہوتا ہے یعنی جب عمارت بن گئی تو پھر معمار کی ضرورت نہ رہی بلکہ ان معادوات کو جب تک کہ وہ معلول موجود ہیں اپنے تئیں اپنے جوہر ہونے، متحقق ہونے اور قیام پذیر ہونے میں برابر ذات واجب کی حاجت رہتی ہے اور ذات واجب ان معلولات کو وجود میں لانا، اور اس کا انکو متحقق کرنا ہی فی الحقیقت ان معلولات کے وجود اور تحقق پذیر ہے۔

لے ہم سے تو علم ہی پیدا ہوتا ہے۔ وجود کے لئے کوئی علت چاہئے۔

ترجم

ہونے کی اصل ہے۔ اور نیز اشیاء کی ماہیات میں آپس میں ایک دوسرے سے جو امتیاز پایا جاتا ہے، تو یہ نتیجہ ہے ذات واجب کی طرف سے ایجاد، تحقق اور تقدیم کی جو حیثیتیں ہیں، اُن کے باہمی امتیاز کا۔ اور ذات واجب کا ان معلومات کے ساتھ جو ارتباط پایا جاتا ہے، وہ اس ارتباط سے جو ایک صورت اور اُس کے محل صورت میں ہوتا ہے، زیادہ قوی ہے۔ اور یہ ارتباط اس امر کا بھی متقاضی ہوتا ہے کہ اشیاء اپنے فاعل کے روبرو موجود ہوں۔ الغرض ذات اول ان اشیاء کو ان اشیاء ہی کے ذریعہ سے جانتی ہے، نہ کہ اُن صورتوں کے ذریعہ سے جو ذات واجب میں منقوش ہیں۔ اور اشیاء کا یہی وہ علم ہے جو ذات واجب کو ان اشیاء کے وجود امکانی کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ خواہ یہ اشیاء از قسم مادیات ہوں یا از قبیل مجردات۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ جو اہر عقلیہ جن کے اندر اشیاء کی صورتوں کو منقوش مانا جاتا ہے، اُن کو ذات اول اور اشیاء کے درمیان اس علمی ربط کو قائم کرنے کے لئے واسطہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیشک ان جو اہر عقلیہ کو واسطہ بنانے کی ضرورت مفروضات میں تو ہو سکتی ہے۔ یعنی وہ مفروضات جو محض خیال ہی میں اپنا وجود رکھتے ہیں اور ان دُنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ جیسے کہ فرض کرنے والوں نے غول بیابانی کے لمبے لمبے دانت فرض کر لئے ہیں۔ الغرض مطالب یہ ہے کہ ذات اول کو اشیاء کا علم اشیاء ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے اُسے جو اہر عقلیہ کو واسطہ بنانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تم اس میں ثوب غور و تدبر کرو۔

چھالیسواں مشاہدہ

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ملتوں اور مذاہب کو حق کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یہ ملت حقہ ہے یا یہ مذہب حق ہے۔ اب جو کسی ملت اور مذہب کو حق سے موسوم کیا جاتا ہے تو اسے ایک دیکھنے والا اس نظر سے دیکھتا ہے کہ آیا یہ ملت یا مذہب اپنی واقعی صورت کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہم نے اس معاملہ میں غور کیا کہ آخر کسی ملت یا مذہب کی یہ واقعی صورت کیا ہے کہ اگر وہ اس کے مطابق ہے تو وہ حق ہے، اور اگر وہ اس کے مطابق نہیں تو وہ باطل ہے۔ ہم نے اس کے دو معنی معلوم کئے ہیں۔ ان میں سے ایک تو جلی معنی ہیں، اور دوسرے دقیق، جن کو کہ دور ہی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ جلی معنی کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی عقائد کا مسئلہ ہے تو اس کے اپنی صورت واقعی کے مطابق ہونے سے مراد یہ ہے

کہ خارج میں اُس مسئلہ کی جو صورت ہے، وہ اُس کی واقعی صورت کے مطابق ہو، مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ اللہ اس اس بات سے ناراض ہوتا ہے تو واقعہ معاملہ ایسا ہی ہو۔ یا اگر یہ دعویٰ ہے کہ مُردوں کا حشر کے دن دوبارہ حی اٹھنا جہانی لحاظ سے ہوگا تو واقعہ بھی یہی ہو۔ الغرض ہر وہ حکم جس میں کہا جائے کہ یہ چیز واجب ہے اور یہ حرام، تو اس حکم کے اپنی صورت واقعی کے مطابق ہونے کے یہ معنی ہوں گے کہ ملاءِ علی میں اس حکم کی جو صورت قائم ہے، یہ حکم اُس صورت کے مطابق ہے۔ مثال کے طور پر یہ حکم ہے کہ نماز واجب ہے۔ اب وجوب نماز کے حق ہونے سے مراد یہ ہوگی کہ قصداً و قدر کی طرف سے ملاءِ علی میں ایک ایسی مثالی صورت نازل ہوئی ہے، جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جو شخص نماز کو اپنا شعار بناتا ہے تو وہ مثالی صورت جو ملاءِ علی میں قائم ہے، وہ اُس شخص کو پسند کرتی ہے۔ اور اسی طرح جو نماز کو مضبوطی سے پکڑتا ہے تو دنیا اور آخرت دونوں میں اس شخص کے جسمے کا ترقی کرنا ایک لازمی چیز ہو جاتا ہے۔ اور نیز نماز کی وجہ سے اُس شخص کے جسمے سے وہ تاریک اثرات جو بھی قوت میں نفس کے انماک کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں، چھٹ جاتے ہیں، بالکل اُسی طرح جیسے ادراک کھانے سے بدن میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور ٹھنڈ کا اثر جاتا رہتا ہے۔ الغرض وجوب نماز کے حق ہونے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کا یہ حکم ملاءِ علی میں اس حکم کی جو صورت ہے، اُس کے مطابق ہو۔ یہ تو ہوا اعتقادات کا معاملہ۔ باقی رہے وہ احکام

جن میں وقت اور زمانے کی قید ہوتی ہے، یا ملی نظام کے پیش نظر ان احکام کی خاص حدود مقرر کی جاتی ہیں، جیسے نماز میں پانچ وقت کی قید ہے۔ اور زکوٰۃ کے لئے کم سے کم دو سو درہم کا ہونا اور ان پر کامل ایک برس گزرنے کی شریعت کی طرف سے حد لگائی گئی۔ سو ان احکام کا اپنی صورت واقعی کے مطابق ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ جو سارے احکام ہیں ان کی ایک اصل ہے۔ اور اس ایک اصل سے ان احکام کے تمام قالب اور ان کے استنباح نکلتے ہیں۔ اور اس اصل اور احکام کے ان قالبوں میں ایک تشبیہی وجود پایا جاتا ہے جو طائر اعلیٰ کے مدارک میں قائم ہے۔ اب اس تشبیہی وجود کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تشبیہی وجود کبھی اصل بن جاتا ہے اور کبھی یہ اصل تشبیہی وجود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی ملت اپنے اس تشبیہی وجود کے مطابق ہوتی ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے کہ یہ ملت حقہ ہے۔

اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ فقہ کا یہ مذہب مذہب حق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس مذہب کے احکام ایک توحید پر کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، آپ کے ان ارشادات کے اصل مقصود کے مطابق ہیں، اور دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کا وہ زمانہ جس کے مشہود یا بخیر ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اس زمانے میں جس طریقے پر عمل ہوتا تھا اس مذہب فقہ کے احکام اس

سے خلافت راشدہ کا زمانہ جس میں امت متحد و متفق رہی۔ مترجم

طریقے کے مطابق ہوں۔ اور نیز اگر کوئی فقہ کا ایسا مسئلہ ہے کہ اس کے متعلق نہ تو کوئی نص قرآنی موجود ہے، اور نہ کوئی حدیث، تو اس مسئلہ کے حق ہونے کی یہ صورت ہوگی کہ اس ضمن میں تمام قرائن اس امر پر دلالت کریں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے پر گفتگو فرماتے تو طریق غالب یہی ہے کہ وہ اس کے علاوہ کچھ اور نہ فرماتے۔ اور پھر فقہ کے اس مسئلے کے استخراج اور استنباط میں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ نصوص سے اس استخراج اور استنباط کی وجہ ظاہر اور واضح ہو۔ کہ اسالیب کلام سے واقف اور احکام شرع میں شائع علیہ السلام کے پیش نظر جو مقاصد تھے اُن کا جاننے والا اس مسئلے کو دیکھے تو اس کو اس مسئلہ کے طریقہ استخراج و استنباط کے صحیح ہونے پر شک نہ کرے۔ الغرض مذاہب فقہ کے حق ہونے کی یہ شکل ہے۔

اب رہے ملتوں اور مذاہب کے حق ہونے کے دوسرے معنی جو دقیق ہیں، اور اُن پر دوسری سے نظر پڑ سکتی ہے، تو اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ذات حق نے چاہا کہ وہ دنیا کی اقوام میں سے کسی قوم کے بکھرے ہوئے اجزاء کو جمع کرنے کے لئے ایسے بندوں میں سے کسی برگزیدہ بندے کو یہ الہام کرے کہ وہ ایک امت کی تشکیل عمل میں لائے۔ چنانچہ اس طرح یہ بندہ ذات حق کے ارادہ کا خادم، اور اس کی تدبیر کو پھر کار لانے کا ذریعہ، اور اُس کی مدد و غیب کے فیضان کا موصوع بن جاتا ہے۔ اور اس کے بارے میں ذات حق کی طرف سے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ جس

نے اس برگزیدہ بندے کی اطاعت کی تو گویا اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جس نے اُس کی نافرمانی کی، اُس نے گویا اللہ کی نافرمانی کی چنانچہ ایک زمانے میں اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اُس کی اس تدبیر خصوصی میں جو اس بندے کے ذریعہ دنیا میں برسرِ کار آتی ہے، محدود ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب بھی اُس کی اس تدبیر کی مخالفت کے ساتھ ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ الغرض جب کسی ملت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے تو اُس ملت کے سارے کے سارے احکام حق سے موسوم ہوتے ہیں۔ اور اُن احکام کو حق سے موسوم کرنے میں جو بات پیش نظر ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں احکام کی صرف اسی شیخ اور اُن کے اسی قالب ہی میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر مصروف کار ہوتی ہے۔ اور اُس شیخ اور قالب کے علاوہ اُس زمانے میں تدبیر الہی کا اور کوئی منظر موجود نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ یہی کیفیت فقہ کے ایک خاص مذہب کی بھی ہو جاتی ہے، اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی وہ عنایت جو ایک ملت کی حفاظت کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے، وہ اس سلسلہ میں بعض اسباب کی وجہ سے فقہ کے ایک خاص مذہب کو اپنا مقصود بنا لیتی ہے۔ اور ان اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ اُس زمانے میں اسی مذہب فقہ کو ماننے والے ہی ملت کی حفاظت کرنے والے ہوں یا مثلاً ایک ملک میں ایک فقہی مذہب کے تمام کے تمام پیرو ہیں۔ اور اُن کا یہی فقہی شعار خاص و عام میں حق باطل کے

لئے وجہ امتیاز بن گیا ہے۔ اس حالت میں ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل
میں اس ملت کا جو وجود تشبیہی ہے، وہ ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے،
جس کے معنی یہ ہیں کہ ملت دراصل اسی فقہی مذہب سے عبارت ہے،
اور اس طرح ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کے مدارک میں ملت کے کل احکام
اسی فقہی مذہب کی مخصوص صورتوں میں مقید ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ
اس طرح یہ فقہی مذہب مذہب حق بن جاتا ہے، اور اس کے حق ہونے
کا مدار ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کے اس وجود تشبیہی پر ہوتا ہے، جس
کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔

الغرض کسی ملت یا مذہب کے حق ہونے کے جو معنی ہیں۔ اور ان
معنوں کے جو دو پہلو ہیں تو جہاں تک ان معنوں کے جلی پہلو کا تعلق
ہے اس تک تو "راستخین فی العلم" کا گروہ اپنے علم کے ذریعہ اور اہل
استنباط کی جماعت اپنے استنباط سے پہنچ جاتی ہے، لیکن جو ان معنوں
کا دقیق پہلو ہے اس تک تو صرف نور نبوت کی مدد سے ہی رسائی ممکن
ہے۔ اور اس نور نبوت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اس
مدبیر الہی کے احکام کا جس کے زیر تصرف سارے کے سارے انسان ہیں
انکشاف ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ نور نبوت کا حصول عام چیز نہیں ہے
اس لئے یہ پہلو جلی نہیں ہے۔ بلکہ دقیق ہے۔ اور اس کو دور ہی

سے نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ یہ بحث تو ختم ہوئی۔ اس سلسلہ میں اب ہم ایک اور بات کہتے ہیں

مجھے دکھایا گیا کہ حنفی مذہب میں ایک عمیق راز ہے۔ چنانچہ میں اس عمیق
 راز کو برابر غور سے دیکھتا رہا اور میں نے اُس میں وہ بات پائی جس کا ذکر
 میں پہلے کر چکا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ کسی فقہی مذہب کے حق ہونے کا
 جو دقیق پہلو ہے، اُس کے لحاظ سے آج اس زمانے میں حنفی مذہب کو
 باقی سب مذاہب فقہ پر ترجیح حاصل ہے۔ گو بعض دوسرے مذاہب فقہ
 کسی مذہب کے حق ہونے کا جو جلی پہلو ہے، اُس کے اعتبار سے حنفی مذہب
 پر ترجیح رکھتے ہیں۔ میں نے اس ضمن میں اس بات کا بھی مشاہدہ کیا کہ
 حنفی مذہب کا یہی وہ عمیق راز ہے جس کو بسا اوقات ایک صاحب کشف
 کسی حد تک اور اک کرتا ہے۔ اور اپنے اسی اور اک کی بنا پر وہ حنفی مذہب
 کو باقی تمام مذاہب فقہ پر ترجیح دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس صاحب کشف
 کو اس امر کا الہام بھی ہوتا ہے کہ وہ مذہب حنفی کا سختی سے پابند ہو۔
 اور کبھی یہ صاحب کشف رویا میں کوئی ایسی چیز دیکھتا ہے جو اُسے مذہب
 حنفی کو اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ بہر حال اس مسئلہ کی اصل حقیقت یہی
 ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دی۔ تمہیں چاہئے کہ تم اس حقیقت کو مضبوطی سے
 پکڑو اور اس پر خوب غور و تدبیر کرو۔

صراطِ مستقیم ہوتا ہے۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ صراطِ مستقیم زندگی طے
کے کسی خاص مرتبے کا نام نہیں ہے بلکہ صراطِ مستقیم عبارت ہے احکام
الہی کی اطاعت اور فرمانبرداری میں ایک خاص حد تک ثابت قدم رہنے
سے۔ اس ضمن میں میں نے تو یہ پایا کہ گویا خود مدبر حق نفوس انسانی میں
صراطِ مستقیم کی حقیقت کا القاء فرماتا ہے۔ چنانچہ جن نفوس میں الہام حق
کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، وہ تو اُس القاء کو قبول کر لیتے
ہیں اور جن میں الہام الہی کو قبول کرنے کی کم استعداد ہوتی ہے، وہ اُس
القاء سے کم مستفید ہوتے ہیں۔ اور میں نے اس امر کا بھی مشاہدہ کیا کہ
صراطِ مستقیم تک پہنچنے کے لئے نفوس کو زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑتی
اور نیز میں نے دیکھا کہ حشر کے دن دوزخ کے اوپر جوئل ہو گا، اور جس
پر کہ سب کو گزرنا پڑے گا، وہ اسی صراطِ مستقیم کی حقیقت کا پیکر مثالی ہے۔
یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس زندگی میں عالم نفوس کے اندر صراطِ
مستقیم کو ایک مسنوی شکل دی ہے، اسی طرح وہ دوسری زندگی میں عالم
آفاق میں صراطِ مستقیم کو یہ صورت دے دیگا۔ میں نے دیکھا کہ صراطِ
مستقیم کو کعبہ مشرفہ کے جوف یعنی اس کے اندر کے حصے سے خصوصی
تعلق ہے۔ اور اس کے علاوہ میں نے اور بھی بہت سی چیزیں ایسی
دیکھیں کہ ان میں اور صراطِ مستقیم کے ان معانی میں بڑی مناسبت تھی۔
الغرض حشر کے دن صراطِ مستقیم کے یہی معانی ہیں جو مثالی صورتوں میں
مشکل ہو جائیں گے۔ اور یہی راز ہے اُس عالم میں منبر مسجد نبوی اور مسجد

بنوہی کے اس ستون کے ظاہر ہونے کا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مفارقت میں رویا تھا۔ اور نیز یہی راز ہے آپ کے اس ارشاد کا کہ میرے منبر اور میرے گھر کے درمیان جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے۔

اس مشاہدہ میں یہ تحقیق بھی شامل ہے — انسان اپنے ارادے اور اختیار سے جو بھی افعال کرتا ہے اُن افعال کے اپنے اسباب ہوتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے اِن افعال کا اُس شخص سے صادر ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ انسان ایک کام کرنے کا عزم کرتا ہے تو پہلے اُس کے نفس کے اندر اس کام کے لئے ایک حتمی ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اُس شخص کے اعضا و جوارح اُس کے اس ارادہ نفس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس طرح اُس سے وہ کام صادر ہوتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے اور بہت سے منفی اسباب ہیں جو انسانی افعال کے لئے ذریعہ ظہور بنتے ہیں۔ اور وہ اتنے عمیق ہیں کہ بہت کم ہی اُن کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ ان اسباب میں سے ایک عزم ہے۔

الغرض انسان کے افعال میں سے ہر فعل کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہوتی ہے جو اُس کے اس فعل کے ظہور پذیر ہونے کا باعث بنتی ہے مثلاً ایک شخص کے دل میں کوئی پکا عقیدہ تھا۔ اور اس کے پکے عقیدہ کا

نتیجہ یہ نکلا کہ اُس شخص کے اندر شوق و ذوق پیدا ہو گیا۔ یا کسی خاص حالت میں ایک شخص کے نفس میں کوئی خیال آیا۔ اور وہ خیال عزم کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ ان فرض انسانوں کے افعال کے جو اسباب ہیں اُن اسباب کی بھی اپنی علتیں ہیں۔ اور ان علتوں کا سلسلہ برابر آگے چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں یہ وجوب قطعی پر ختم ہوتا ہے۔ مختصراً یہ افعال صادر تو بندوں کے ارادوں سے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا وجود اللہ تعالیٰ کی ایجاد ہے۔ اس ضمن میں یہ ملحوظ رہے کہ انسان کا ارادہ بھی ان افعال کے اسباب کے لئے بطور ایک امر واجب کے ہے چنانچہ جب انسان ارادہ کرتا ہے تو یہ ارادہ اُس کے جوہر نفس سے اس طرح جھٹ جاتا ہے کہ پھر جو کچھ اس کے نفس سے صادر ہوتا ہے، اسی ارادے کی مرضی سے صادر ہوتا ہے۔ اور اسی ارادے ہی کے ذریعہ سے اُس کے نفس کی قوتوں میں سے کسی قوت کو حرکت ہوتی ہے۔ جب ارادہ اس طرح نفس میں دخیل ہو جاتا ہے، تو اگر نفس اُس ارادے کی مخالفت کرتا ہے تو اس سے نفس کو اذیت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ ارادے کی مطابقت کرتا ہے، تو نفس کو مسرت ملتی ہے۔ نفس کی اذیت اور مسرت کی بعض خارجی تقریبیں بھی ہوتی ہیں۔ اور وہ یہ کہ اس ارادے کی جو مخصوص مثالی صورت ہے وہ نمونہ ہوتی ہے اسی کی مطلق مثالی صورت کا۔ اب جب ارادے کی اس مطلق مثالی صورت میں اذیت یا مسرت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو وہ فرشتے جو اس خدمت پر مقرر ہیں، اُن کو اُس بارگاہ سے الامام

ہوتا ہے۔ اور وہ اس نفس میں اذیت اور مسرت پیدا کرنے والے اسباب بن جاتے ہیں۔ اور یا اس نفس کی اذیت اور مسرت کا یہ سبب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی بھلائی کا ارادہ کیا۔ اور اس ارادۃ الہی کا اثر اس نفس پر پڑا۔ اور اس کی وجہ سے اگر وہ اچھا ہے تو اسے اس ارادۃ الہی سے مسرت ہوتی، ورنہ اسے اذیت پہنچی۔ اور یہ خواہ اس دنیا کی زندگی میں ہو، یا اس زندگی کے بعد دوسری دنیا میں۔ الغرض نفس کی اذیت یا اس کی مسرت کے یہ جتنے احتمالات ہیں، ان میں سے ہر ہر احتمال کی اپنی اپنی غلتیں ہیں۔ اور اس دنیا میں کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی، جب تک اس چیز کی غلتیں اس کے وجود میں آنے کو واجب نہ کریں۔ جس طرح ہر چیز کی ایک علت مقدر ہوتی، جو اس کو اس دنیا میں لانے کا سبب بنی ہے۔ اسی طرح مبدائے اذان کی طرف سے شریعتوں کا ظہور پذیر ہونا بھی واجب ٹھہرایا گیا۔ اور ان کے ظاہر ہونے کی صورت یہ مقرر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے جہاں لیا تھا کہ جس زمانے میں کوئی شریعت نازل ہوگی، اس زمانے میں "خیر و فلاح" صرف اسی شریعت کی صورت میں محدود ہوگی۔ اس لیے ضروری ہوا کہ وہ صالح نشوونما جو شیطان فی الاشیوں سے ملوث نہیں ہوتے، ان لوگوں میں اس شریعت کے متعلق جب کہ وہ صاحب شریعت سے منجذبات مبادر ہوتے دیکھیں پختہ اعتقاد پیدا ہو۔ اور اسی طرح مثالی شیخ بھی اس شریعت کے پہنچانے والے کے سچے ہونے پر ولایت کریں، اور وہ اس امر کی تصدیق کرے کہ صلاۃ

$$۳۷۷ = ۳۲ + ۳۴۵$$

شریعت نے واقعی بارگاہ غیب سے اس شریعت کو لیا ہے۔ اور نیز
 مبدائے اول کی طرف سے اس ضمن میں یہ بھی ضروری قرار پایا کہ زیادہ
 سے زیادہ نفوس فطرتاً پختہ اعتقاد واسے سے اثر پذیر ہوں۔ اور اس
 کی وجہ سے اور ان نفوس میں حزم و ارادہ کی ایک لہر دوڑ جائے الغرض
 شریعتوں کے ظہور کے سلسلہ میں مبدائے اول کی طرف سے یہ پہلے سے
 مقدر تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت کا صدور ہوا اور اس نے
 پیغمبروں کو مبعوث فرمایا اور ان پر کتابیں نازل کیں۔ اور اس طرح
 اُس کی نعمت کا اتمام ہوا، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ دلیل جو دلوں میں گھر
 کرے، وہ تو صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔

(۱۰۸)

مشاور
مشار

فیوض الحکیم

مصنف حضرت شاہ ولی اللہ
از

پروفیسر محمد سرور

سندھ ساکراکادمی لاہور